سلسلۂ مطبوعات انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) نمبر [illegible]

مقالاتِ گارساں دتاسی

حصّہ دوم

پروفیسر موصوف کے "ہندستانی زبان" پر سالانہ لکچر

سنہ ۱۸۶۴ء سے سنہ ۱۸۷۷ء تک

شائع کردہ

انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۴۳ء

پہلا ایڈیشن [illegible] قیمت مجلد [illegible] بلا جلد [illegible]

فہرست مضامین مقالات گارساں دتاسی

حصۂ دوم

مقالاتِ گارساں دتاسی

ہندستانی زبان و ادب ۱۸۷۰ء میں

۱۔ اس سال ہندستان میں بہت سخت قحط پڑنے کا اندیشہ تھا لیکن سرکار نے ایسی مستعدی اور کوشش سے اس کا انتظام کیا کہ اس وبال کی سختی بہت کم ہو گئی۔ خوش قسمتی سے بہت تھوڑے لوگ اس کا شکار ہوئے۔ ہمیں اُمید کرنی چاہیے کہ آئندہ سال زیادہ مبارک ہوگا۔

"نئے اور نوجوان سال خوش آمدید۔ تیری حکومت کو خوشی اور امن نصیب ہو۔ تیرے دوران میں روشنی اور صفا کا دَور دَورہ رہے اور تو احتیاج اور مصیبت سے آزاد رہے"[۱]

میں اب بھی ہندی کے مقابلے میں اُردو کی حمایت کر رہا ہوں، اگرچہ میں اوّل الذکر کی اہمیت اور افادیت سے منکر نہیں[۲]۔ خوش قسمتی

۱

A Welcome to the young new year
Joy and peace attend thy reign
So may thy course be bright and clear
Free from want and free from pain

۲ ان اضلاع کے انگریز عہدے داروں کے لیے جہاں یہ بولی باتی ہے یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ اسے سیکھیں اور بالآخر اودھ میں نامزد شدہ عہدے داروں کے لیے اپنے عہدوں کا جائزہ لینے سے پہلے حکماً یہ لازمی ہو گیا ہے کہ وہ ہندی اور اُردو دونوں میں ایک امتحان کامیاب کریں۔ علی گڑھ اخبار ، اگست ۱۸۶۹ء

سے اہم شخصیتوں نے اس بحث میں میری تائید کی ہے۔ لفٹنٹ کرنل جے چیمبرس J. Chambers پروفیسر ہندستانی جامعۂ آکسفورڈ کا ایک خط میرے پیشِ نظر ہے جسے میں نقل کرتا ہوں:۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ آپ اور بہت سے نام ور ہندستانی حضرات جدید ہندی کے مقابلے میں اُردو کے رواج کے حامی ہیں۔ ہندی مجھے بالکل پسند نہیں کیوں کہ یہ فارسی، عربی، انگریزی اور کچھ مقامی محاوروں اور سنسکرت ترکیبوں کا ناخوش گوار مجموعہ ہے۔ یہ سنسکرت ترکیبیں ہندستان کے کسی ایسے حصّے میں رائج نہیں جہاں میں ۱۸۳۴ء سے ۱۸۶۲ء تک مقیم رہا، یہاں جن حصّوں کا میں نے سفر کیا جن میں بنگال کے تمام اضلاع اور مدراس اور بمبئی کی پریسیڈنسیوں کے کچھ اضلاع شامل ہیں۔ دیوناگری رسم الخط، اس میں کوئی شک نہیں کہ سنسکرت اور ٹھیٹھ ہندی کے لیے اچھی طرح موزوں ہے۔ لیکن اجنبی الفاظ کو تحریر کرنے کے لیے بہت ناقص ہے کیوں کہ اس رسم الخط میں دوسرے حروف کی آواز کو ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ المختصر میں یہ سمجھتا ہوں کہ فارسی رسم حروف ہندستان میں عام استعمال کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ ہندستانی سپاہی اِنھی (فارسی) حروف کو استعمال کرتے ہیں، اور اگر نہیں کرسکتے تو دیوناگری نہیں بلکہ کیتھی ناگری کو استعمال کرتے ہیں، اگر بنگالی ہوں تو مہاجنی کو اور پنجابی ہوں تو گورمکھی کو۔ اگر وہ فارسی رسم الخط استعمال نہیں کرسکتے تو اس رسم الخط کو استعمال کرتے ہیں جو اُن کے مفاد کے مطابق ہو۔"

سیّد عبداللہ کی بھی یہی رائے ہو۔ اس سے قبل اپنے گزشتہ مقالوں میں مجھے کئی بار ان کا ذکر کرنے کا موقع مِلا ہو۔ اس نامور ہندستانی نے لندن میں رُبع صدی گزارنے کے بعد، جہاں انھوں نے ایک انگریز (رومن) کیتھولک خاتون سے شادی کی ہو اپنے وطن جانے کا ارادہ کیا ہو۔ ان کے دوستوں کو اس کا افسوس ہو کہ انگلستان ایک ایسے قابل ایشیائی کی موجودگی سے محرُوم ہو جائے گا جو اسلامی مشرقی ادب اور زبان وادب انگریزی کا یکساں ماہر تھا۔ وہ یونی ورسٹی کالج میں ہندستانی کے پروفیسر تھے اور سیکڑوں شاگردوں نے اُن سے فیض پایا جن میں سے میں صرف ان کے سب سے زیادہ قابلِ ذکر شاگرد یعنی ایڈورڈ ایچ۔ پامر Edward H. Palmer پروفیسر عربی کیمبرج کا ذکر کروں گا جو نہ صِرف اس زبان کو بڑی روانی سے لکھنے اور بولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جیسے وہ پڑھاتے ہیں بلکہ ہندستانی اور فارسی کو بھی۔

سیّد عبداللہ صِرف بہ حیثیت پروفیسر ممتاز نہیں بلکہ اپنے مفید اُردُو اور ہندی انتخابات کی وجہ سے بھی مشہور ہیں جن کا میں نے یا اپنی "تاریخِ ادب ہندوی وہندستانی" Histoire de la litterature hindouie et Hindoustanie. میں یا اپنے سالانہ مقالات میں ذکر کیا ہو۔ یقیناً وہ اپنی فنی قابلیت کے ثمرات عوام الناس کے سامنے پیش کرتے رہیں گے، اب تو وہ بہار میں مہتمم مدارس ہیں[1]۔

---

[1] پنجابی مورخہ ۵ جولائی میں سیّد عبداللہ کے متعلق تعریف سے پُر ایک مضمون چھپا ہو یہ مضمون اس تفصیلی خط کے ترجمے کے ختم پر ہو جو پنجاب کے اخبارات میں اشاعت کے لیے ایک مشہور افسر اور قابل طبیب نے لکھا ہو۔

علی گڑھ اخبار[1] کے ایک مضمون سے ہمیں اس کا علم ہوتا ہے کہ الہ آباد میں ۸ دسمبر ۱۸۷۳ء کو مولوی فرید الدین پلیڈر ہائی کورٹ[2] کے ساتھ مل کر انھوں نے ایک جلسہ منعقد کیا جس کے صدر جعفر علی تھے جس میں الہ آباد کے مشہور مسلمان شریک تھے۔ جلسے کا مقصد یہ تھا کہ ممتاز ہندوؤں کی حکومت کے نام اس درخواست کے خلاف احتجاج کیا جائے جس میں دفاتر اور مدارس میں دیوناگری رسم الخط کے رواج کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس موضوع پر مباحثے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ الہ آباد میں ایک مرکزی کمیٹی قائم کی جائے جس کے سکریٹری سید احمد خاں ہوں اور وہ مجلس کی تجویزات کے مطابق عمل کریں۔

دیسی اخبارات میں اُردو کو خوش بیان حامی برابر ملتے جاتے ہیں۔ اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ مورخہ یکم جولائی ۱۸۷۳ء میں ایک مضمون میں جس کا عنوان "اُردو اور ناگری (ہندی) کے موضوع پر بحث" ہے، یہ حصہ ملاحظہ ہو:۔

"یا اللہ، یا اللہ، لوگ بھی کیا مٹی اُچھالتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ اُردو کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیں اور ناگری کو زندہ کریں۔ سرکار میں انھوں نے عرضیاں بھی بھیجی ہیں۔ اخبارات میں لمبے چوڑے مضامین لکھے ہیں اور کمیٹیاں قائم کی ہیں۔ مُریوں کے اس کھیل میں صوبہ جاتِ شمال مغربی کے اعلا عہدے دار سپہ سالار بن گئے ہیں۔ پھر بھی کون ہے

---

[1] شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۸۷۳ء

[2] جو وکلا ہائی کورٹ میں پیروی کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حسب پسند انگریزی یا اُردو میں امتحان کام یاب کریں۔

جو خدا کے کام کو مٹا سکے؟

کیا ایسی زبان کو نیست و نابود کیا جا سکتا ہو جو دو سو سال سے ہندُستان میں عام ہو اور جو شمالی ہندستان کے تمام باشندوں کے آب و گِل میں سرایت کر چکی ہو؟

حیرت کی بات ہو کہ اُردو کُش اصحاب اس کے درپے ہیں کہ اُردو زبان گورمنٹ کے رجسٹروں سے خارج کر دی جائے۔ مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا کوئی ہندستانیوں کا مُنھ بند کر سکتا ہو یا اس امر کو قابلِ الزام قرار دے سکتا ہو کہ کوئی اپنے گھر میں اپنی بیوی، اپنے دوستوں اور اپنے ملاقاتیوں سے اُردو نہ بولے۔ جب تک یہ ناممکن بات پوری نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ چند سرکاری رجسٹروں سے خارج کر دیے جانے پر اُردو زبان ترک کر دی جانے گی۔ خدا نہ کرے۔ یہ زبان ہندُستانیوں کے لیے ایسی ہو جیسے آٹے میں نمک۔ کون اسے مٹا سکتا ہو؟

مدت دراز سے ہمارے کئی ممتاز ہم وطن اس موضوع پر خاموش سے ہیں اور ہم بھی اس مسلک پر عمل پیرا ہیں کہ فتنہ خوابیدہ کو جگانا نہ چاہیے۔ پھر بھی ان شکایات کے نتائج سے قطع نظر جو حکومت سے کی گئی ہیں، ہم اپنے ہم وطنوں کی توجہ بالآخر اس کی طرف منعطف کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں کسی نتیجے پر پہنچ جائیں۔

ان دلائل کے بعد جو ناگری ہندی کے حامی اپنی حمایت میں پیش کرتے ہیں یہ صاف واضح ہو کہ اس تبدیلی (جو کبھی وقوع میں نہ آئے گی) کی خواہش کا اصلی باعث محض تعصب کے سوا کچھ اور

نہیں جو دلیلیں وہ پیش کرتے ہیں ان میں ان کے نزدیک سب سے زیادہ وقیع یہ ہے کہ دیہاتی یا چھوٹے چھوٹے قصبوں کے رہنے والے اُردو نہیں سمجھ سکتے اور ان کے لیے ان دستاویزات اور کاغذات کا پڑھنا جو اس زبان میں ہیں، تکلیف دہ ہے۔ اس اعتراض کا ہمارے پاس یہ جواب ہے کہ اُردو زبان ہندستان میں دو سو سال سے رائج ہے اور اس کے ذریعے ہر قسم کے سرکاری معاملات انجام پاتے رہے ہیں اور حال تک کسی نے اس موضوع پر شکایت کرنے کا کبھی کوئی قصد نہیں کیا۔ اودھ اور صوبہ جاتِ شمال مغربی میں کوئی چھوٹا قصبہ یا گاؤں ایسا نہیں ہے جہاں کے لوگ اُردو سے اس درجہ ناواقف ہوں کہ سرکاری کاغذات کو سمجھ نہ سکیں۔ کوئی بدنفس حاکم اس کے رواج کی ممانعت کر سکتا ہے لیکن ہمارا دعوا ہے کہ اس زبان نے ایسی زندگی پائی ہے کہ کوئی اسے مٹا نہیں سکتا۔ گاؤں میں قدرتی طور پر بہ کثرت لوگ ناگری (ہندی) جانتے ہیں۔ مگر لکھنؤ، دہلی، آگرہ جیسے بڑے بڑے شہروں میں ہزار میں شاید ایک آدھ شخص جانتا ہو اور عدالتیں تو انھی بڑے بڑے شہروں میں قائم ہیں۔ اگر اُردو کا استعمال سرکاری تحریروں میں بالکل ترک کر دیا جائے تو شاید ایک طرح سے یہ چیز دیہاتوں کی حد تک جائز ہو مگر بے چارے شہر والوں کو جو کیا بہ لحاظِ تعداد، کیا بہ لحاظِ تعلیم و ادب، کیا بہ لحاظِ مرتبہ وحیثیت دیہاتیوں سے برتر ہیں، بڑی قربانی کرنی پڑے گی .....

بڑی حماقت ہوگی اگر ان ترکیبوں کو ترک کیا جائے جو لوگوں کی مادری زبان کا محاورہ بن گئی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ بہار میں اُردو کے استعمال

کو روک کے از سرِ نو جاری کرنا پڑا۔ ہم دیکھیں گے کہ اس طرح کی حامل ضدّین تجویزیں کس منزل تک پہنچتی ہیں۔ سر جارج کیمبل[1] Sir George Campbell بڑے فہیم آدمی ہیں مگر متلوّن المزاج۔ ان کے بہت سے احکامات ان کے تخیل کی پیداوار ہیں جو ان کی طبیعت سے بہت مشابہ ہو لیکن یہ کون جانچے کہ انھوں نے جو کیا، ٹھیک تھا یا نہیں۔ میری رائے میں تو تمام کوششیں جو انھوں نے کیں، درخواستیں جو بے وقوفوں اور احمقوں نے دست خط کر کے گورمنٹ میں بھیجیں، شکایتیں جن سے انھوں نے جرائد کے صفحات سیاہ کیے سب بے کار اور لاحاصل ثابت ہوں گی۔ اُردو کا استعمال روکنے اور ناگری کو رواج دینے سے پہلے اشیا کی ماہیت بدلنی ہوگی...... لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش ایک خیالِ خام اور ناممکن العمل سی بات ہو، اچھی خاصی حماقت ہو......

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اُردو اور ہندستانی ایک ہی ہو۔ آخر الذکر نام یورپینوں کا دیا ہوا ہو جس کو وہ اوّل الذکر نام پر ترجیح دیتے ہیں جو ہندستانیوں میں زیادہ مستعمل ہو۔ "بنگال میگزین" بابت جنوری ۱۸۷۱ء میں اُردو کے متعلق بہت سی واہیات عبارتیں شائع ہوئی ہیں اور مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ "ہریش چندر میگزین" (بابت فروری ۱۸۷۴ء) میں جو ہندی کا بڑا اچھا ماہوار رسالہ ہو، ان کو نقل بھی کیا گیا ہو۔ یہ اس زبان کے متعلق ہیں جس

---

[1] ملاحظہ ہو میرا "مقالہ" بابت ۱۸۷۲ء

کو وہ اُردو، ہندستانی اور کبھی کبھی ہندی کہتا ہے لیکن اُردو کے خلاف مضمون کے گم نام مصنف نے جہاں اُردو کا ذکر کیا ہے، اس سے وہ شاعرانہ زبان مُراد لی ہے جو زیادہ تر ریختہ کہلاتی ہے اور جو ہندستان کے کسی حصّے میں رائج نہیں جس طرح ٹھیٹھ انگریزی شاعری کی زبان روز مرہ کی گفتگو میں استعمال نہیں ہوتی۔ اسی گم نام مضمون نگار کے دعوے کے مطابق یہ "عام ہندستانی" یا ہندی جو عام اُردو سے کسی طرح مختلف نہیں، ہندستان بھر میں بجز بنگال کے ایک حصّے اڑیا زبان کے علاقے کے تنگ سے حصّے، تامل، مرہٹہ اور گجرات کے علاقے کے جہاں پھر بھی ہندستانی کافی طور پر سمجھی جاتی ہے، رائج ہے۔ ہندستان کے باقی تمام حصّوں ست پڑا اور مہادیو پہاڑوں کے شمال میں صوبہ جاتِ متوسط کے مشرقی اضلاع میں، صوبہ جاتِ شمال مغربی اور سابق مملکتِ اودھ میں ساگر اور نربدا اور نربدا کے علاقوں میں بندیل کھنڈ اور مالوے میں وسطِ ہند اور راج پوتانے میں اور کوئی زبان عام طور پر رائج نہیں۔ یوں ان تمام مختلف سرزمینوں میں جن کی آب و ہوا یکسر جدا جدا طرح کی ہے جہاں کے آداب اس قدر مختلف ہیں، یہی زبان بولی جاتی ہے، اب آپ اسے اُردو کہیے یا ہندستانی یا ہندی کہہ لیجیے لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہندستانی سے مضمون نگار کا مطلب دیوناگری رسم الخط کی زبان سے تھا جس میں فارسی اور عربی الفاظ نہ ہوں اور اس کا مقصد تھا کہ وہ سر جی کیمبل اور ہندوؤں کی پست خیال جماعت کے خیالات کی تائید کرے۔ اچھے دلائل کے موجود نہ ہونے کے باعث اس نے ان لوگوں پر حملے کیے ہیں

جو اس کے ہم خیال نہیں ہیں اور اسی طرح مشنریوں پر بھی یہاں تک کہ اس نے بابو شیو پرشاد المتخلص بہ وجہی پر بھی حملہ کیا ہو کہ انھوں نے عربی فارسی الفاظ استعمال کیے ہیں اگرچہ کہ ان بابو صاحب نے جن کا شمار موجودہ ہندستان کے چوٹی کے اور پُر مغز ادیبوں میں ہوتا ہو حقیقی روٴ میں پڑکر اپنی بہت سی تصنیفوں میں ناگری رسم الخط کو استعمال کیا ہو۔ گمنام مضمون نگار اس میں اس تاریخ ہند کا حوالہ دیتا ہو جس کی تکمیل کی اطلاع مَیں نے اپنے ۱۸۷۳ء کے مقالے میں دی تھی۔ اس کا نام بڑے دعوے کے ساتھ "اتہاس تمرنسک" (ایسی تاریخ جو جہالت کو دور کرتی ہو) رکھا گیا تھا۔ باوجود اپنے انتہائی ہندستانی نام اور دیوناگری رسم الخط کے بلاشبہہ اس کتاب کی زبان وہی وہی ہندستانی اُردو یا "عام ہندستانی" ہو جس میں اور اُردو زبان میں مضمون نگار نے اپنی حماقت سے اختلاف دکھانے کی کوشش کی ہو۔ یہ تصنیف اس کی مثال ہو کہ رسم الخط کی تبدیلی کے باوجود زبان نہیں بدلی۔ بابو کاشی ناتھ[2] نے اس کے متعلق صفائی سے کہا ہو کہ جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہو ان میں ان کو خوش کرنے کے لیے حکومتِ انگریزی نے اس (رسم الخط) کو رواج دینے کی سعی کی ہو۔ پھر بھی اس میں دشواریوں کا سامنا ہو کیوں کہ بہت سے عربی فارسی حروف ایسے ہیں جن کا بدل دیوناگری میں نہیں۔ اس

---

[1] اس مصنف کے متعلق میری "تاریخ ہندوی و ہندستانی" میں مضمون ملاحظہ فرمائیے۔

[2] "ہریش چند میگزین" کے اسی شمارے کے صفحہ ۱۲۳ پر وہ مضمون ہو جس کے موضوع کی میں تردید کر رہا ہوں۔

کا نتیجہ یہ ہی اکثر ایسے جملوں کو سمجھنے میں دقت پیش آتی ہی جن میں ایسے الفاظ ہیں جو ہندی الاصل نہیں مگر ہمیشہ سے زبان کا جزو لاینفک رہے ہیں۔ بہت سے ہندوؤں کی یہ خواہش ہی کہ انھیں متروک کر دیا جائے۔ چناں چہ ان میں سے ایک نے سررشتۂ تعلیم پنجاب کو اس موضوع پر ایک خط لکھا ہی جو پنجابی[۱] میں شایع ہوا ہی۔ جس میں یہ بہانہ کیا گیا ہی کہ ہندو وہ عربی اور فارسی الفاظ نہیں سمجھ سکتے جو ہندی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر اس نے "اتھاس تمر ناسک" کا ایک فقرہ نقل کیا ہی جس کا مطلب اس نے ایک ہندو اسکول ماسٹر کو غلط سمجھاتے ہوتے سنا۔ لیکن یہ جملہ انتہا درجے سہل ہی اور بجز ایک اسم خاص کے اس میں کوئی ایسا ہندستانی لفظ نہیں کہ سننے والوں کو معنوں کی تحقیق کرنی پڑے۔ جملہ یہ ہے:
"چوگان کھیلتے ہوتے قطب الدین ایک گھوڑے سے گر کر مر گیا"
اسکول ماسٹر غلط سمجھا۔ غلطی انسان سے ہو ہی جاتی ہی اور اس نے پست خیال ہندو طبقے کو پریشانی کا موقع یہ ترجمہ کر کے دیا:
"ایک میدان میں اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوتے گرا اور مر گیا"

اسی ایک مثال سے ان لغو اعتراضات کی اصلیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہی جو گم نام مضمون نگار نے اپنے مضمون "عام ہندستانی" میں کیے ہیں جو "بنگال میگزین" میں چھپا ہی۔ جو اعتراضات مشہور اور نامور بابو شیو پرشاد کے متعلق کیے گئے ہیں ان سے ان کی ذات بہت بالاتر ہی اور وہ ان جملوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں گے۔

---

[۱] یکم جنوری ۱۸۷۰ء

عجیب و غریب بات یہ ہو کہ " ہریش چندر میگزین " کی اسی اشاعت میں جس میں گم نام مضمون نگار کا یہ مضمون چھپا ہی، چند صفحات کے بعد اسی تصنیف پر جس پر لعن طعن ہوا ہی، ایک اور مضمون چھپا جس میں اس کے اسلوب کو " بہترین " قرار دیا گیا ہی۔ بنارس کے ایک کٹر ہندو نے یہ مضمون لکھا ہی جس میں شیو پرشاد پر یہ الزام لگایا گیا ہی کہ وہ سرکارِ انگریزی کی اندھی تائید کرتے ہیں، ہندستانی مرکزوں اور پرانوں اور برہمنوں کا حقارت سے ذکر کرتے ہیں مسلمانوں کی حکومت کا ذکر کرتے ہوئے ان نقصانات کے ساتھ ساتھ جو ہندوؤں کو پہنچے ان فوائد کا بھی ذکر کرتے ہیں جو انھیں نصیب ہوئے قصّہ مختصر الزام یہ ہی کہ وہ بے تعصب ہیں۔ پھر بھی باوجود ان تمام اعتراضات کے ہمارے گم نام دوست کے برخلاف اس کٹر مضمون نگار کو کتاب کا اسلوب بڑا پسندیدہ اور بہت دل کش معلوم ہوتا ہی۔

زبان کی اصلاح کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہی۔ ضرورت اس کی ہی کہ شاعری کا جمود دور کیا جائے۔ ضرورت اس کی ہی کہ ہندستانی شعرا اپنے پامال راستے کو ترک کریں، ان مضامین کو چھوڑ دیں جنھیں سیکڑوں بار باندھا جا چکا ہی، عشقیہ مضامین، لفاظی اور خصوصاً ایسے مضامین کو چھوڑیں جن کا تعلق غیر طبعی عشق سے ہی مگر معلوم یہ ہوتا ہی کہ حکومتِ انگریزی اور مغربی تعلیم یافتہ ہندو جو زبان کی تبدیلی کے اس قدر خواہش مند ہیں، ادب میں بھی مغربیت چاہتے ہیں حالاں کہ اس کی کافی مخالفت ہوگی کہ ادب کی اصلی خصوصیت

نائل ہوجاتے ہماری صدی کا خاص رُجحان یہ ہو کہ ہر چیز یکساں ہو۔
بوآلیو doilean نے ٹھیک لکھا ہو:۔

"L'ennui naquit un jour de l'uniformite

ایک مضمون جس کا عنوان "اُردو کی جوانی یا زندگانی" [۵] ہی۔

ملاحظہ ہو:۔

اُردو مسلمانوں اور ہندوؤں کو باہم ملاتی ہی۔ فرق محض یہ ہی کہ بعض ضلعوں میں جہاں عربی فارسی پسند کرنے والے مسلمان کثرت سے آباد ہیں، عربی اور فارسی کی چاشنی زیادہ ہوگئی ہو۔ جہاں سنسکرت کو پسند کرنے والے اور بھاشا بولنے اور لکھنے والے ہندو زیادہ آباد ہیں، وہاں سنسکرت اور بھاشا کو زیادہ فروغ حاصل ہی۔ لیکن اگر ہندستانی میں عربی اور فارسی الفاظ ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہی۔ حکومت جو پہلے اپنے رجسٹروں میں تحریر کے لیے یہ زبان استعمال کرتی تھی۔ اب اگر ہندو مسلم ملاپ کے لیے کوئی اور زبان استعمال کرنے کی کوشش کرے گی تو میرے خیال میں یہ بے نتیجہ اور لاحاصل محنت ہوگی۔ کیوں کہ اُردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں جو اس لیے اختیار کی جاسکے۔

اُردو نے اس زمانے میں ایسی نمایاں حیثیت حاصل کرلی ہی کہ وہ آفتاب سے زیادہ نمایاں ہی اور روزِ روشن کو روشنی بخشتی ہی۔ سررشتۂ تعلیم کی کوششوں سے یہ زبان ہر گانو میں پھیل چکی ہو۔ جہاں کہیں ایک بھی اسکول ہی یا کوئی بھی پڑھنا لکھنا جانتا ہو اُردو زبان ہی استعمال ہوتی ہی۔ میجر ہال رائڈ Holroyd اور سررشتۂ تعلیم کے

دوسرے عہدے داروں کو اپنے پیش تروں کے مقابلے میں اس سے زیادہ اُنس ہی اور یہ چیز بالکل قدرتی ہی کیوں کہ ان میں سے بہتوں نے اپنی زندگانی کا ایک حِصّہ دہلی میں گزارا ہی جو گویا اُردُو کا وطن ہی۔

ان اصحاب نے اُردُو میں بہت سی کارآمد کتابیں لکھی ہیں اور عربی اور انگریزی سے مستند کتابوں کا بہت عمدگی سے ترجمہ کیا ہی اور اس کا حکم دیا ہی کہ فنون کے متعلق کتابوں کی بہت مناسب طور پر تصیح کی جائے۔ پنجاب کے ناظمِ تعلیمات میجر ہال رائڈ نے اس طرح توجّہ کی ہی کہ زبان کو اور جِلا دی جائے اور اسے ترقی دی جائے۔ اس مقصد کے حصوٗل کے لیے انھوں نے کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی۔ زبان کی ایک نئی زندگی شروٗع ہوئی ہی اور اس کی توقّع کی جاسکتی ہی کہ وہ مکمل ہوکر رہے گی۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے انجمنِ لاہور سے اصرار کیا ہی کہ ہر مہینے ایک مجلسِ مشاعرہ منعقد کی جائے جس میں اچھے انداز میں حقیقی اور دل چسپ موضوعوں پر لکھی ہوئی نظمیں پڑھی جائیں اور عشقیہ غزلیں یا قصیدے نہ لکھے جائیں۔ شعرا جن کے دماغوں پر اس دعوت کا ضرور اثر ہوگا۔ خاص طور پر موردِ عنایت ہوں گے اور ایک خاص کمیٹی کے تصفیے کے بعد انھیں انعامات اور صِلے دیے جائیں گے۔

یہ مشاعرے کوئی نئی چیز نہیں، ہر عصر میں یہ ہندُستان میں منعقد ہوتے رہے مگر یہ سیدھے سادے ہوتے تھے اور خود بہ خود منعقد کیے جاتے تھے۔ لیکن جن مشاعروں کی حیثیت سرکاری ہوگی ان کا مقصد خاص ہوگا۔

ہندستانی اخبارات میں بالارادہ اصلاح کے متعلق بہت سے مضامین چھپ چکے ہیں[۱] اور مولوی محمد حسین المتخلص بہ آزاد پروفیسر لاہور کالج نے انجمن کے ایک جلسے میں اس تجویز کی حمایت میں ایک تقریر کی ہے جو میجر ہال رائڈ کی خواہش کی تائید میں ہے اور ان کے نظریوں سے اتفاق رائے رکھتی ہے۔ میجر ہال رائڈ اس تبدیلی کے جس کو سب پسند کرتے ہیں، خاص ترقی دینے والوں میں ہیں۔ اپنی جگہ پر رجعت پسند ہندو بھی خاص جلسے کرنا چاہتے ہیں کہ ہندی شاعری میں بھی وہ اصلاحات کرسکیں جن کے وہ خواہش مند ہیں اور منشی گوبند لال نے ان کا مطالبہ کیا ہے[۲] لیکن جو تجویزیں پیش کی گئی ہیں وہ ایسی نہیں کہ ہندستان کے ادبی حلقوں میں پسند کی جاسکیں۔ یہ بہت جلد واضح ہو جائے گا۔ پہلے محمد حسین کی تقریر کے کچھ جملے ملاحظہ کیجیے:-

"آج اپنی نااہلیت کے باوجود میں ایک ایسے مسئلے پر کچھ کہنا چاہتا ہوں جس کے متعلق میں نے اب تک کچھ نہیں کہا کیوں کہ یہ میرے وطن، اس عظیم الشان سرزمین جس کو ہندستان کہتے ہیں جس سے مجھے بہت محبت ہے اُس کی زبان کا مسئلہ ہے جس چیز کا میں اس خاص موقع پر ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ اُردو شاعری اور اُردو فنِ بلاغت کا مسئلہ ہے جو ہماری روزمرہ گفتگو کے محاورے سے

---

[۱] من جملہ کئی اور اخبارات کے انجمنِ پنجاب مورخہ ۸ مئی ۱۸۷۴ء اور پنجابی ۴ مئی اور ۱۱ جولائی ۱۸۷۴ء

[۲] اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ یکم جولائی اور یکم اگست ۱۸۷۴ء

متعلق ہی۔ اُردؤ زبان کے ذریعے ہم تمام قابلِ فہم باتوں کو تحریر کر سکتے ہیں ۔اس وقت اس کا موقع نہیں کہ زبان کی آفرینش اور اس کی پرانی بنیادوں کا ذکر کیا جاتے۔ یہ کہنا کافی ہو گا کہ زبان اُردؤ جسے ہم ہندستان میں رائج دیکھتے ہیں، "اصل ہں برج بھاشا یا بھاکا (ہندی) ہو جسے سب جانتے ہیں کہ سنسکرت سے نکلی ہو اور ہندستانیوں کے لیے باعثِ فخر ہو کہ یہ ان کی قدیم زبان کی نشانی ہی۔ سنسکرت کے دوٗر کے بعد برج بھاشا گھروں میں گھریلو کام کاج کے لیے، بازاروں میں خرید و فروخت کے لیے استعمال ہوتی رہی۔ لیکن یہ علوم اور ادَبی تصانیف کی زبان نہ تھی ۔اسی وجہ سے اس زبان میں تکلفات اور بلیغ الفاظ کے ساتھ استعارات و تشبیہات کو استعمال کیا گیا کہ اس کے بغیر یہ زبان سنسکرت کی بلندی پر نہ پہنچ سکتی تھی"۔

اُردؤ بھاشا سے نکلی جو الفاظ پہلے تھے وہ باقی رہے اور ان کے ساتھ نئے الفاظ کا اضافہ ہوا۔ لیکن ابتدائی زمانے میں یہ زبان نہ نظم میں استعمال ہوتی تھی نہ نثر میں جیسے کوئی زمین خالی اور نباتات سے عاری نہیں رہ سکتی تھی اس طرح کوئی زبان شاعری کے بغیر نہیں رہ سکتی[1] چناں چہ بھاشا اور اُردؤ میں نظموں کے لکھے جانے میں تاخیر نہیں ہوئی۔ آخر الذکر میں شاعر ولی کے ظہور سے بعد سے سو سال کے عرصے میں شاعری نے بہت نشو و نما پائی اور اس دوٗران میں مختلف حصّوں میں کئی دیوان لکھے گئے۔ یہ اُردؤ

---

[1] شاعری بھی اتنی ہی پرانی ہو جتنی کہ یہ دنیا۔ مشرقیوں کا خیال ہو کہ ہابیل کی شہادت پر حضرت آدمؑ نے ایک مرثیہ لکھا تھا۔

مصنفین ان متقدمین کی اولاد تھے جو فارسی بولتے تھے، چناں چہ فارسی عروض پر انھوں نے اپنی نظموں کی بنیاد رکھی۔ فارسی ہی کے دل کش اور تصویر نما استعارات کو استعمال کیا۔ قصہ مختصر فارسی فنِ بلاغت کی نقل لی۔ اس طرح اُردو نے اس طرح کی لفاظی اور رنگ آمیزی سیکھی کہ بھاشا میں جو خیالات استعمال ہوتے تھے اور جو اس ملک کے حالات کے مطابق تھے، اس حد تک غائب ہوگئے کہ کوئل کی صدا اور چنبیلی کی خوش بو کو لوگ بھول گئے اور صرف گل و بلبل کی توصیف ہونے لگی جو ہندستان میں معدوم ہی۔ یہ چیز قابلِ اعتراض نہیں سمجھی گئی کہ رستم و اسفندیار کی بہادری، کوہ ہائے الوند و بیستون کی بلندی جیحون و سیحون کی روانی کا ذکر، ارجن کی بہادری، ہمالیہ کے برف پوش پہاڑوں اور دریائے گنگا کے ذکر سے زیادہ کیا جاتا ہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک لحاظ سے ہم فارسی کے مشکور ہیں کیوں کہ اس کے ذریعے ہماری زبان کو یہ رفعت، طاقت اور زور حاصل ہوا۔ اس کی تشبیہات و استعارات کی بدولت ہماری زبان بہت ہی دل کش اور دل فریب تصویریں کھینچ سکی۔ پہلے جب یہ چیزیں فارسی نظم و نثر میں استعمال کی گئیں تو ان عجیب و غریب تشبیہات کی نسیم سے ہمارے باغ کے پھول کھِل گئے جن کو ان استعارات کی شبنم نے تازگی بخشی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو زبان کے اسلوب کی بلندی، اور اس کے تخیل کی پاکیزگی ایک لا محدود درجے تک پہنچ گئی ہی۔ یہ ایک ایسی روشنی ہی جو الفاظ کے گورکھ دھندوں

اور استعارات کے معنوں میں اس طرح چمکتی ہی جیسے کرمکِ شب تاب جو اندھیری رات میں جگمگاتا ہی اور پھر نظروں سے چھپ جاتا ہی۔ اے گلبنِ بلاغت کے باغ بانو! تم اس شی کو بلاغت نہیں کہہ سکتے جو خیالات کے زور اور ان کی بلندی میں مانع ہو شعر کے پر لگا کر زورِ کلام سے تم آسمان تک اُڑ سکتے ہو لیکن تم استعارات کی گہرائیوں میں دھنس کر اپنے آپ کو تباہ کر چکے ہو۔

مبالغہ اگر عقل کی حدود میں ہو تو ایک حد تک کوئی اس کے زور کو پسند کر سکتا ہی کیوں کہ مبالغہ تشبیہات کو نمکین بناتا ہی، زبان کو چمکا دیتا ہی، واقعات کے اظہار کا بہت بڑا ذریعہ ہی۔ پھر بھی نمک کا استعمال ضرورت بھر ہونا چاہیے یہ نہ ہو کہ پوری غذا میں نمک ہی نمک ہو۔ تشبیہات اور استعارات کا استعمال اس طرح ہونا چاہیے کہ وہ کیفیات کا آئینہ ہوں جن سے واقعات واضح ہو سکیں نہ کہ اور زیادہ دُھندلے معلوم ہوں ہم کو احتیاط کے ساتھ فارسی کی تقلید کرنی چاہیے اور اس کی تشبیہات، استعارات اور ترکیبات کو اختیار کرنا چاہیے۔ بھاشا کی سادگی اور قدرتی طرزِ بیان بھی باقی رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ زمانے کا رنگ بدل گیا ہی۔ ہم اچھی طرح آنکھیں کھولیں تو دیکھ سکیں کہ فصاحت و بلاغت کے عجائب کا طلسمی قصر کھلا ہوا ہی اور یورپ کی زبانیں ہمارے لیے ایسے گل دستے اور سامانِ زیب و زینت پیش کر رہی ہیں جن سے ہماری شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گا اب ضرورت اس کی ہی کہ کوئی ہمت کر کے آگے بڑھے اور شاعری کو

دھکیل کر آگے بڑھاتے۔

ہماری شاعری کو متقدمین سے جو کچھ ملا ہے وہ اب کہنہ اور ناقابلِ استعمال ہے...... فارسی نے بھاشا پر اپنا نقش جمایا اور اردو شاعری اور فنِ بلاغت نے اس ملاپ سے ایک خاص لطف اٹھایا ہے کیوں کہ اردو ان لوگوں کی زبان ہے جن میں سے کچھ بھاشا بولتے تھے اور کچھ فارسی۔ بھاشا اور فارسی کی اس زمانے میں وہی حیثیت تھی جو انگریزی اور اردو کی اب ہے۔ آج ضرورت اس کی ہے کہ انگریزی خیالات کی شعاع اردو شاعری میں سرایت کرے۔ کیوں کہ باوجودے کہ ہمارے بزرگ لوگوں نے ہماری زبان کو قدرتِ بیان بخشی، گرمی، زور، تشریح اور صنائع کی شان و شوکت عنایت کی، جس کی وجہ سے وہ کسی اور زبان سے کم نہیں، انھوں نے اس میں ایک بہت بڑی خامی بھی رہنے دی اور وہ یہ کہ انھوں نے حدِ اعتدال سے تجاوز کیا۔ بجز مضامینِ عشقیہ کے وہ کسی اور مضمون کو نہیں باندھتے تھے، عاشق و معشوق کے وصل کے متعلق پُرتکلف اشعار لکھتے تھے، فراق کا رنج اور شکایتیں اور گریہ وزاری، شراب و ساقی[1] کی قصیدہ خوانی، بہار و خزاں کا ذکر، قسمت کی شکایت، خوش حال لوگوں کی مدح و ستایش، لیکن یہ سب چیزیں محض خیالی ہوتی ہیں اور بعض اوقات اس قدر اُلجھی ہوتی اور غیر مانوس استعارات سے لبریز کہ ان کا مطلب

---

[1] ہندستانی اور فارسی شاعری میں شراب و ساقی کا ذکر استعارۃً کیا جاتا ہے کیوں کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کو شراب نوشی کی ممانعت ہے۔ شراب عشقِ حقیقی ہے ساقی روحانی پیشوا۔

سمجھ میں نہیں آسکتا، اگر ہم اس تنگ دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش کیے بغیر ان کی پیروی کرنے پر اڑے رہے تو ہم کبھی ترقی کے زینے تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

میرے عزیز ہم وطنو! یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں کہ اب ہم میں کوئی شاعر باقی نہیں۔ چوں کہ یہ شعرا پرانی لکیر کے فقیر ہیں اس لیے ان کے کلام میں کوئی دل کشی نہیں۔ یہی حال رہا تو ایک دن ہماری زبان شاعری سے بالکل عاری ہوجائے گی، فنِ شاعری کا چراغ بالکل بجھ جائے گا۔ میں آپ کو خدا کی سوگند دیتا ہوں کہ اپنے ملک کے پرانے نام وروں کو بھول جائیں اور اپنی زبان کے اس نئے دور سے دل چسپی پیدا کریں جن زنجیروں میں ہمارے شعرا بندھے ہوتے ہیں، ان سے انھیں آزاد کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اصلاحات کے قبول کرنے میں کوئی دقّت نہیں ہوگی۔ کیوں کہ خوش بیان مصنفین اس ڈیڑھ سو سال کے عرصے کی تنگ حدود سے عاجز آگئے ہیں۔ اپنا خونِ دل اور خونِ جگر خشک کرچکے ہیں...... نا امید ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہم تمام مزاحمتوں پر غالب آجائیں گے۔

مدت سے میں اپنے ہم وطنوں میں اصلاحِ ادب کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ آج میں انتہائی زور سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ ہماری سرکار ہمارے دلوں میں تعلیم و ترقی کی خواہش پیدا کر رہی ہے۔ پس وقت آگیا ہے کہ ہماری بلاغت کا ستارہ چمکے......"

ہندستانی شاعری کے اس نئے انداز کے نمونوں کے طور پر آزاد نے اپنی تقریر کے آخر میں اس قسم کے کچھ قطعات بھی شامل کیے ہیں۔ لیکن مجھے ان میں کوئی خاص یا قابلِ ذکر چیز نظر نہیں آتی۔ "پنجابی" میں ان نظموں پر تنقید کی گئی ہے۔ ایک صاحب نے ان کی پوری تقریر کی مخالفت کی ہے[1] یہ رسالہ اس بات میں محض تنہا نہیں ہے کہ اس نے جدت کی تجویزوں کی مخالفت کی ہے۔ مثال کے طور پر لکھنؤ کے فاضل سید غلام حسین کا بیان ملاحظہ ہو۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شاعری کا خاص ذوق رکھتے ہیں اور اس فن کے اصول سے خوب واقف ہیں۔

"مولوی محمد حسین[2] کی تقریر فصیح و بلیغ اور قابلیت سے پُر تھی محض یہ کہ مولوی صاحب نے جو کچھ غلطی سے اُردو میں کہا انھیں انگریزی میں کہنا چاہیے تھا۔ مزید برآں ان لوگوں کے لیے جو انگریزی جانتے ہیں، ان کی تقریر بہت خوب اور خوش مذاقی کا سچا نمونہ تھی۔

"اس اُردو کو جو بہ ظاہر ہندستانی اور دراصل انگریزی ہو گی ہماری سرکار رواج دینا چاہتی ہے۔ لیکن جب وہ ہندستانی جو بدقسمتی سے انگریزی نہیں جانتے، اس تقریر کو پڑھیں گے تو اس کی صورت دیکھ کر کہیں گے۔ یہ لفاظی، یہ ترتیبِ خیالات کا مربوط سلسلہ، یہ پیاری زبان، زبان کا یہ زور جو ہم نے اپنے کسی شاعر یا سخن گو کے کلام میں کبھی نہیں پایا۔ ان سب چیزوں کی مجموعی شکل

---

[1] بابت ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء صفحات ۳ اور ۶۔

[2] اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ یکم جولائی ۱۸۷۴ء

ایسی ہی جس سے ہم ششدر ہیں۔ لیکن ہمیں اپنی محدود عقل اور اپنی کُند طبیعت پر رونا آتا ہی کہ اس تقریر کو کئی بار پڑھنے کے بعد بھی ہم یہ نہ سمجھ سکے کہ مولوی صاحب کس بات کی شکایت فرما رہے ہیں اور وہ ہماری شاعری ہیں کیا اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ بہت غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مولوی صاحب دو باتوں کے خواہش مند ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُردو تشبیہات و استعارات سے پاک ہو جائے اور انگریزی اسلوب اختیار کرے۔ دوسری یہ کہ شعرا عشقیہ مضامین باندھنا چھوڑ دیں اور زبان محض مناظرِ قدرت اور مضامینِ حقیقت ادا کرے۔ پہلی بات کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہی کہ جس حد تک انگریزی تعلیم اور مغربی ہم آہنگی کا تعلق مغربیوں کے خیالات اخلاق و آداب سے ہی جو دو ہزار سال پُرانے ہیں اور بدلے نہیں جا سکتے اس حد تک ان کا بہت زیادہ اثر نہ ہوگا اور اگر کوئی اس نئے انداز میں جیسے مولوی محمد حسین نے ایجاد کیا ہی، لکھے گا تو ہنسا جائے گا۔

"دوسری بات کے متعلق ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا فی الحقیقت مولوی صاحب اُردو شاعروں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ عشقیہ مضامین کے سوا انھوں نے کچھ اور نہیں لکھا یا وہ محض یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہندستان کے قدیم و جدید شعرا نے اس قسم کی سخن ورزی کی کہ شاعری میں عشق کا ایسا تناسب ہی جیسے کھانے میں نمک کا؟ میرا جواب یہ ہی کہ اُردو شاعری کا بڑا حصہ عشق سے بالکل غیر متعلق ہی اور ہر قسم اور ہر نوع اور ہر طرح کے مضامین بڑے خاص اور دل کش انداز سے ادا کیے گئے ہیں۔

"مثال کے طور پر میر انیس اور میرزا دبیر کی شاعری لیجیے[1] ان کے کلام میں فصاحت، خیالاتِ عالیہ، صفائی و پاکیزگی، مختصر تشبیہ و استعارات کا تجمل اور شاعری کے جملہ محاسن ہیں یا نہیں؟ کیا ان کے کلام میں ان مناسب مضامین کی زرا بھی جھلک ہے جن کے مولوی صاحب شاکی ہیں؟ اگر وہ ان دو شعرا کے کلام کو حاصل کر کے غور سے پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ شاعری ان تمام نقائص سے بری ہے جن کے وہ شاکی ہیں اور اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی انھیں خواہش ہے۔ اگر مولوی صاحب کو شاعری کا زرا بھی شوق ہے تو وہ سرکاری اداروں[2] میں اس کلام کی تدریس کا مشورہ دیں گے، اُردو شاعری کو ذوق کے قصیدوں اور غالب اور سودا اور دوسرے نامور شعرا کے کلام سے پرکھیں گے اور انگریزی انداز داخل کر کے اُردو شاعری کو تباہ نہ فرمائیں گے۔"

"ہماری رائے میں عشق کو یقیناً شاعری میں بڑی جگہ ملنی چاہیے۔ اس کے بغیر شاعری بے لطف ہے۔ زمانۂ قدیم میں اسی سے شاعری کی جانچ کی جاتی تھی۔ لیکن یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا ہم متقدمین کی غلطیوں کی تقلید کریں یا اس کی گنجایش ہے کہ جدید خیالات کی اصلاح کے لیے تیار ہو جائیں۔ ہمارا زمانہ فی الحقیقت ترقی و ارتقا کا زمانہ ہے۔ لیکن

---

[1] ملاحظہ ہو "تاریخ ادبِ ہندی و ہندستانی" جلد اول صفحہ ۲۱۵ و ۲۰۱

[2] گوبند لال (پنجابی مورخہ یکم اگست ۱۸۷۴ء) کا خیال ہے کہ یہ نامناسب ہوگا کیوں کہ ان دونوں شعرا نے جنھوں نے غالباً انگریزی طرز کے مدارس میں تعلیم نہیں پائی ایسی چیزیں لکھی ہیں جو ہندستانیوں کے مذہبی تعصبات کو برانگیختہ کر سکتی ہیں۔

ترقی و ارتقا اسی چیز کے لیے ممکن ہیں جو ناقص یا خراب ہو۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ عشق جس کے مسلسل تذکرے پر ہمیں ملامت کی جاتی ہو، شاعری کی جان ہی۔ اس کے بغیر اس میں کوئی لطف نہیں۔ عشق اظہار کے لیے ایک عجیب و دل کش شے ہی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا محبوب محبوبِ حقیقی ہی جیسا کہ حافظ، رومی، امیر خسرو، شمس تبریز کی شاعری سے ظاہر ہی۔ اس طرح عشقیہ شاعری صفائے روح کا باعث اور نجات کا ذریعہ ہی۔ یہ قاری کے ذہن کا کام ہی کہ وہ شاعر کا مطلب پالے۔ لیکن پھر یہی کہا جاتا ہی کہ شاعری میں اردو شاعروں کے پیشِ نظر ایک فرضی معشوق ہوتا ہی جس کا بجز ان کے تخیل کے اور کہیں وجود نہیں اور تعریف و توصیف سے ان کا واحد مقصد یہ ہوتا ہی کہ اپنے زورِ طبیعت اور زورِ قلم کی نمایش کریں۔

"قصہ مختصر، ہمارے نزدیک یہ تجویز کسی طرح مناسب نہیں بلکہ علم و فضل کے نقطۂ نظر سے مہمل ہی کہ اردو شاعری کو انگریزی رنگ میں رنگا جائے اور ایک نیا اسلوبِ تحریر سوچا جائے۔ یہ چیز صرف اس وقت واقع ہو سکے گی جب انگریزی تعلیم ہمارے خیالات اور ہماری زبان، ہمارے آداب اور ہماری طرزِ معاشرت پر جو ہمارے خیالات کا منبع ہیں ایسا اثر ڈالے کہ ہماری زبان بالکل بدل جائے۔"

ہندستان کے تمام مضمون نگار اس شدت سے مولوی محمد حسین کے مخالف نہیں اور میجر ہال رایڈ نے مشاعروں کے ذریعے اصلاح کی جو تجاویز پیش کی ہیں اُن سے انھیں کسی طرح اختلاف نہیں۔ اس

بحث پر امرت سر کے ایک مسلمان کے خیالات ملاحظہ ہوں[1]:-

"ہندستان میں مثل مشہور ہی کہ زوال کے زمانے میں تعلیم اور شاعری کی ترقی کی کوشش کی جاتی ہی اور واقعہ بھی یہی ہی۔ جب تعلیم اور فنونِ لطیفہ میں انحطاط ہوتا ہی تو لوگ فطرت کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ باہمی تنازعات اور خانہ جنگیوں، خاص دشمنیوں اور عوام کے تعصب کے زمانے میں انسان ہر شے سے زیادہ مقاصدِ تخلیق کو جاننے کی کوشش کرتا ہی۔ یہی چیز زمانۂ جاہلیت کی عربی شاعری کی تاریخ اور ایران، مصر، یونان اور دنیا کے دوسرے ممالک کی تاریخ میں پائی جاتی ہی۔ ان کی نظم و نثر میں اس قدر قوت و طاقت ہی کہ ابھی تک باوجودے کہ علم و تعلیم کی اتنی صدیاں گزر چکی ہیں، کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں کہ اقبال کے زمانے میں خیالات میں کم زوری پائی جاتی ہی یا قابل افراد کا فقدان رہتا ہی۔ میرا مقصد محض یہ ہی کہ تہذیب کی ترقی کے زمانوں میں معاشرتی کاروبار اس قدر بڑھ جاتا ہی کہ کسی شخص کے لیے یہ مشکل ہوتا ہی کہ وہ اپنے کو اس سے الگ کرکے اپنا قیمتی وقت سخن گوئی میں صرف کرے۔ آج ہمارا فرض یہ ہی کہ ہم اپنی شاعری سے اپنے قومی تعصبات اور خیال آرائی کو، جو غیر قدرتی محبت کو فروغ دیتی ہی، خارج کریں اور ہمارا فرض ہی کہ اپنی شاعری کا خاص مقصد یہ قرار دیں کہ وہ ترقی اور عروج کی صداؤں پر لبیک کہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندستانیوں میں ہم دردی اور خلوص کی بنیاد پر یک جہتی

---

[1] پنجابی مورخہ ۹ مئی ۱۸۷۴ء

پیدا ہو گی۔ فصاحت و بلاغت اور سب سے بڑھ کر شاعری کی جادو کی سی تاثیر میں کچھ ایسی بات ہو جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہو کہ مشرقیوں نے اپنے آپ کو فطرت سے بہت ہی دُور کر لیا ہو۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ان میں ایسے شاعر موجود نہیں جنھوں نے مناظرِ قدرت کی نقاشی کی ہو۔ ان کی تعداد بہت کم ہو یہ سچ ہو۔ لیکن انھوں نے ایسے ایسے نقوش کھینچے ہیں جو ان کے مغربی بھائیوں کے کارناموں سے کم نہیں۔ وہ تعریف کے اور بھی زیادہ مستحق اس وجہ سے ہیں کہ مشرق میں آزادیِ خیال پر ہزاروں الزامات لگائے جاتے ہیں اور انھوں نے ان تمام مشکلات کا اپنے کردار اور عالی ہمتی سے مقابلہ کیا۔

"شاعری ہمیشہ زمانے کے مطابق ہوتی ہو۔ اگر زمانہ ہی پست خیال ہو تو شاعروں کے تخیل میں رفعت کیوں کر ڈھونڈی جا سکتی ہو۔ دوسری سرزمینوں کی تاریخ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ واضح ہو کہ ہم اپنے پیش رووں کی پوری پیروی نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کے پاس وہ مشعلیں نہیں تھیں جو اب ہمارے پاس ہیں۔ ہمارا فرض ہو کہ ہم تہذیب کے اعلا مدارج کے فیوض سے فائدہ اٹھائیں اور زمانۂ جدید جو سہولتیں بہم پہنچا رہا ہو انھیں کام میں لا کے اس طرح عمل کریں کہ آیندہ نسلیں ہماری اس طرح مشکور ہوں جیسے ہم گزرے ہوئے زمانوں کے مشکور ہیں اس لیے ہم مسرت کے ساتھ لاہور کے مشاعرۂ تہذیب کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس طرح کے مشاعرے پابندی سے منعقد ہوتے رہیں گے۔"

پنجابی[1] میں یہ پڑھنے میں آتا ہو کہ ہم قوم اپنے جذبات و احساسات

---

[1] ۹ مئی ۱۸۷۴ء

کا شاعری کے ذریعے اظہار کرتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو شاعری شاذ و نادر ہی عوام الناس کے خیالات کا مظہر ہوتی ہے، نہ دیہاتیوں کے خیالات کی، نہ شہریوں کی، نہ جاہلوں کی اور نہ عالموں کی، شاعر کے خاص خاص خیالات کو وہ ادا کرتی ہے لیکن قوم کے خیالات کا اظہار نہیں کر پاتی۔ شعرائے اُردو ان چیزوں کا بالکل ذکر نہیں کرتے جن سے یہاں کے باشندوں کو محبّت ہے۔ وہ ان چیزوں کی تعریف یا مذمت کرتے ہیں جنھیں ہندستانی جانتے تک نہیں۔ اس قسم کی تحریروں کی اصلاح ضروری ہے۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے بحث مباحثے کی ضرورت نہیں صرف مولوی محمد حسین کی تقریر پڑھنا کافی ہے[1]

"سب سے پہلے غزل کی اصلاح ضروری ہے جس کا مضمون ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اور یہ خامی صرف اُردو میں جاگزیں نہیں بلکہ مشرق کی تمام اسلامی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ ہمیں یہ یقین ہے کہ یہ مشاعرہ جس کی ناظم صاحب تعلیمات نے بنیاد ڈالی ہے ہماری شاعری کی ترقی کی طرف رہ نمائی کرے گا اور اس طرح شاعروں کو سخن وری کا ایک اور بڑا میدان مل جائے گا اور وہ نئے نئے تشبیہات اور استعارات استعمال کر سکیں گے۔"

"انتظامِ نظمِ اُردو" کے عنوان سے پنجابی[2] کے ایک اور شمارے میں اسی بحث کے متعلق ایک اور مضمون میری نظر سے گزرا جس

---

[1] یہ تقریر اوپر نقل کی جاچکی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

[2] بابت ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء

کے کچھ ٹکڑے ملاحظہ ہوں:۔

"تاریخ اور قصص کی کتابیں نظم و نثر کی تمام تصانیف جو ہمارے نصابوں میں مقرر کی گئی ہیں وہ ہمیشہ عشقیہ مضامین پر مشتمل ہوتی ہیں۔ صرف مذہبی کتابیں اس سے مستثنا ہیں۔ ہم سررشتۂ تعلیم کے مشکور ہیں کہ اس کے ذریعے اب ہمیں بہت سی ایسی کتابیں حاصل ہوگئی ہیں جو ہمارے تمدن اور ہمارے حالاتِ حاضرہ کے لیے فائدہ مند ہیں لیکن افسوس کہ اب تک شاعری کا کوئی مجموعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا جس میں یہ خوبیاں جن کی خواہش ہے، موجود ہوں۔ ہمیں توقع ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ایسا کلام بھی حاصل ہو جاتے جو ہمارے موجودہ حالات اور اس ترقی کے موافق ہوگا جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔

"اُردو شاعری ایسا سامانِ تجارت ہو کے رہ گئی ہے جس کا کوئی خریدار نہیں یہی وجہ ہے کہ ایسے مشاعروں میں جن کا مقصد مسرت و تفریح ہوتی ہے یا ایسی مجالس میں جن کا مقصد ماتم و عزا، ہوتا ہے شاعر خوشی یا رنج کی محض نمایش کرتا ہے...... اس لیے ہماری امید بھری نظر ان لوگوں کی طرف ہے جنھوں نے اُردو شاعری کی اصلاح و ترقی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ لیکن اب تک اس موضوع پر کسی مجلس یا کسی اخبار میں باقاعدہ طور پر کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ صرف اُردو شاعری ہی کو اصلاح کی ضرورت نہیں۔ اس طویل اور پُرجوش تقریر میں جو محمد حسین۔ انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں کی تھی، یہی نقص موجود ہے۔

وہ اس شاعری کی جو موجود ہے تعریف کرتے ہیں کہ کبھی، کہ برج بھاشا کی تشبیہات و استعارات استعمال کیے

عربی اور فارسی کے صنائع ترک کر دیے جائیں۔ کبھی وہ انگریزی خیالات کے رواج پر زور دیتے ہیں کیوں کہ اُردو عربی، فارسی الفاظ اور برج بھاشا الفاظ کے ملاپ سے بنی ہی اور ہندو مسلم خیالات کا مجموعہ ہی، اس لیے ان کی رائے میں اب یہ ضروری ہی کہ انگریزی خیالات اور الفاظ بھی استعمال کیے جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عشقیہ مضامین کو ترک کر دیا جائے اور بہار و خزاں کا بالکل ذکر نہ کیا جائے۔ بالآخر وہ شاعری کرنے کے لیے ایک نمونہ بھی پیش فرماتے ہیں اور آخر میں وہ خود بہار و خزاں کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنے قلبِ محزوں کی آہ و بکا کا نقشہ کھینچتے ہیں اور لیلیٰ مجنوں کا قصہ دُہراتے ہیں"۔

اس کے بعد مضمون نگار نے تفصیلات کو جانچا ہی اور خصوصیت سے محمد حسین کی بہت سی نظموں پر تنقید کی ہی۔

چند توجیہات کے بعد وہ کہتا ہی: "یہ امر یقینی ہی کہ اگر ہم اپنی شاعری کے موضوعات نہ بدلیں تو ہماری بحث کی سرسبزی باقی نہیں رہ سکتی۔ ہم فراق اور وصال کے خاص مضامین ادا کرنے کے لیے نئی تشبیہات اور تازہ استعارات کہاں سے تلاش کریں گے۔ نظم و نثر کے لیے بالکل مختلف قسم اور نوع کے مضامین تلاش کرنے پڑیں گے۔ ضرورت اس کی ہوگی کہ ہم بالکل جداگانہ زمین میں فصاحت و بلاغت کے بیج بوئیں۔

"یہ دریافت کرنا ہی کہ ہم موجودہ طرزِ تحریر کی خرابی کو کیوں کر دفع کر سکتے ہیں۔ اس کا ذریعہ وہی ہی جس کا اظہار کیا جا چکا ہی یعنی

انعامات واعزاز۔ رہ گئیں ممانعتیں وہ اس طرح کی ہونی چاہییں کہ شعرا بلا تکلیف و تامل انھیں قبول کر سکیں۔ ہماری سرزمین میں شاعری کا راستہ اس وجہ سے بالکل مسدود ہو گیا ہو کہ شاعری میں ہماری رسومات اور مذہبی باتوں کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ اس پورے رجحان کا بدلنا آسان نہیں۔ اگر مخربِ اخلاق مضامین ترک کر دیے جائیں تو یہی بہت کافی ہو۔ ایک دن ایسا آتے گا کہ اُردو شاعری کی تمام خرابیاں رفع ہو جائیں گی اور وہ بہت زیادہ دل کش ہو جائے گی۔"

علی گڑھ اخبار[1] کے ایک مضمون نگار کا خیال ہو کہ وہ وقت قریب ہو جب اُردو شاعری کی تکلیف دہ یکسانی اس ہمہ گوں طرزِ تحریر سے بدل جائے گی جس کی خواہش کی جاتی ہو اور جس طرح سنسکرت، عربی اور سب سے بڑھ کر انگریزی شاعری میں سب مضامین شاعری میں باندھے جاتے ہیں اُردو میں بھی یہی عمل ہو گا۔ یہ اس طرح ہو گا کہ لوگوں کو اس زبان کی دل کشی کا ثبوت حاصل ہو جائے گا۔ یہ مضمون نگار مولوی محمد حسین آزاد کی اس رائے سے متفق ہو کہ اُردو شاعری میں نئی زندگی کی تحریک کی روح پھونک دینی چاہیے۔ مضمون نگار کا خیال ہو کہ ان کے (مولوی محمد حسین کے) خیالات ان لوگوں کے دلوں پر بھی اثر کر چکے ہیں جو ان کی تجاویزِ اصلاح پر ہنستے تھے اور جن کو انھوں نے ایک مثنوی میں عمل کا جامہ پہنایا ہو۔ اس مضمون نگار نے لکھا ہو کہ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مولوی صاحب مضامینِ تخیل کو متروک

---

[1] بابت ۹ اکتوبر ۱۸۷۴ء

قرار دینا چاہتے ہیں یا حُسن کے متعلق نازک خیالیوں کو پسند نہیں کرتے یا اُردو شاعری کے استعارات و تشبیہات کو ناقص سمجھتے ہیں۔ ان کی خواہش صرف یہ ہے کہ قدرتی جذبات اور فطری مناظر کی طرف توجہ کی جائے۔ مضمون نگار کہتا ہے: "فصاحت و بلاغت میں امتیاز ضروری ہے۔"

اب انجمنِ پنجاب کے دوسرے مشاعرے کی کچھ تفصیلات سُنیے۔ یہ پہلے مشاعرے کے اصول پر منعقد کیا گیا تھا جو مولوی محمد حسین کی تقریر کی وجہ سے ممتاز تھا۔

طے شدہ تجویز کے مطابق ایک خاص مشاعرہ پہلے مشاعرے کے ایک ماہ بعد، ۳۰ مئی کو منعقد ہوا[1] یہ مشاعرہ گزشتہ مشاعرے سے زیادہ بارونق تھا۔ بہت سی ممتاز شخصیتوں، ممتاز عہدہ دارانِ عدالت اور معزز رؤسا نے اس میں مدد دی ہے۔ عہدہ داران و ملازمینِ سرکار، کالجوں اور مدارس کے اساتذہ اور طلبا، پنجاب یونی ورسٹی کے ممبر اور علم دوست حضرات نے شرکت کی۔

جب سب لوگ جمع ہو چکے تو لاہور کالج کے پروفیسر مولوی الطاف حسین المتخلص بہ حالی نے اپنی نظم پڑھی جس کا عنوان "برکھارت"[2] تھا۔ اس کے بعد مولوی الطاف علی نے، جو گورمنٹ گزٹ کے اُردو مترجم ہیں، اسی موضوع پر ایک نظم "آبِ کرم"[3] پڑھی۔ اگرچہ ان دونوں نظموں کا

---

[1] یہ میں اخبار انجمنِ پنجاب مورخہ ۵ جون ۱۸۷۴ء سے نقل کر رہا ہوں۔

[2] اس مضمون پر ہندستان کے موجودہ شاعر جس طرح طبع آزمائی کرتے ہیں، اگر کوئی ان کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے تو جرأت کی وہ نظم دیکھیے جسے میں نے "تاریخ ادبِ ہندی و ہندستانی" جلد دوم صفحہ ۱۱۴ پر نقل کیا ہے۔ [3] اس نظم میں بارش سے مراد عنایتِ ربانی ہے۔

موضوع موسم برسات تھا۔ لیکن دونوں شاعروں کے خیالات مختلف تھے مصرع مشہور ہی: "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"؛ دونوں شعرا کے کلام میں الگ الگ قسم کی دل پذیر خصوصیت اور حسن کا بانک پن تھا۔

اس کے علاوہ پانچ اور شعرا کی پانچ نظمیں پڑھنے کے لائق ہیں۔ یہ مجلسِ مشاعرہ اس قدر مفید ثابت ہوئی ہو کہ اس کی قوی امید ہو کہ آیندہ مشاعرے اور زیادہ کام یاب ہوں گے اور گورمنٹ پنجاب کے مسٹر ہال رایڈ کا ایک نیک مقصد جو ان کے قیام سے وابستہ تھا، میری رائے میں پوری طرح حاصل ہو کے رہے گا کہ اردو شاعری خیالاتِ فاسد اور بیہودہ مضامین سے پاک ہو جائے گی اور ان کی بجائے دنیا کی چیزوں کی تفصیلی تصویریں پیش کی جائیں گی۔

جب شعرا اپنی نظمیں سنا چکے تو ناظم صاحب تعلیمات نے اطلاع دی کہ مشہور ہندستانی ادیبوں کی ایک کمیٹی قائم کی جائے گی کہ کون سی نظمیں انعام کی مستحق ہیں۔ اس کے بعد یہ طے کیا گیا کہ آیندہ مشاعرے کا مضمون 'سرما' یا 'زمستان' ہوگا۔

پنجابی[۱] نے اس تیسرے جلسے کے انداز کا ذکر یوں کیا ہو "مختلف فرقے کے لوگ اپنے آپ کو یوں یک جا دیکھ کر متحیر ہوتے۔ مجمع کو دیکھ کر دلّی کے اردوے معلّا کے بازار کا دھوکا ہوتا تھا۔ دس یا بارہ شعرا ایسے بھی تھے جن کو پہلی بار اپنا کلام سنانے کا موقع ملا تھا۔ ان کے اشعار کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہو کہ دلّی اور پنجاب کے شعرا ناظم صاحب تعلیمات کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں اور یہ توقع

---

[۱] مورخہ ۴ جولائی ۱۸۷۴ء

کی جا سکتی ہو کہ اس قسم کی دو تین مجلسوں کے بعد وہ شراب و ساقی کا ذکر ترک کر دیں گے اور مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچیں گے۔ ہم اپنے اعلا خیال شعرا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے طرزِ تحریر کو نہ بدلیں اور حسبِ سابق ہمارے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلیں۔ جدت پسندوں کی زیادہ قدر نہیں ہوتی۔ کیوں کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس قسم کی نظموں کو پسند کر سکتے ہیں ...."

اس کے بعد مضمون نگار نے چند نظموں کا، جو پڑھی گئی تھیں سلسلےوار ذکر کیا ہو۔ ان پر عام طور پر تنقید کی ہے۔ اس سلسلے میں محمد حسین آزاد کا ذکر کرتے ہوئے جس کی تقریر پر ہندستان بھر کے اخبارات میں سخت تنقید ہوتی لکھا ہو کہ " اپنے نام کی مناسبت سے انھوں نے شاعروں کو ہر طرح سے آزادی دے دی ہو۔ انھوں نے دنیا بھر کے شاعرانہ مبالغوں اور ترکیبوں کو یک جا کر دیا ہو۔ ان کی نظم کا تین چوتھائی حصہ تو ان کے اساتذہ کا ترجمہ ہو جو ایک جگہ ڈھیر کر دیا گیا ہو۔ انھوں نے ان چیزوں کا ذکر کیا ہو جنھیں کسی نے نہ کبھی دیکھا اور نہ بیان کرنے کا قصد کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہو کہ انھوں نے ایک ایسے خواب کی تصویر کھینچی ہو جس کی تعبیر ممکن نہیں۔ مثلاً کیا کبھی ہمارے ملک میں ایسی سردی ہوئی کہ دریاؤں کا پانی یخ بن گیا اور بلا کشتی کے لوگ دریاؤں کے پار جانے لگے؟ ہم تو اپنی سرزمین کے مناظر کی تصویر دیکھنا چاہتے تھے اور آزاد نے ان گاڑیوں کا ذکر کیا ہو جنھیں سرد ممالک کے بارہ سنگھے کھینچتے ہیں اور ان ممالک کا نقشہ کھینچا ہو جو ہمیشہ برف سے ڈھکے رہتے

ہیں اور طرفہ ماجرا یہ ہو کہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہو کہ سرما کی شدت سے شیطان کی سلطنت کا اندازہ ہوتا ہو۔"

حالی کی نظم 'برکھارت'، کا ذکر پہلے آچکا ہو۔ اخبار پنجابی سالِ رواں کی ۴ جولائی کی اشاعت میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہو: "جس نے یہ نظم نہ پڑھی ہو وہ پڑھ کر دیکھے کہ شاعر نے کس خوبی سے یہ تصویر بنائی ہو۔ جنھوں نے شاعر کی زبان سے اسے سنا وہ مرحبا کہہ اُٹھے اور کوئی صاحبِ ذوق اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وطن کی خصوصیتوں کو ایسی عمدگی سے بیان کیا ہو کہ اور کسی مثنوی میں اس کی نظیر نہ ملے گی۔ بڑی بات یہ ہو کہ شاعر نے کوئی بے موسم کی راگنی نہیں چھیڑی اور نہ حُسن و عشق کے چرچے کیے پھر بھی اس کی سادگی و رنگینی جادو کا کام کر گئی۔"

اخبار سررشتۂ تعلیمِ اودھ (یکم اگست ۱۸۷۴ء) نے ساری نظم نقل کر کے اس کی خوب تعریف کی ہو۔ حالی کی ایک دوسری نظم 'نشاطِ امید' اور ذوقؔ کاکوروی کی 'موسمِ بارش'، کو ستمبر کے پرچے میں چھاپا ہو۔

مشاعرے کی چوتھی مجلس ۴ اگست کو منعقد ہوئی۔ حضرات شعرا کی تعداد اب کے اور بھی زیادہ تھی۔ کئی تو دُور دُور سے آتے تھے اور جو نہ آسکے انھوں نے اپنا کلام بھیج دیا تھا۔ اتنا وقت کہاں تھا کہ ان سب کو دادِ سخن ملتی اور پھر کئی تو اسی پُرانی لکیر پیٹ رہے تھے جس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا گیا ہو۔ ان پامال مضا

کو سننے کی تاب کسی میں نہ تھی۔ پنجابی (۲۸ اگست) نے ان شاعروں کی فہرست چھاپی ہے اور فرداً فرداً ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ ان میں سے بہت سوں کی رَوِش نئی ہے اور کچھ ضمنی امور کو چھوڑ کر عموماً ان کی تعریف کی ہے۔ ان میں اخبار کو دہلی کے رئیس میرزا اشرف بیگ کی مثنوی 'نوبہارِ امید'، سب سے زیادہ پسند آئی۔ اس میں ۲۸۰ بیت ہیں۔ اخبار کے ایڈیٹر نے لکھا: "یہ ساری مثنوی اتنی مرصّع ہے کہ جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ طرزِ بیان میں صفائی اور جوش کا کمال نظر آتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سادگی کا یہ حال ہے کہ خاص و عام سب اس سے یکساں لُطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ہر نکتہ ایسی اُستادی سے بیان کیا ہے کہ کسی بد ذوق کو بھی اسے سمجھنے میں دیر نہ لگے گی۔ بلند سے بلند خیال کو سادہ سے سادہ پیرائے میں ادا کیا ہے۔ اگر ایک طرف تصوّر و تخیّل میں خوب صورتی ہے تو دوسری طرف تشبیہ و استعارے میں توازُن ہے۔"

مشاعرے کے آخر میں صاحبِ صدر نے اعلان کیا کہ اگلی مجلس میں 'حب الوطن'، پر نظمیں پڑھی جائیں گی۔

یہ مجلس ۴ ستمبر کو لاہور میں ہوئی۔ اس مرتبہ بھی بہت سے شاعر آئے اور جو نہ آسکے ان کا کلام آیا۔ 'پنجابی' کے نقّاد نے ۴ اکتوبر کے پرچے میں اس مشاعرے کا تذکرہ کیا ہے۔ جو خود نہ آسکے تھے ان میں سے دو کی اس نے خوب خبر لی ہے لیکن مولوی محمد شریف (ایڈیٹر طلسمِ حیرت مدراس) کی نظم کی جی کھول کر داد دی ہے۔ لکھا ہے کہ زبان و بیان کے حسن کا جہاں تک تعلق ہے وہ دہلی و لکھنؤ کے اُستادوں

کی صف میں بیٹھ سکتے ہیں۔

ان کے بعد نقاد تین شاعروں کی بات بھی نہیں پوچھتا۔ البتہ جب حالیؔ کی نظم 'حب الوطن' کا نام آتا ہے تو وہ بتلاتا ہے کہ لوگوں نے ہمہ تن گوش اسے سنا اور یہ بھول گئے کہ رات بیت چکی ہے۔ سب پر اس کا اثر ہوا۔

جنھوں نے اپنا کلام پڑھ کر سنایا ان میں مولوی محمد حسین آزادؔ کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ اخبار نویس کا بیان ہے کہ ان کے پڑھنے کا انداز جاذبِ توجہ تھا لیکن نفسِ مضمون کو دیکھ کر اصلاح پسندوں کو ناامیدی ہوئی۔ وہی گُل و بلبل کے چونچلے، وہی مَے و مینا کے چرچے۔ جنھیں شاعر سے بڑی بڑی توقعات تھیں، وہ سخت مایوس ہوئے۔ اس نظم کا عنوان 'صبح امید' ہے اور یہ حقیقت ہے کہ تنقید کی آنچ پر وہ کھری نہیں اُترتی۔ اُستاد ذوقؔ کے شاگردوں میں آزادؔ کو امتیاز حاصل ہے۔ اس کے باوجود وہ اس مرتبے کا مستحق نہیں جو جدید شاعری کے حامیوں نے اسے عطا کیا ہے۔

انجمن کے اگلے مشاعرے کا موضوعِ سخن 'انصاف' قرار پایا۔ یہ مجلس ۱۴ نومبر کو ہوئی۔ میجر ہول رایڈ اور متعدد ہندستانی اہلِ قلم اس میں شریک تھے۔ شاعروں میں میرزا محمد اکبر خاں خاؔور بھی تھے جنھیں سلطان الشعرا کا خطاب ملا ہے۔ 'پنجابی' (دسمبر) کی رائے ہے کہ نظموں کا معیار عموماً سطحی تھا اور آزادؔ کا کلام تو پہلے سے بھی زیادہ گر گیا۔ البتہ حالیؔ کی نظم حسبِ دستور حاصلِ مشاعرہ تھی اور سچ تو یہ ہے کہ انھی کے دم سے ان مجلسوں کی رونق ہے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نئے قسم کے مشاعرے صرف لاہور کے لیے مخصوص ہیں۔ لکھنؤ میں بھی اسی غرض سے ایک انجمن بنی ہی جس کے نگراں مظفر علی اسیر ہیں۔ اودھ اخبار کے حوالے سے 'پنجابی' لکھتا ہی کہ ۱۲ ستمبر کو اس کی طرف سے ایک مشاعرہ ہوا جس میں کئی مشہور شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی۔ کئی انگریز بھی تھے جن میں ناظم سررشتۂ تعلیم کا نام قابلِ ذکر ہی۔

اس مشاعرے میں غزلیں پڑھی گئیں لیکن وہ سب نئے انداز کی تھیں اور مختلف مضامین کی حامل تھیں۔ انھیں سن کر سامعین دنگ رہ گئے۔ یہ جدت ان میں سے بہتوں کی سمجھ میں نہ آئی لیکن زبان اور محاورے کی خوبیوں نے انھیں بھی پرچا لیا۔ تنگیِ وقت کی وجہ سے کئی شاعروں کو اپنی بیاضیں کھولنے کا بھی موقع نہ ملا۔ مگر ان سب کا کلام ان کے مختصر حالات کے ساتھ ایک 'گلدستہ' کی شکل میں شایع کیا جائے گا۔ ان کی دوسری غزلیں بھی اس میں شامل کی جائیں گی۔ یوں سمجھیے کہ یہ گلدستہ ہم عصر شعرا کا چھوٹا سا 'تذکرہ' ہوگا۔

یہ بیان طول کھینچ رہا ہی لیکن میں اسے اس مضمون کا اقتباس دیے بغیر ختم نہیں کر سکتا جو "کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے" کے عنوان سے ۱۰ اکتوبر کے 'پنجابی' میں چھپا ہی۔ مضمون نگار شکوہ سنج ہی کہ شاعروں کو وہ انعام دیر سے ملتے ہیں جن کا وعدہ نئے قسم کے مشاعرے کے انعقاد کے وقت ہوا تھا۔ یہ طے پایا تھا کہ ایک کمیٹی ان نظموں کو جانچے اور ان میں سے بہترین کا انتخاب کرے لیکن

اب تک اس کمیٹی کے تقرر کی نوبت نہ آئی۔ امید ہو کہ کمیٹی میں صرف ایسے لوگ ہوں گے جو صاحبِ زبان اور صاحبِ ذوق ہونے کے ساتھ نئی شاعری کے حامی اور غیر جانب دار بھی ہوں مضمون نگار کی ایک شکایت یہ بھی ہو کہ پنجاب کا سررشتۂ تعلیم مطبوعات کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا اور دو چار کو چھوڑکر باقی مصنفین کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ مشکل سے ان کی کتابوں کے دس بیس نسخے خریدے جاتے ہیں اور ان بے چاروں کو کتاب کی لاگت بھی وصول نہیں ہوتی۔ اس غیر مطمئن مصنف کا خیال ہو کہ صوبۂ اودھ کا محکمۂ تعلیم اتنا سرد مہر نہیں۔ دونوں صوبوں میں وہ زمین و آسمان کا فرق پاتا ہو۔ اودھ میں تقریباً ۲۲ کتابوں پر انعام مل چکا ہو اور ان کے دو دو یا تین تین سو نسخے خریدے جا چکے ہیں۔ اس کی وجہ سے اودھ میں ضرورت ہوتے ہی اچھے سے اچھے مصنف اور مترجم مل جاتے ہیں۔ مضمون نگار اس صورتِ حال کے لیے پنجاب کے ناظمِ تعلیم کو ذمّے دار قرار نہیں دیتا کیوں کہ ان کی نکتہ رسی عدیم المثال ہو۔ لیکن ان کے ماتحت یہ ساری گڑبڑ چلاتے ہیں۔ وہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ کتب بینی کا شوق کسی کو نہیں اور حکومت جو کتابیں خریدتی ہو وہ دیمک کی نذر ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ کتابیں طلبا میں کیوں نہیں بانٹ دی جاتیں، ان کے لیے تو یہ نہایت مفید ہوں گی۔ عہدِ گزشتہ میں ہندو راجا یا مسلمان بادشاہ کتابوں کا بڑا احترام کرتے تھے اور یہی وجہ ہو کہ صدیوں کے بعد بھی وہ باقی ہیں اور یورپ کے عالم بھی انھیں شوق

سے پڑھتے ہیں۔ اگر مشاعرے کی کمیٹی نے بھی وہی رویّہ اختیار کیا جو سرشتۂ تعلیم کے کارکنوں کا ہے تو شاعروں کی ہمّت افزائی ہوچکی اور انھیں انعام واکرام کی توقعات سے ہاتھ دھولینا چاہیے"۔ اس کے بعد یہ بگڑے دل مضمون نگار رائے دیتا ہے کہ کمیٹی میں کم سے کم چار آدمی ایسے ہوں جن کی سخن شناسی مسلّم ہو۔ ان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ کسی نظم کے متعلق فیصلہ صادر کرنے سے پہلے ان کے بارے میں ہندستانی کے خاص خاص اخباروں (مثلاً کوہ نور، میور گزٹ، اودھ اخبار وغیرہ) کی رائے معلوم کرلیں۔

یہی جریدہ (پنجابی) اپنے ۷؍اکتوبر کے نمبر میں اُن تالیفوں اور ترجموں پر تنقید کرتا ہے جو سرکاری دفاتر میں تیار ہوتی ہیں۔ اس کی رائے ہے کہ بے جا سرپرستی کے الزام سے بچنے کے لیے عام مقابلے کے بعد ان کا انتخاب ہونا چاہیے۔ انتخاب کا کام ایک کمیٹی کے سپرد ہو جس کے ارکان مستند عالم ہوں، جنھیں ان کی محنت کا مناسب معاوضہ دیا جائے۔

ایک دوسری اصلاح طلب بات یہ بھی ہے کہ یورپین تلفظ کو اُردو رسم الخط میں صحیح طریقے سے ادا کرنے کے لیے ضروری علامتیں مقرر کی جائیں۔ رسم الخط کی ضروریات کو مدِّنظر رکھنا ہوگا لیکن اس میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔ اس غرض سے سیّد احمد خاں نے 'علاماتِ قرأت' کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا ہے[۵] ان کی تجویز نہایت

---

[۵] یہ مقالہ 'تہذیب اخلاق' میں شایع ہوا تھا۔ بعد میں علی گڑھ اخبار (۱۶ اکتوبر ۱۸۷۲ء) میں نقل ہوا۔

آسان اور مناسب ہے۔

سرکاری ملازموں کو انگریزی لکھنے کا ایسا شوق ہے کہ دفتر کا سارا کام اسی زبان میں کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ رومن خط میں اپنا نام لکھتے ہیں تو اسے کوئی پڑھ نہیں سکتا۔ چناں چہ حکومتِ بنگال نے حکم دیا ہے کہ اہلِ ملک انگریزی کے ساتھ اپنی زبان کے رسم الخط میں بھی نام لکھا کریں۔[۱]

ہندستانی غالباً سب سے زیادہ متموّل زبان ہے کیوں کہ وہ عربی فارسی اور سنسکرت سے براہِ راست الفاظ مستعار لے سکتی ہے۔ اور کسی زبان میں اتنے ہم معنی الفاظ نہ ہوں گے۔ علاوہ برایں دوسری زبانوں کی طرح اس میں مِلے جُلے الفاظ کی بھی بہتات ہے جن کے مطالب میں نازک سا فرق ہوتا ہے۔ ان کی لغت تیّار کرنے کا بیڑا W mes W. Farrell نے اٹھایا ہے یعنی وہ وہی کام کرنا چاہتے ہیں جو Beauzee اور Girard نے فرانسیسی اور آرک بشپ Whatley نے انگریزی میں انجام دیا۔ انھوں نے ایسے الفاظ کی فہرست تیّار کی جن کا استعمال عام ہے اور جن کے ہم معنی الفاظ کئی کئی ہیں اور پھر ان کے فرق کو نہایت احتیاط سے سمجھایا ہے۔ ناظر کی آسانی کے لیے حروفِ تہجّی کے لحاظ سے ایک اشاریہ بھی مرتب کر دیا ہے۔ یہ نقص ضرور رہ گیا کہ الفاظ کو اُردو رسم الخط میں بھی نہیں چھاپا گیا۔ جب کتاب کلکتہ میں شایع ہو رہی تھی تو اس میں دقّت ہی کیا تھی۔

---

[۱] علی گڑھ اخبار ۶ مارچ ۱۸۷۲ء

میرٹھ کے 'اخبارِ عالم' میں مجھے دو ایسے ہم معنی الفاظ ملے جو مسٹر فیلن کی لغت میں شامل نہیں۔ میری مراد 'صاحب' سے ہے جو نام کے بعد بہ طورِ اظہارِ احترام کے لکھا جاتا ہے اور مارواڑی میں انھی معنوں میں 'جی' کہتے ہیں جس کا لغوی مطلب تو 'جان' ہے لیکن استعارتاً لقب کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ پہلا لفظ عربی سے آیا ہے اور مسلمانوں میں مستعمل ہے اور دوسرے کا چلن ہندوؤں میں ہے۔

(۲)

یورپ کے علمی و ادبی شاہ کاروں کو ہندستانی زبانوں میں منتقل کرنے کی ضرورت اس ملک میں زیادہ شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں 'پنجابی' (بابت ۲۷ دسمبر ۷۳ء) لکھتا ہے: "علوم و فنون کو سب سے پہلے یونان میں ترقی ملی اور اس کے بعد عربوں نے انھیں سنوارا۔ اہلِ یورپ کا نمبر ان کے بعد آتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عہدِ قدیم کی معلومات اور ایجادات کو عرب اپنی زبان میں لائے لیکن انھوں نے غائر نظری سے کام لیا۔ کہیں کوئی بات گھٹانے بڑھانے کی ہوتی تو گھٹا بڑھا دی۔ اس طرح انھوں نے کئی ایسی چیزیں دریافت کیں جن کا یونانیوں کو علم نہ تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان کے زمانے میں یونان کا ستارہ غروب ہو چکا تھا۔ اب اہلِ یورپ نے عربوں سے استفادہ شروع کیا اور ان کی غلطیوں کو اسی طرح سدھارا جس طرح یونانیوں کی خامیوں کو۔

نئی نئی باتیں دریافت کیں اور اب تک ان کی جستجو جاری ہے۔ پہلی نظر میں محسوس ہوتا ہے کہ علوم و فنون کے اصول ایک ہیں خواہ یونان ہو یا عرب یا یورپ، لیکن غور سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر روز ہم ترقی کے جن زینوں پر چڑھ رہے ہیں، وہ دونوں پرانے نظاموں اور اس نئے نظام کے اصولوں کے مابین ایک حدِّ فاصل قائم کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج انگلستان کبھی یونان و عرب کی پروا نہیں کرتا۔

عربوں کے عروج کا زمانہ مختصر تھا۔ اسی لیے سائنس کو پوری طرح نشو و نما نہ مل سکی۔ اس کے برعکس یورپ میں ہمیشہ سے سائنس کا چرچا عام رہا۔ یونانی و عربی سے آسان سے آسان زبان میں کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ انھیں اس طریقے سے پیش کیا گیا کہ ہر خاص و عام علم کی دولت سے بہرہ مند ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کی روشنی اس تیزی سے پھیلی کہ سارے یورپ میں اُجالا ہو گیا۔ اگر فرنگیوں نے ترجموں سے گریز کیا ہوتا تو سائنس اور آرٹ کی ایسی ترقی نہ ہوتی۔ کاش ہندستانی بھی اپنے عہدِ حکومت میں دوسروں کے علم و ہنر سے اسی طرح فائدہ اٹھاتے تو آج وہ اس میدان میں یورپینوں سے ہرگز پیچھے نہ ہوتے اور ان میں وہ خوبیاں آجاتیں جن سے آج وہ محروم ہیں۔ اگر کوئی پوچھے کہ سنسکرت کو لوگ کیوں بھول بیٹھے ہیں جو علم و ادب کے جواہرات سے بھرپور ہے تو ہم جواب دیں گے کہ سنسکرت کسی ملک کی زبان نہیں ہے۔ پنڈتوں کے سوا

کوئی اسے پڑھ لکھ نہیں سکتا اور اس کی کتابیں الماریوں میں بند رہتی ہیں۔ اس زبان کے بنانے والوں کا مقصد یہ تھا کہ برہمنوں کے سوا اور کوئی اسے پڑھ نہ سکے تاکہ پنڈتوں کی قدر اور اہمیت زیادہ ہو جائے اور وہ سارے ملک کو اپنے قابو میں رکھ سکیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ طبقہ جسے سربلند رکھنے کے لیے یہ تگ ودو کی گئی تھی، قعرِ تنزل میں گر گیا اور اب اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اگر ہندوؤں کو اس انجام کا علم ہوتا اور انھیں معلوم ہوتا کہ اس علمی اجارہ کا نتیجہ کیا ہوگا تو وہ اتنی بڑی برکت کو مٹھی بھر آدمیوں کی ملکیت نہ بننے دیتے۔ اگر ہر کس و ناکس کو پڑھنے لکھنے کی اجازت ہوتی تو سنسکرت اس کس مپرسی کی حالت میں نہ ہوتی[1] اور روزمرّہ کی زبان میں سائنس اور آرٹ کی کتابوں کے ترجمے ہو سکتے۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں عربی سے سائنس

(حاشیہ صفحہ ۴۴)

کہتے ہیں کہ سنسکرت کبھی ہندستان میں بول چال کی زبان نہ تھی۔ بہت عرصے سے ادب میں بھی اس کا استعمال نہیں ہوتا۔ (مؤلف)

[1] سچ تو یہ ہے کہ سنسکرت کا چلن ہندستان سے اُٹھ گیا تھا اور یورپ والوں نے اسے از سرِ نو زندہ کیا۔ جب ہندستانیوں نے دیکھا کہ ان کی مذہبی زبان کا مطالعہ باہر کے لوگ کر رہے ہیں اور اس کے مسودوں کو لے کر ریسرچ کر رہے ہیں تو انھیں ندامت ہوئی اور انھوں نے سنسکرت کا علم اپنے ملک میں از سرِ نو پھیلانے کی کوشش شروع کی۔

(مؤلف)

کی کتابیں ہندی میں منتقل ہوتیں اور اس ملک کے باشندوں کی حالت اتنی ابتر نہ ہوتی جیسی آج نظر آتی ہے۔

ہندستانیوں کا طرزِ تعلیم یورپ سے مختلف ہے۔ مثلاً جغرافیہ کی اہمیت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم اس کی طرف توجہ نہیں کرتے کیوں کہ نہ تو ہم تجارت کرتے ہیں۔ اور نہ سفر کرتے ہیں اور اس لیے اس شعبۂ علم کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔ تاریخ ایک ایسا علم ہے جو ہمیں اپنے اجداد کے عروج وزوال کے اسباب سمجھاتا ہے اور نیک وبد میں تمیز سکھاتا ہے لیکن اہلِ وطن نے اسے بھی طاقِ نسیاں کے سپرد کر دیا ہے اور یا اسے دل بہلانے کے لیے افسانوں کا کوئی مجموعہ تصوّر کرتے ہیں۔

ہم ترقی کی جس راہ پر چلنا چاہتے ہیں اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر شعبے کے لیے الگ الگ کمیٹیاں بنائی جائیں جو سائنس اور جملہ علوم کی کتابوں کے ترجمے کریں۔ علم دوست امرا اور ہندستان کے جملہ بہی خواہوں کو اس کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔ اس طرح پانچ سال کے اندر ہماری حالت کچھ سے کچھ ہو جاتے تو ہمارا ذمہ۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ حکومتِ وقت مترجموں اور مؤلفوں کی مناسب حوصلہ افزائی کرے۔"

مہاراجا کشمیر کو اس اخبار نویس کی رائے سے اتفاق ہو جنانچہ انھوں نے دو سال پہلے جموں میں انگریزی سے ہندی اور اُردو میں ترجمہ کرنے کے لیے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔

علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی ایک ایک کرکے آرٹ اور سائنس کی اُن ۲۳۰ کتابوں کو اُردو میں منتقل کرا رہی ہے جنھیں علمائے فرنگ

نے یہ کہہ کر منتخب کیا ہے کہ وہ اہلِ ہند کی ذہنی تربیت کے لیے موزوں ترین ہیں۔ سوسائٹی نے ابھی حال ہی میں مالکم کی 'تاریخِ ایران' کا ترجمہ اُردو میں شایع کیا ہے۔

مسٹر کولن براؤننگ نے ۱۸۷۲-۷۳ء میں صوبۂ اودھ کی تعلیمی حالت کے متعلق ایک رپوٹ چھاپی ہے۔ اس میں نئی مطبوعات کی جو فہرست ہے، اس میں دو ترجمے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو پنڈت شیو نارائن کا کیا ہوا 'جغرافیۂ اودھ' کا ہندی ترجمہ، 'تاریخِ فرشتہ' کا اُردو ترجمہ قریب قریب تیار ہو چکا ہے۔

منشی ذکاء اللہ نے جو میور کالج الٰہ آباد میں پروفیسر ہیں، تاریخِ ہندستان کے نام سے اُردو میں ایک کتاب تالیف کی ہے۔ اس کے شروع میں ملک کا جغرافیہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اسے الفنسٹن 'مل' مارش مین وغیرہ کی مستند تاریخوں کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔[۱]

ملکی اخباروں نے سب سے زیادہ جس کتاب کی تعریف کی ہے، اس کا نام افسانۂ حمید ہے۔ یہ سیّد غلام خسید زنجان گنگیم پوری کی تصنیف ہے۔ موصوف ہندستان کے ممتاز ادیبوں میں ہیں۔ بدنصیبی سے کتاب کی طباعت بہت بُری ہوئی ہے۔ اور علی گڑھ اخبار میں رجب علی سرور نے خواہش ظاہر کی ہے کہ اس کا ایک اچھا اڈیشن چھاپا جائے۔ انھوں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ کتاب حکومت کی طرف سے شایع کی جائے اور اس کے نسخے سارے ملک میں تقسیم کیے جائیں۔ جہاں تک کتاب کے مضمون کا تعلق ہے وہ اس کی خوبیوں کے قائل ہیں۔ حمید کی داستان آج سے آٹھ نو سو سال پہلے شروع ہوتی ہے اور

علی گڑھ اخبار ۲۰ مارچ ۱۸۷۴ء اور اخبار انجمن پنجاب ۱۷ اپریل ۱۸۷۴ء

مصنف نے اس زمانے کے حالات نہایت دل چسپ پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ اس میں مبالغہ یا تخیل سے کام نہیں لیا گیا۔ اندازِ تحریر پُرجوش اور مُقفّا ہے۔ اشعار کے انتخاب میں بھی سلیقے سے کام لیا گیا ہے۔ مصنف نے عربوں اور ایرانیوں کی دلیری کا تذکرہ کیا ہے لیکن اپنے ملک کو وہ مشرق کا سرتاج سمجھتا ہے۔ ہندستانی عورتوں کی عصمت و عفت کا وہ خاص طور پر دل دادہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان کی وفاشعاری جس کا تقاضا تھا کہ چتا پر جل کر ستی ہو جائیں، دنیا میں بے مثل ہے۔ مصنف ستی کی رسم اور بیوہ کی شادی کی ممانعت کا مخالف ہے اور حیرت سے پوچھتا ہے کہ رنڈوے کے لیے جو جائز ہے وہ رانڈ کے لیے کیوں ناجائز ہے۔ وہ بچپن کی شادی کو بھی ناپسند کرتا ہے اور اسے بہت سی برائیوں کی وجہ سمجھتا ہے[۱]

اسے پڑھ کر مجھے ایک دوسری کتاب یاد آئی جس میں ہندستان کی عورتوں کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کا نام 'مجلس النسا' ہے اور اس میں ایک اُستانی، ایک لڑکی اور اس کی ماں کے مکالمے کے پیرائے میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مولوی الطاف حسین حالی کی تصنیف ہے جن کے علم اور فصیح البیانی کا ہر طرف چرچا ہے[۲] اور جن کی نظمیں انجمن لاہور کے مشاعرے میں جان ڈال دیتی ہیں۔[۳] پادری عمادالدین کی کتابوں

---

[۱] علی گڑھ اخبار بابت نومبر ۱۸۷۳ء

[۲] "پنجابی" بابت ۱۶ مئی ۱۸۷۴ء

[۳] ان میں سے ایک پوری نظم اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ بابت اگست ۱۸۷۴ء میں شایع ہوئی ہے۔

"تاریخ محمد[ی]" اور "تحقیق الایمان" کا رد بھی حالی نے لکھا جس کا نام "تریاقِ مسموم" ہے۔

سر ڈبلو میور Sir W. Muir جو گورنر جنرل ہند کی کونسل کے رُکن مقرر ہوتے ہیں، علاج کی غرض سے یورپ آتے ہوتے تھے۔ پیرس سے گزرتے وقت وہ مجھ سے ملنے آئے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ موصوف نے سالِ رواں میں عمدہ کتابوں کے مصنفوں کی ہمت افزائی کے لیے پانچ ہزار رُپے کی رقم عنایت کی ہے۔ ان میں سے سولہ اُردو کے اور دو ہندی کے نکلنے والے ہیں۔ ان میں جو کتاب مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ مولوی نذیر احمد کی 'توبۃ النصوح' ہے مولوی صاحب اس قسم کی دو اور کتابیں لکھ چکے ہیں۔ کہنے کی بات ہے کہ انھوں نے خیال آفرینی اور انشا طرازی کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ مسلمانوں کی گھریلو زندگی کو خوب سلجھاکر بیان کیا ہے۔ لیکن کتاب کا اصل حسن رواداری اور خوش اخلاقی کی تلقین میں مضمر ہے۔ کتاب کی بنیاد اس خیال پر رکھی گئی ہے کہ سچّی خوشی مذہب کی پابندی میں ملتی ہے۔

کئی اور کتابیں بھی دل چسپی سے خالی۔ مرادآباد کے انسپکٹر آف اسکول منولال نے 'مفید الدہر' کے نام سے ایک اخلاقی نظم تصنیف کی ہے۔ یہ صاحب 'صفا' تخلص کرتے ہیں اور کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ علاوہ برایں حسبِ ذیل کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں:۔

'تذکرۃ بلاغت' از مولوی ذوالفقار علی انسپکٹر آف اسکول سہارن پور

'تاریخِ کالپی' از شیخ حمید بخش

مراۃ الملک (تاریخ حکومت انگریزی) از رحیم بخش دہلوی۔
نتائج المعانی۔ از میرزا محمود بیگ ساکن پٹیالہ۔
ملکی اخباروں نے علی گڑھ کالج کے محمد سعید کی کتاب 'سیر المتقدمین' کا اشتہار دیا ہے۔ دراصل یہ Lenemarks of History کا ترجمہ ہے۔

"معاملاتِ دہلی" کا موضوع اس کے نام سے ہی ظاہر ہے اسے انجمن پنجاب نے مکاتب میں چھاپا ہے۔

"آداب الطلاب" ترجمہ ہے نصیر الدین طوسی کی کتاب "آداب المتعلمین" کا۔ ترجمہ مولوی سید احمد حسن نے کیا ہے جن کا کلام اخبارات و رسائل میں چھپتا رہتا ہے۔

اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ اور اخبار انجمن پنجاب نے سورج بنسی اور چندر بنسی گھرانوں پر لالہ ہزاری لال کی ایک مثنوی چھاپی ہے۔ شاعر نے ۱۱۱ اشعار میں ان گھرانوں کی تاریخ بیان کی ہے اور اس سے صرف ہندوستانی ہی نہیں بلکہ زبان جاننے والے یورپین بھی محظوظ ہو سکتے ہیں۔

"طب رحیم" کے نام سے ڈاکٹر رحیم خاں نے اردو میں ۸۰ صفحات کا ایک مقالہ لکھا ہے جو لاہور کے میڈیکل کالج کے نصاب میں داخل ہو گیا ہے۔ اس میں تمام بیماریوں کے اسباب تشخیص اور علاج پر بحث کی گئی ہے۔ بیماریوں کے نام صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ یونانی، عربی اور انگریزی میں بھی دیے گئے ہیں۔ جگہ جگہ کسی نکتے کو سمجھانے کے لیے تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے

میں علم الطب پر سائنٹفک بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں بیماریوں کا بیان ہے۔ البتہ سرجری یا علمِ تشریح کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ 'پنجابی' کے ریویو نگار کا بیان ہے کہ ان دو مضمونوں پر الگ رسالے موجود ہیں۔

گنگا پرشاد مراد آبادی نے 'کتاب نباتاتِ ہند' میں جڑی بوٹیوں کا حال لکھا ہے۔ اس کے لکھنے میں پرانی کتابوں سے خاصی مدد لی ہے اور بوٹیوں کے طبّی فوائد بیان کیے ہیں۔

مسٹر فیلن Mr Fallon اپنی عظیم الشان ہندستانی ڈکشنری کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ جب یہ تیار ہو جائے گی تو ہندستانی زبان کے شائقین کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو گی۔ تحریری اور بول چال۔ دونوں بولیوں کے الفاظ کے مجموعے کے علاوہ اس میں محاورے بھی جمع کیے جائیں گے اور ان کا برمحل استعمال مثال دے کر سمجھایا جائے گا۔ ہر لفظ کے ماخذ کی تشریح ہوگی۔ غرض کہ وہ سب کچھ ہوگا جو ایک بلند پایہ لغت میں ہونا چاہیے۔ یہی نہیں کہاوتیں اور پہیلیاں بھی شامل کی جائیں گی مسٹر فیلن نے اپنے کارنامے کا ایک نیا خاکہ شایع کیا ہے جو علمی دنیا کے لیے دل چسپی کا باعث ہوگا۔ لغت کی طباعت کا انتظام پٹنہ میں کیا گیا ہے اور وہ کئی حصوں میں شایع ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی پِتّا ماری کا کام ہے۔ اس کی تکمیل کے لیے دولت اور محنت دونوں درکار ہیں۔ ایسی ضخیم لغت کی طباعت کے لیے زرِ کثیر کی ضرورت ہوگی۔ بہ ہر حال میری دعا ہے کہ یہ کارنمایاں جلد از جلد

---

۱ ملاحظہ ۱۷ جنوری ۱۸۷۴ء

خیر و خوبی سے انجام پاتے۔

یوریپنیوں کی لکھی ہوئی اُردو زبان کی گریریں تو کئی ہیں۔ اس اہم صیغے کی طرف خود ہندستانیوں نے کوئی توجہ نہ کی تھی۔ لیکن وقت کا تقاضا ایسا ہوتا ہو کہ اب وہ انگریزی میں گرامر لکھنے لگے ہیں۔ چناں چہ کیننگ کالج کے پروفیسر رام کشن نے لکھنؤ سے Hand book of Urdu Grammer (اُردو صَرف و نحو) انگریزی میں شایع کی ہو۔ یہ کلکتہ یونی ورسٹی کے ممتحنوں کی آسانی کے لیے لکھی گئی ہو۔ اسے نئے اصولوں پر مرتب کیا گیا ہو اور سرورق پر عربی کی یہ ضرب المثل درج ہو: کل جدید لذیذ میور گزٹ پر بھی یہی مقولہ تحریر ہو۔

اخبار سررشتہ تعلیم اودھ[1] نے ان کتابوں کی فہرست چھاپی ہو جو لکھنؤ سے سالِ رواں کے نو مہینوں میں شایع ہوئی ہیں۔ ان میں حسبِ ذیل کتابیں قابلِ ذکر ہیں:۔

ذخیرۂ نجات } از لال جی
رموز العارفین }

فسانۂ غم آموز از حافظ امیر الدین

گلشنِ فیض (تاریخ راجا بھوج) از نند کشور لال

دیوان واسطی جبل پوری

کلام سدا سکھ عاشق

---

[1] دراصل یہ ماہانہ رسالہ ہو جو ہر پہلی تاریخ کو لکھنؤ سے شایع ہوتا ہو۔ ہر پرچے میں تین کالم کے ۳۲ صفحے ہوتے ہیں۔

چشمۂ فیض (اخلاقی نظمیں) از عبدالغفور خاں۔

انوار سہیلی کا نیا ترجمہ از بہاری لال۔

جغرافیۂ جون پور از مولوی ذوالفقار خاں

مراۃ السلاطین (ترجمۂ سیر المتاخرین) از گوکل پرشاد

ریاض الشہدا (نوحۂ حسینؑ) از منشی کنور سین[1]

آداب انشا از فتح محمد

جوگی نامہ از باطن (مصنفِ تذکرۂ گلشنِ بے خزاں)

فسانۂ جوش

ہندی کی یہ کتابیں قابلِ ذکر ہیں:۔

وشنوپد از ہرچرن داس

گوپی چند بھرتری } ان دونوں میں رادھا اور کشن جی کی محبت
جنگل بلاس } کا حال ہے۔ از لکھمن لال۔

مہابھارت کا ترجمہ نظم میں۔ نیز پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن۔
اردو کی جو پرانی کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوتی ہیں ان میں سب سے پہلے کلیات میر تقی میر کا نام آتا ہے۔ یہ مقامِ مسرت ہے کہ قدیم اساتذہ کے کلام کا ذوق اہلِ ہند میں ہنوز زندہ ہے۔ چند اور کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

تحفۃ العجم۔ ترجمۂ کنزالدقائق

فتوح الشام۔ ترجمۂ واقدی

---

[1] 'جام' تخلص فرماتے ہیں۔ صوفی منش بزرگ ہیں۔ ایک عیسوی کتاب کی ترتیب میں بھی حصہ لیا ہے۔

اسرارِ کربلا۔ از ظہیر الدین خاں
شامِ غریباں نظمِ تسلیم
ان کے علاوہ بعض کتابیں عوام کی دلچسپی کی ہیں جو حال میں شایع ہوتی ہیں۔

قصۂ جمجمہ
قصۂ شاہ روم
قصۂ شیخ منصور
قصۂ سوداگر بچہ
قصۂ بہرام گور
قصۂ ماہی گیر

بنگلور کے منشی محمد یاسین نے ریاست میسور کے مدرسوں کے لیے 'سلسلۂ تعلیم یاسینی' کے نام سے کئی ابتدائی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے 'پہلی لڑکوں کے سبق کی پہلی کتاب' کے نام سے چھپ کر مقبولِ عام ہو چکی ہے۔

ترجموں کا ذکر کرتے وقت میں 'توتا کہانی' کو کیوں کر بھول سکتا ہوں۔ اس کا اردو ترجمہ مشہور ہندو دوست مسٹر جارج اسمال (george Small) نے کیا ہے جو پہلے بھی کئی مفید کتابیں لکھ چکے ہیں۔

ہندستانی عیسائیوں کی مطبوعات میں سے ایک خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ اس کا عنوان 'دجالِ مسیح' ہے اور مؤلف کا نام رام چندر ہے جو ریاست پٹیالہ میں وزیرِ تعلیم ہیں۔ مصنف ـــــ کا

رُوئے سخن کتاب میں پیغمبرِ اسلام کی جانب ہے۔ میرزا فتح محمد بیگ[۱] نے اس رسالے پر ایک محققانہ تبصرہ شایع کیا ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے عیسائی مبلغوں کے ادھ کچرے علم کی خوب دھجیاں اڑائی ہیں اور حیرت ظاہر کی ہے کہ رام چندر جیسے ذی علم مصنف نے بھی وہی راستہ اختیار کیا۔ بعد ازاں میرزا صاحب نے اس عیسائی عالم کے استدلال کا ایک ایک کر کے جواب دیا ہے۔ رام چندر صاحب کا دعوا ہے کہ قرآن و حدیث کے مطابق عیسائی اصل ایمان والے ہیں نہ کہ مسلمان۔ پھر وہ فرماتے ہیں کہ انجیل اور قرآن دونوں کے مطابق آں حضرت صلعم (نعوذ باللہ) دجّال ہیں۔ پھر میرزا صاحب نے ثابت کیا ہے کہ رام چندر کا یہ دعوا کہ قرآن شریف اور انجیل میں مطابقت پائی جاتی ہے، بے بنیاد ہے۔ میرزا صاحب نے رام چندر کے دعووں کا جواب بڑی معقولیت سے دیا ہے اور مثالیں دے دے کر ثابت کیا ہے کہ انجیل کے دونوں حصّوں میں متاخرین نے کتنا تصرف کر دیا ہے۔

مولوی محمد علی نے لالہ اندرمن کی تصنیف 'صولتِ ہند' کے جواب میں 'ظفر مبین' کے نام سے چھ سو صفحوں کی ایک ضخیم کتاب شایع کی ہے۔ مدیرِ پنجابی[۲] کا بیان ہے کہ اس میں ہندستان کے مذاہب پر نہایت مدلل اور معقول بحث کی گئی ہے۔

مسٹر F. S. Growse (ایف۔ ایس گروس) نے

---

[۱] پنجابی بابت یکم جنوری اور ۲۷ فروری ۱۸۷۲ء

[۲] پنجابی بابت ۲۱ فروری ۱۸۷۲ء

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالہ (شمارہ ۴ - ۱۸۷۳ء) میں چند کی تصنیف 'پرتھوی راج راسو' کے ابتدائی اشعار کا ترجمہ نظم میں شایع کیا ہو اور ضروری حواشی بھی دیے ہیں۔ ریورنڈ A. F. Rudolf Hoernle نے جو گوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر لکھ کر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اسی عظیم الشان رزمیہ نظم کے ۲۷ ویں باب کا ترجمہ Indian Antiquary کے جنوری ۱۸۷۳ء نمبر میں شایع کیا ہو۔ اپریل کے شمارے میں انھوں نے نظم کی بحروں پر ایک عالمانہ مقالہ تحریر کیا ہو۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ مسٹر John Beames کے تعاون سے موصوف 'راسو' کو بالاقساط شایع کر رہے ہیں۔ جون صاحب نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں چند بردائی کی صرف و نحو پر ایک بصیرت افروز مقالہ لکھا ہو۔ Indian Antiquary (جنوری ۱۸۷۳ء) میں ان کا دوسرا مضمون 'ہندی میں اضافت کے استعمال' پر چھپا ہو۔

ہندستانی رسائل و جرائد میں اس سال جن شاعروں کو مقبولیت حاصل ہوئی، ان کے نام نیچے درج کرتا ہوں:-

میرزا اشرف بیگ خاں دہلوی۔ اشرف

جواہر سنگ بلرام پوری - جوہر

کفایت علی بلند شہری۔ کفایت

محمد عمر علی وحشی

لکھپت رائے ۔ بستر

محمد حسین (راہوالیہ) محمود

سیف الحق دہلوی۔ ادیب

غلام محمد خاں۔ غلامی

غلام اصغر سیال کوٹی۔ شیدا

کشن گوپال وزیر آبادی۔ شیدا

حضرات شعرا کے تذکرے میں سابق شاہ اودھ واجد علی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اختر تخلص فرماتے ہیں اور اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہیں کلکتہ سے تین میل دور دریائے ہگلی کے کنارے کوئی بیس سال سے قیام پزیر ہیں۔ دو لاکھ بیس ہزار پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر ہے۔ موسیقی، مصوری اور شاعری سے شغف ہے۔ ان کے بنائے ہوئے گیت کلکتہ اور بنارس کے گھروں اور بازاروں میں گائے جاتے ہیں۔ انھیں 'حضرت کی طغری' کہتے ہیں[1] وہ جس شاہی محل میں رہتے ہیں اسے ان کی عمل داری کہنا چاہیے۔ ان کی رعایا کی تعداد چھ ہزار ہے اور دربار داری کی وہ ساری شان باقی ہے جو لکھنؤ کی زینت تھی۔ وہ اپنے محل سے کبھی باہر قدم نہیں رکھتے۔ خود وائس رائے سے ملنے نہیں جاتے، البتہ وہ ان سے ملنے آیا کرتا ہے۔ اپنی رہائش کے لیے بادشاہ نے تین محل بنائے ہیں: سلطان خانہ جسے شاہی محل کہنا چاہیے، آزاد منزل اور زرد کوٹھی۔ حرم میں دو بیگمیں ہیں اور ایک سو اکتیس خواصیں۔ اس چھوٹی سی ریاست کی سب سے

---

[1] اس جگہ حاشیے میں گارساں دتاسی نے لکھا ہے: "واجد علی شاہ کے نام کے ساتھ "زیب طغرا" بھی لکھا جاتا ہے۔ اسلامی بادشاہوں کے اسلحہ پر طغرا میں نام لکھا جاتا تھا۔ طغرا سے صفت ہے طغری"۔

عجیب چیز اس کا چڑیا گھر ہے جو سارے عالم میں انتخاب ہے۔ اس میں سب ملا کر بیس ہزار جانور ہیں جن میں سے کئی نایاب ہیں۔ کبوتروں کا ایسا انتخاب کہیں نہ ہوگا۔ سانپوں اور رینگنے والے دوسرے جانوروں کی اتنی قسمیں کہیں دیکھنے میں نہ آئیں گی۔ باغات کی آرایش نظر افروز ہے اور ان کی دیکھ بھال تین سو مالیوں کے سپرد ہے[1]۔

"اودھ اخبار" اور اس کے بعد "اخبارِ عالم" میرٹھ[2] میں نواب احمد حسن خاں جوشؔ عرف اچھے صاحب کی مثنوی منشی میاں دادخاں کی مدح میں شایع ہوتی ہے جس میں صنعتِ توشیح کی رعایت رکھی ہے۔

"اُردو کا خون" کے عنوان سے بابو شیو پرشاد نے کلکتہ یونی ورسٹی کے نصاب کے لیے ایک انتخاب شایع کیا ہے۔ اس میں شکنتلا کی کہانی، افسوس کی آرایش محفل کے اقتباس اور گنج خوبی مترجمۂ اخلاق محسنی کے اقتباس شامل ہیں۔ نجم الاخبار اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ[3] میں اس انتخاب پر سخت لعن طعن کی گئی ہے۔ خصوصاً شکنتلا اور آرایش محفل پر یہ کہہ کر اعتراض کیا گیا ہے کہ ان کی زبان غیر فصیح ہے اور بڑی حد تک متروک ہو چکی ہے۔ اس سلسلے میں وہ بال کی کھال نکالی گئی ہے کہ توبہ۔ اور سخت تعجب ہے کہ آرایشِ محفل تک کی تعریف میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا گیا حالاں کہ

---

[1] لندن ٹائمس ۲۷ و ۳۰ اکتوبر ۱۸۷۳ء

[2] پرچہ بابت ۲ اپریل ۱۸۷۴ء

[3] ۳ اپریل ۱۸۷۴ء

اس کا شمار باغ و بہار کے ساتھ اُردو کی سندی کتابوں میں ہوتا ہے۔ بابو شیو پرشاد نے ان تبصروں کے جواب میں یہ مہمل سوال کیا ہے کہ طلبا کو اتنی فرصت کہاں کہ سیکڑوں کتابیں پڑھ سکیں اور نئی کتابوں کی عجیب و غریب زبان کو سمجھ سکیں۔ علاوہ براین انتخاب ان طلبا کے لیے کیا گیا تھا جو ٹھیٹھ اُردو میں مہارت نہیں رکھتے[1]۔

حکومتِ برطانیہ ہندستان میں انگریزی زبان کی اشاعت کرنے کا جی جان سے جتن کر رہی ہے۔ اسی غرض سے میجر ہول رائڈ نے (جو محکمۂ تعلیم پنجاب کے ناظم اور اُردو، فارسی و عربی کے عالم ہیں) اُردو میں ایک کتاب لکھی ہے جو نستعلیق خط میں لاہور سے شایع ہو رہی ہے۔ کتاب کا عنوان ہے: "انگریزی زبان کو کس طرح بولنا اور لکھنا چاہیے"۔

پچھلے سال مَیں نے ہندستان کی ناٹک منڈلیوں کا ذکر کیا تھا۔ اس منڈلی نے جس نے کلکتہ میں تماشا دکھایا تھا، اب کے بنارس اور الہ آباد میں ناٹک رچائے۔ الہ آباد میں اس نے نیل درپن کو اسٹیج کیا۔ اس کا چرچا پہلے بھی کئی بار آچکا ہے۔ بعدازآں چار اور ناٹک دکھلائے گئے جن سے ناظرین از حد محظوظ ہوئے۔

اس قسم کے ناٹک عموماً بڑے بڑے میلوں میں دکھلائے جاتے ہیں۔ رام پور کا میلا جو ملک بھر میں مشہور ہے، اس سال مارچ کے آخری ہفتے میں باغ بےنظیر میں لگا۔ اخباروں نے اس میلے میں شامل ہونے کی دعوت خاص و عام کو دی ہے اور قسم قسم کی تفریحوں

---

[1] علی گڑھ اخبار ۱۷ اپریل ۱۸۷۴ء

کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ رئیسوں، شاعروں اور خطیبوں کی ایسی ریل پیل، ناچ رنگ کی یہ دھوم دھام اور ندی پر چراغاں کا یہ ٹھاٹ اور کہیں دیکھنے میں نہ آئے گا۔ یہ میلا اس لیے لگتا ہے کہ حضرت محمد کے نقشِ قدم کی زیارت کی جائے۔ کہتے ہیں کہ ایک پتھر پر قدمِ مبارک کا نقش موجود ہے۔

کٹر مسلمانوں کو ناٹک ناپسند ہیں۔ چناں چہ بوہروں کے بڑے پیر نے فتوا صادر کیا ہے کہ ان کا کوئی پیرو ناٹک دیکھنے نہ جائے۔ بمبئی میں بوہروں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اس فتوے پر تھیٹر کے مالک سخت برہم ہیں[1]۔

مخش کتابوں کی اشاعت پر حکومت کا احتساب سخت تر ہوتا جاتا ہے اور انھیں پڑھنے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ کہیں سے مانگ تانگ کر چوری چھپے پڑھا جائے۔ پنجاب کے پنڈت کرشن لال نے گزشتہ فروری میں اس مسئلے پر تقریر کی اور واضح کیا کہ یہ احتساب کس حد تک جائز تصور کیا جا سکتا ہے۔ 'مقیاسِ فحش' کے نام سے پنڈت جی نے اسی مضمون پر ایک مبسوط مقالہ بھی سپردِ قلم کیا ہے[2]۔ اخباروں نے ان کی رواداری اور معقولیت پسندی کو بہت سراہا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ پنڈت جی بہت بڑے عالم ہیں اور بہ یک وقت ہندی، اُردو، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے ماہر ہیں۔ وہ شعر

---

[1] انڈین میل ۲۷ جولائی ۱۸۷۴ء

[2] اخبار انجمن پنجاب۔ بابت ۲ فروری۔ بعد ازاں اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

بھی کہتے ہیں اور طالب تخلص کرتے ہیں۔ فحشیات کے باب میں انھوں نے جو حدود قائم کی ہیں وہ دل چسپی سے خالی نہیں۔ لیکن ان پامال مضامین کا ذکر کرنا بھول گئے جن کا تعلق جنسی کج روی سے ہے اور جو مشرقی شاعروں میں مقبول ہیں، اس حد تک کہ ہند و عجم کے بڑے بڑے خوش بیان سعدیؔ و حافظؔ، حسنؔ و سوداؔ تک ان سے نہ بچ سکے۔ اور بھی گرے ہوئے مضامین ہیں جن میں مشرقی شاعروں کو کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن اس میدان میں کئی یوربین شاعر ان سے دو قدم آگے ہی ہیں۔

پنڈت کرشن لال کو محولہ بالا موضوع پر تقریر کرنے کی ترغیب یوں ہوئی کہ لاہور آنے کے بعد انھوں نے چند کتابیں خریدنے کا ارادہ کیا لیکن وہ کسی طرح دست یاب نہ ہوسکیں۔ کتب خانوں میں قانون و نصاب کی کتابوں اور جنتریوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ حال ہی میں کوئی شخص بیوپاری کے بہروپ میں آیا اور کسی کتب فروش سے جعفر زٹلی کی کلیات اور 'دھونکل نامہ' طلب کیا۔ کتابیں خرید کر یہ بہروپیا عدالت پہنچا اور فحش فروشی کے الزام میں نالش جڑدی۔ بے چارے کتب فروش کو فحش کتابیں بیچنے کے جرم میں جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ مقدمے کا خرچ الگ گلے پڑا۔[1]

---

[1] اخبار انجمن پنجاب ۲۰ فروری ۱۸۶۸ء 'پنجابی' کی ۱۱ اپریل کی اشاعت میں تحریر ہے کہ کلکتہ میں راہ چلتے فحش گیت گانے کے جرم میں کئی منچلوں کو جرمانے کی سزا ہوئی ہے۔

اب کتب فروشوں کو یہ ہول ہو کہ کہیں دوسری کتابیں بھی اسی زُمرے میں شمار نہ ہوں۔ کیوں کہ ایسا کوئی قانون نہیں ہو جس سے فحش و غیر فحش کی تمیز ہو سکے۔ بہتیرے یورپیوں کا تو یہ گمان ہو کہ ہر ایشیائی کتب فحش ہو۔ اس صورت میں تو جنتری اور بغدادی قاعدے تک پر اعتراض ہو سکتا ہو۔ ایک کتب فروش تو اتنا سہم گیا تھا کہ پنڈت جی سے کہنے لگا کہ اگر اس جُرم میں اور کسی کا گلا ناپا گیا تو میں یہ دُکان بیچ کر ہمیشہ کے لیے کتابوں کے نام سے توبہ کرلوں گا۔ یہ سب دیکھ سُن کر پنڈت جی سنّاٹے میں آگئے اور انھوں نے وہ معرکۃ الآرا مقالہ تیّار کیا جس کا خلاصہ اخبار 'پنجابی' (۱۲ فروری ۱۸۷۴ء) کے حوالے سے میں نیچے درج کرتا ہوں:۔

"انسان اور حیوان میں اصل فرق زبان کا ہو۔ زبان کے وسیلے سے انسان اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار کرتا ہو۔ اظہار کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں۔ یا تو کوئی فحش مضمون برہنہ ہو سکتا ہو یا نیم برہنہ یا پوشیدہ اور یا شایستہ۔ اس لحاظ سے اسلوبِ بیان کی چار الگ قسمیں ہیں:۔ (۱) وہ جس میں کوئی مذموم مضمون انتہائی برہنگی سے بیان کیا جائے۔ (۲) وہ جس میں صنائع و بدائع سے اس کا ستر کیا جائے۔ (۳) وہ جو آزادی میں حسن کا پہلو باقی رکھے۔ (۴) وہ جس میں بات بڑی تراش اور سنوار کے ساتھ کہی جائے۔

پہلا طریقہ سرائے، بھنگڑی خانہ اور چکلہ گھر میں چلن پاچکا

نئی نویلیاں اپنے اٹھرپن میں یا حرم والیاں یا سیدھے سادے لوگ بول چال کا یہ طریقہ استعمال کرتے ہیں۔

دوسرا طریقہ مستور فحشیات کا ہے۔ یعنی بات گھما پھرا کر لچھے دار پیرایے میں کہی جائے۔ اچھی صحبتوں میں اسی کا چلن ہے۔

تیسرا طریقہ اُن لوگوں کا ہے جن کا فطری رُجحان 'لذت' کی طرف ہوتا ہے، خواہ وہ کہیں بھی میسّر ہو۔ ان کا واحد مقصد یہی ہوتا ہے کہ بھونروں کی طرح پھول پھول کو چکھتے پھریں اور ہمیشہ خوش رہیں۔

چوتھا پیرایہ نہ میٹھا ہے نہ سلونا۔ یہ قطعًا عالمانہ ہے اور ملے علمی بحثوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے شہوانی یا جنسی معاملات سے فی نفسہٖ کوئی تعلق نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے کس پیرایۂ بیان پر تحدید عائد ہونا چاہیے۔ جہاں تک بول چال کی زبان کا تعلق ہے جسے تعلیم کی پوشش حاصل نہیں وہ ہمیشہ ننگا رہے گا اور اگر بہت پکڑ دھکڑ کی گئی تو زیادہ سے زیادہ لنگوٹی پہن لے گا۔ جاہلوں کو زبان پر قابو نہیں ہو سکتا۔ بازاروں میں تو گالی گلوج پر روک تھام کی جا سکتی ہے لیکن ہر آدمی اپنے گھر کا بادشاہ ہے۔ عدالتوں کے احکام چہار دیواری کے اندر کام نہیں دے سکتے۔ لیکن جو کتابیں بکری کے لیے شایع ہوتی ہیں وہ قانون کی حد میں آتی ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے دیکھنا چاہیے کہ وہ کس زبان میں لکھی جاتی ہیں۔

پہلے سنسکرت کو لیجیے۔ اس کی بااعلا تصنیف میں ادنا درجے کی فحشیات کا نام و نشان بھی نہیں۔ ہم یہاں کوک شاستر کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ ایک بات اس کے ہندستانی ترجمے لذت النسا کے متعلق کہنی ہے۔ کوکا پنڈت کی کتاب جنسی تعلقات پر ایک علمی بحث ہے۔ ہمارے مسلمان بھائیوں کو تو دادِ عیش دینا مقصود ہے۔ چناں چہ انھوں نے کتاب کے علمی حصے کو بالائے طاق رکھا اور صرف شہوت خیز ابواب چن لیے۔ اگر کوک شاستر میں تصرف نہ کیا جائے تو یہ علم الابدان کے ایک رسالے کے سوا اور کچھ نہیں اور اس میں کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں۔ ایسی کتابیں انگریزی زبان میں بھی لکھی گئی ہیں۔

فحشیاتِ مستور کی مثالیں سنسکرت میں کہیں کہیں ملتی ہیں لیکن بہت کم[1]

تیسرے پیرایۂ بیان میں ناٹکوں کو شمار کیا جا سکتا ہے جن کے حسنِ انشا کا ساری دنیا میں شہرہ ہے۔

مختصر یہ کہ سنسکرت میں فحش مضامین کی بڑی ہوشیاری سے پردہ پوشی کی ہے[2] مثال کے طور پر دسہستر رجنی چرتر (सहस्त्र-रजनी चारित्र) کو لیجیے جو اپنی قسم کی لاجواب کتاب ہے

---

[1] پنڈت جی نے سنسکرت سے جو رواداری برتی ہے اس کی ذمے داری ان پر ہے۔ لیکن کالی داس کی جو مثال انھوں نے اپنے ثبوت میں پیش کی ہے اس میں تو باتیں ایسی صفائی سے کہی گئی ہیں کہ مجھے ترجمے کی جرأت نہیں۔ (گارساں دتاسی)

[2] میں از سرِ نو یاد دہانی کرتا ہوں کہ پنڈت جی نے سنسکرت سے بڑی نرمی برتی ہے اور اس کی ذمے داری انھی پر ہے۔

اور جس کے ترجمے تمام زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

عربی کا پایہ سنسکرت سے کم بلند نہیں۔ لیکن 'ناٹک' کے قسم کی چیز جو حسنِ ذوق پر دلالت کرتی ہو، عربی میں نایاب ہے۔[1]

فارسی میں بیان کے سبھی پیرائے ملیں گے۔ خاقانی اور انوری نے فحش بیانی کی ہو لیکن ایسی ہوشیاری سے کہ ناظر کے ذوق پر گراں نہیں گزرتی۔

پیرایۂ مستور میں تو فارسی نے ایسی ندرت دکھلائی ہو کہ اور کہیں جواب نہیں ملتا۔ اور حقیقت تو یہ ہو کہ فارسی کے ہر انشاپرداز کے ہاں اس کی مثالیں ملیں گی۔ اس ضمن میں بہارِ دانش خاص طور پر بدنام ہو۔ 'گلستاں'، تک جس کا وِرد بچّہ بچّہ کرتا ہو، اس عیب سے خالی نہیں۔ اس میں ایسے جملوں اور محاوروں کی کمی نہیں جو مذاقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں۔[2]

سنسکرت کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہو اس کا اطلاق ہندی بھاشا پر بھی ہو سکتا ہو۔

رہ گئی اُردو، تو اس پر فارسی کا گہرا اثر ہو اور اسی کی طرح اس نے پردے پردے میں سب کچھ کہہ جانے کا خوب سلیقہ پیدا کر لیا ہو۔ لیکن بُرقع اُتار کر اوڑھنی ڈال لینے سے عورت کا حُلیہ جتنا بدل جاتا ہو اتنا ہی فرق 'ریختہ' اور 'ریختی' میں ہو۔ جعفر زٹلی، چرکین اور جان صاحب

---

[1] پنجابی کے ایڈیٹر نے بجا طور پر اس بیان کی تردید کی ہو۔

[2] مکتبوں میں پڑھائی جانے والی فارسی کتابوں میں بھی ایسی باتیں آجاتی ہیں جن کی گرفت کی جا سکتی ہو۔ یوسف زلیخا، بہار دانش وغیرہ ملاحظہ ہوں۔

کی تُنک بندی علانیہ فحش نویسی کی مثالیں ہیں۔ سوداؔ، انشاؔ، رنگینؔ، نظیرؔ وغیرہ نے انھی مضامین پر خاصی لیپا پوتی کی ہے۔ لیکن اگر انگریزوں کی عینک سے دیکھیے تو ساری ہندستانی شاعری پر فحش نگاری کا الزام عائد ہو سکتا ہے۔ جملہ دواوین کے علاوہ نعمت علی خاں کی حُسن و عشق،[1] پنج رقعہ، مینا بازار اور شبنم شاداب کو کس زُمرے میں رکھیے گا۔ غنیمت ہے کہ ایسی کتابوں کا شمار زٹلی اور جان صاحب کی خُرافات کے ساتھ نہیں ہوتا، ورنہ یہ تو بے انصافی کی انتہا ہو جاتی۔ اگر ترازو کا پلّا اتنا جھکایا گیا تو انتہائی تخیّل کے نادر نمونوں پر بھی احتساب کرنا ہوگا اور ہمارا سارا ادب مُردہ قرار دے دیا جائے گا۔ مثلاً 'حُسن و عشق' کو ہی لیجیے۔ اس میں شادی بیاہ کی رسموں اور تیوہاروں کی رِیتوں کا کتنا اچھا بیان کیا گیا ہے۔

اب انگریزی کو لیجیے۔ کیوں یہ برگزیدہ بندوں کی زبان ہے جن کے سینوں میں علم کی برکتیں موجیں مار رہی ہیں اس لیے انھیں نہ فحشِ ظاہر کی ضرورت ہے نہ فحشِ مستور کی۔ البتّہ یہ ضرور ہے کہ ننگی تصویریں اور ننگے مجسّمے ان کے گھروں کی زینت بڑھاتے ہیں۔ لیکن اسے کوئی عیب نہ سمجھیے۔ عربی کی کہاوت ہے کہ سمجھداروں کا کوئی کام سمجھ سے خالی نہیں۔ ایک ذرا لارڈ بائیرن کے کلام کو لیجیے۔ شراب و شباب کے ذکر میں انھوں نے کیا کیا موشگافی نہیں کی ہے۔ پھر بھلا اُردو و فارسی کے غریب شاعروں نے کیا جُرم کیا ہے۔ اپنا اپنا پیرایۂ اظہار ہے ورنہ مضمون تو دونوں کے ایک ہی ہیں۔ اس صورت میں یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بے چارے کتب فروشوں

[1] [illegible]

کو دو دو پیسے کی کتابیں بیچنے کے جُرم میں سزا دی جائے۔ درآں حالیکہ حکومتِ وقت اب تک 'فحش'، 'مہذب' کے مابین کوئی تمیز نہیں کر سکی۔ کتب فروشوں سے اس شعور کی توقع کیوں کی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ڈر کے مارے وہ ہر قسم کی کتابیں بیچنا بند کر دیں گے۔

سوال یہ ہے کہ بداخلاقی کی ترغیب دینے والی کتابوں کی اشاعت کو روکنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کا فیصلہ کوئی ایک آدمی نہیں کر سکتا اور اگر اس غرض سے کوئی کمیٹی مقرر کی جائے تو اُسے بھی مشکلات سے دوچار ہونا ہوگا۔ لیکن آج علم کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور ہر کس و ناکس اس میں داخل ہو کر فیض یاب ہو سکتا ہے۔ لاہور کی انجمن کو یہ فضیلت حاصل ہے اور وہ نیک و بد کی تمیز کر سکتی ہے۔ اگر اس کے ارکان فرداً فرداً کچھ کتابیں لا کر ان کا تجزیہ کریں تو کچھ عرصے میں مخربِ اخلاق کتابوں کی فہرست تیار ہو سکتی ہے اور ان کی اشاعت بند کی جا سکتی ہے کیوں کہ فہرست کئی لوگوں کی رائے اور باہمی مشورے کے بعد تیار ہوگی اس لیے شکایت کی کوئی گنجایش نہ ہوگی اور عدالت کو بھی فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ تاہم اس قسم کا اقدام کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ یہ مشتہر کر دیا جائے کہ فحشیات کی حد کس نقطے سے شروع ہوتی ہے تاکہ بعد میں شک و شبہے کی کوئی گنجایش نہ رہے۔ یہ ضروری ہے کہ پریس، کتب فروش اور مصنف سب کو معلوم ہو جائے کہ ان کی ذمے داری کیا ہے تاکہ وہ خواہ مخواہ اپنے کاروبار سے ہی بددل نہ ہو جائیں۔ اگر کسی

غلط فہمی کا اندیشہ ہو تو انھیں ہماری انجمن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس انجمن کا مقصد ہی یہ ہو کہ ملک میں عمدہ ادب کو عام کرے۔

علاوہ بریں قابلِ اعتراض تحریر پر ہاتھ رکھنا کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں۔ میں کوئی زبان داں نہیں، تاہم کئی کتابوں کے فحش ابواب کی گرفت آسانی سے کرسکتا ہوں۔ مثال کے طور پر گلستاں کے پانچویں اور چھٹے باب کی کئی حکایتیں، وقائع نعمت علی خاں کے بعض مقامات پڑھنے کے قابل نہیں۔ رنگین[۱] کی تصنیف نورتن کی کئی کہانیاں اسی دائرے میں آتی ہیں۔ کلیاتِ جعفر زٹلی، فال نامہ اور فلاں نامہ میں بھی جی کھول کر گندگی کی چھینٹیں اڑائی گئی ہیں۔ لیکن میر کا 'تمسک نظم نامہ' اور اسی قسم کی نظموں میں شوخی اور فحش کے درمیان ایک نازک سی لکیر کھنچی ہوئی ہو۔ اگر انھیں بھی قابلِ ضبطی سمجھا جائے تو انگریزی اخبار 'پنچ' کو کیا کہا جائے جو ہر فرنگی کی میز پر نظر آتا ہو۔

کلیاتِ نظیر کے کئی حصے خارج کر دینے چاہییں مثلاً ازاربند والی غزل، بیا نامہ[۲]، کوٹھی مزے وغیرہ۔ 'ہولی کی بہار' اور اس قسم کی نظمیں اسی قماش کی ہیں۔ ان کے مخربِ اخلاق ہونے

---

[۱] نورتن رنگین کی تصنیف نہیں بلکہ مہجور کی ہو۔ (اڈیٹر)

[۲] بیا ایک چھوٹی سی چڑیا ہوتی ہو جس کے متعلق مشہور ہو کہ وہ اس مصنوعی تل کو اڑا لے جاتی ہو جو حسین عورتیں اپنے چہرے پر بناتی ہیں۔

میں کوئی شک نہیں۔ کلیاتِ سودا اور کلیاتِ میر انشا کا بھی یہی حال ہے۔ انشا کے دیوان ریختی کے بیش تر حصّے کو قطعاً ممنوع قرار دینا چاہیے۔ میاں رنگین اور جان صاحب کی ریختی کے دیوان ان سے ہرگز بہتر نہیں۔ یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ ان شاعروں کا اصل منشا یہ تھا کہ عورتوں کی زبان ادب میں آجائے۔ اس لیے ان کی کانٹ چھانٹ نہایت احتیاط سے ہونی چاہیے۔

یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ ہندستانی شاعری کے دن بیت گئے اور جلد وہ دن آنے والا ہے جب شعر و شاعری کا چرچا ختم ہو جائے گا۔ آٹے دال کی تلاش میں سب کا قافیہ تنگ ہے اور کسے فرصت کہ شاعری میں وقت گنوائے۔ اگر کسی من چلے نے کچھ لکھ بھی دیا تو پڑھنے کی فرصت کسے ہے۔ جب شاعری خود ہی مر رہی ہے تو اس بے چاری پر احتساب بٹھانے سے کیا حاصل"۔

پنڈت کرشن لال کی تقریر کے بعد کئی حاضرینِ جلسہ نے ان کی حمایت میں بہت کچھ کہا۔ آخر کار طے پایا کہ اگلے جلسے میں ایسی قراردادیں تجویز کی جائیں گی جو حکومت کے سامنے پیش کی جا سکیں۔

اس عرصے میں کتب فروشوں نے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ اُن لوگوں نے لاہور سے ایک عریضہ حکومت کی خدمت میں اس غرض سے پیش کیا ہے کہ قانونِ امتناعِ فحشیات کی صاف صاف تشریح ہونی چاہیے۔ (علی گڑھ اخبار ۱۲ جون ۱۸۷۴ء)

ان کے ایک نمایندے نے اخبار پنجابی[1] میں یہ مضمون شایع کیا ہے۔

---

[1] ۲۱ مارچ ۱۸۷۴ء

"ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ فحش سمجھی جانے والی کتابوں کی ضبطی سے حکومت کا مقصد کیا ہے؟ ممکن ہے کہ حکومت تہذیب اور شائستگی کی تبلیغ کرنا چاہتی ہو اور اسے خوب معلوم ہے کہ تعلیم کے بغیر یہ امر ناممکن ہے۔ لیکن مطالعہ نہ ہوسکے تو تعلیم کیوں کر ممکن ہے۔ پھر بھلا شاعری کی کتابوں کی اندھا دھند ضبطی کے پیشِ نظر یہ مطالعہ کیسے مکمل ہوسکتا ہے۔ جواب دیا جائے گا کہ ادبی کتابوں کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں، فقط قابلِ اعتراض کتابیں ممنوع قرار دی گئی ہیں۔ تاہم قابلِ اعتراض کتابوں کی فہرست میں ایسی کئی ہیں جنھیں ہم سب احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:

'گلستاں' اور 'بوستاں' کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ ہندو بھی اس کے شیدا ہیں اور ہر فارسی پڑھنے والا ان سے آشنا ہونے پر مجبور ہے۔ صوفیوں میں بھی ان کا چلن ہے، حالاں کہ ان میں کہیں کہیں جنسی تعلقات پر بحث آجاتی ہے۔

بہارِ دانش میں عورتوں کی عیاری کا ذکر ہے۔ اس سے مصنّف کا منشا یہ ہے کہ مرد عورتوں کی ہوس میں برباد نہ ہوں۔ ماننا پڑے گا کہ کتاب میں فحش ابواب کی کمی نہیں۔ یہ بات کسی نے مصنّف سے بھی کہی تھی۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے تو قرآن کی اس آیت کی تفسیر لکھی ہے کہ: "عورتوں کے مکر کی تھاہ پانا مشکل ہے۔"

مثنوی نیرنگِ عشق میں ایک نوّاب زادے کے عشق و محبت

کی سرگزشت ہے۔ اس کے فحش ہونے میں کلام نہیں لیکن باوجود اس کے اُسے قبولِ عام حاصل ہے۔

جامی کی یوسف وزلیخا دراصل سورۂ یوسف کا شاعرانہ ترجمہ ہے۔ اس کے بعض حصے شہوت انگیز ہوں تو ہوں لیکن ہندستان میں یہ فسانہ از حد مقبول ہے۔

دیوانِ حافظ صوفیوں کی آنکھوں کا سُرمہ ہے اور ان کی مجلسوں میں اس کی غزلوں کی دھوم رہتی ہے۔ ان میں وہ حقیقت و معرفت کے چشمے اُبلتے دیکھتے ہیں۔ لیکن رنگین مزاج حافظ کے کلام میں حسن و عشق کی چاشنی ڈھونڈتے ہیں۔

بہرحال اجداد کا یہ وطیرہ ہمیں پسند نہیں کہ اخلاق کی تلقین حکایت و روایت کے پردے میں کی جائے کیوں کہ ان میں دل چسپی کے لیے محبت کی پٹ بھی شامل کی جاتی ہے۔ لیکن جب یہ دستور مسلمہ ہے تو حکومت سے ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کہ صرف کلیات جعفر زٹلی اور لذت النسا جیسی کتابیں موردِ عتاب ہیں یا مذکورہ کتابوں پر بھی تحدید عائد ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ کئی کتب فروشوں پر ان کتابوں کی اشاعت کے جرم میں جرمانے ہو چکے ہیں۔ ہم یہ ماننے کو تیار ہیں کہ ان دونوں کتابوں میں بداخلاقی کی جھلک ملتی ہے[1] اس کے باوجود اس باب میں حکومت کا رویہ یکساں نہیں ہے۔ لکھنؤ میں بہارِ عشق اور زہرِ عشق بیچنے والوں پر برائے نام ایک ایک رُپیہ جرمانہ

---

[1] اسے حُسنِ ظن سمجھنا چاہیے۔ مؤلف

ہوا۔ کلیاتِ جعفر زٹلی اور لذت النسا کی بکری پر لاہور، کرنال، سیال کوٹ، ملتان اور جہلم میں مختلف جرمانے وصول کیے گئے۔ زیادہ طول کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کون سی کتابیں قابلِ ضبطی ہیں تاکہ ہم حکومت کے احکام کی پابندی کر سکیں۔ ورنہ اس حیص بیص میں کاروبار کو ترقی دینا ہمارے بس کی بات نہیں"۔

اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ بھی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ 'فحشیات' کے حدود متعین کر دیے جائیں اور اس کا فیصلہ ایک کمیٹی کے سپرد کیا جائے۔ ایڈیٹر کا خیال ہے کہ اس مسئلے میں اہلِ ایشیا اور اہلِ یورپ کی آرا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مثال کے طور پر وہ ایک نئی نظم 'آئینۂ حسن' کا نام لیتا ہے جس میں شاعر نے کسی حسین عورت کا سراپا بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صنفِ سخن کے بعض حصوں کو ہر یورپین شاعر مکروہ سمجھے گا۔ ایڈیٹر کا خیال ہے کہ اس قسم کی لفظی موشگافی سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ادب قابلِ اعتراض ہے جو انسان کو قتل و غارت گری کی طرف رجوع کرتا ہے۔ سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیے لیکن نہ کوئی مصنف اور نہ کوئی اخبار نویس ادھر توجہ کرتا ہے۔

(۳)

حال ہی میں حکومتِ وقت نے ہندستانی پریس پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔ یعنی ہندستان، برما یا سیلون کے کسی اخبار کو

کوئی خبر بھیجنی ہو تو ڈاک کا محصول صرف چوتھائی دینا ہوگا۔

۱۸۷۴ء کے آغاز میں آگرہ و اودھ کے صوبوں میں اخباروں کی تعداد ۳۶ اور رسالوں کی ۹ تھی[1]

۱۸۷۳ء میں ہندستان و برما میں سب ملاکر ۴۷۸ اخبار نکلتے تھے۔ ان میں سے ۱۵۱ انگریزی میں ۲۵۵ دیسی زبانوں میں اور باقی نیم انگریزی نیم ہندستانی میں ہوتے تھے۔ بمبئی میں ۱۱۸، بنگال میں ۹۸، مدراس میں ۴۸، آگرہ و اودھ میں ۷۳، پنجاب میں ۱۴ اور راج پوتانے میں صرف ۴ اخبار شایع ہوتے تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان اخباروں سے کتنے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ہر اخبار کے خریدار سات سو آدمی ہیں تو ان کے جملہ خریدار تقریباً تین چار لاکھ ہوں گے۔ یوں کہیے کہ ملک کا ایک چھوٹا سا طبقہ اخبار بیں ہے اور اس میں بھی انگریزی پڑھنے والے یورپینوں اور ہندستانیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ہندستانی اخباروں میں سے اکثر کا حلقۂ اشاعت تو بہت محدود ہے۔

یہ رائے اخبار انجمن پنجاب کے ایڈیٹر کی ہے۔ اس کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اخباروں کی اشاعت اور اثر میں روزافزوں ترقی ہوتی جاتی ہے۔

اخبار 'پنجابی' (۲۵ اپریل ۱۸۷۴ء) میں بسواد کے نواب عمر علی خاں کا جو خط شایع ہوا ہے، وہ اس قدر مایوس کن نہیں۔ البتہ وہ یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہندستانی اخبار بینی کی اہمیت سے

---

[1] Allen's Indian Mail ۲۷ جولائی ۱۸۷۴ء

ناواقف ہیں اور اخبار پڑھتے بھی ہیں تو سنسنی خیز خبروں کی تلاش کے لیے۔ تاہم اخبار نویسی کی قدر بے اندازہ ہے۔ خیالات کو پھیلانے اور عوام کو دیس بہ دیس کے واقعات سے باخبر رکھنے کا اس سے بہتر ذریعہ نہیں۔ یہ گویا ایک کھڑکی ہے جسے کھول کر ہم ساری دُنیا کا نظارہ کر سکتے ہیں۔"

بدقسمتی سے یورپ کی طرح ہندستان کے اخباروں کو بھی بلا وجہ مین میخ نکالنے کی لت ہے۔ چناں چہ بمبئی کے کشف الاخبار نے مہاراجا بڑودا کو سخت سست سنائی ہے دراں حالے کہ مہاراجا اپنی رعایا کی بہبودی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ اسی طرح لارنس گزٹ نے ٹونک کے رئیس پر نکتہ چینی کی ہے۔ اخبار پنجابی میں کسی نے پریس سے اپیل کی ہے کہ وہ حب الوطنی سے کام لے اور امرا کو بے مقصد جدت پرستی کی طرف مائل کرنے کی بجائے ملکی خصوصیات کے تحفظ کی تلقین کرے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ میں ہر سال نئے اخباروں کا ذکر کرتا ہوں حالاں کہ یہ دعویٰ غلط ہوگا کہ میری فہرست مکمل ہوتی ہے۔ اس سال میں حسبِ ذیل جرائد کے نام گنانا چاہتا ہوں:۔

آفتاب پنجاب ۔ اب یہ بڑے سائز پر چھپنے لگا ہے اور یہ اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔

بال بودھنی استری جن کی پیاری۔ ہندی کا یہ ماہانہ رسالہ بنارس کے بابو ہرشش چندر نے نکالا ہے۔

حدیقۃ الاخبار بمبئی کا اخبار جس سے " اخبار عالم" میرٹھ نے

اپنے ۲۰ اگست ۱۸۷۴ء کے پرچے میں ایک طویل اور دل چسپ مضمون کو نقل کیا ہی۔

ہرش چندر چندرکا۔ یہ بابو صاحب موصوف کی ادبی کاوشوں کا ماہانہ آئینہ ہی۔ اس کے مضامین نہایت دل چسپ اور بلند پایہ ہوتے ہیں۔

جگت سماچار۔ ہفتے میں ایک بار میرٹھ سے شایع ہوتا ہی۔

کرناٹک پرکاش۔ جس کا ذکر ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۴ء کے میرٹھ گزٹ میں ہی۔

جے پور اخبار۔ ریاست کا پندرہ روزہ سرکاری گزٹ ہی۔

کایستھ سماچار پچھلے سال سے لکھنؤ سے مہینے میں دو مرتبہ شایع ہوتا ہی۔ اس کا پہلا پرچہ اکتوبر ۱۸۷۳ء میں شایع ہوا تھا۔ اس کا ایڈیٹر کایستھوں کی تاریخ لکھ رہا ہی اور اس نے ناظرین سے درخواست کی ہی کہ اس ضمن میں معلومات فراہم کریں۔ یہ "دھرم سبھا" کا جریدہ ہی۔ ہندستان کے کئی اخباروں نے اس کے بلند معیار کی تعریف کی ہی اور اس کی کئی اشاعتوں کے مضامین نقل کیے ہیں۔

سید حسین بلگرامی نے حیدرآباد سے مخزن الفوائد کے نام سے ماہانہ رسالہ نکالا ہی جس کا خاصا چرچا ہی۔

ناگری پرکاش۔ یہ میرٹھ کے اردو اخبار 'محبوب ہند' کا ہندی ایڈیشن ہی۔

نور الاخبار۔ جس کے اقتباسات اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ

میں شایع ہوتے رہتے ہیں اور دراج پوتانہ اخبار اور روزنامچہ کے علاوہ شمس النہار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کیوں کہ یہ کابل سے نکلتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر میرزا عبدالعلی ہیں۔

وکیل ہندستان۔ عیسائی اخبار ہے جو امرت سر سے نکلتا ہے۔ اس کے مدیر رجب علی ہیں جنھوں نے مذہب کے ساتھ اپنا لقب بھی بدل دیا ہے اور اب اپنے کو 'منشی' کی بجائے پادری لکھتے ہیں۔

یہاں مدراس کے ہفتے وار 'تعلیم الاخبار' کو نہ بھولنا چاہیے جس کے ۱۸۷۵ء تک کے نمبر میری نظر سے گزر چکے ہیں۔

کوہ نور (لاہور) کے ایڈیٹر نے ارادہ کیا ہے کہ اس اخبار کو چھوڑ کر کوئی اور جریدہ نکالیں جو حکومت کے اثر سے آزاد ہو تاکہ وہ بلا تکلف حکومت پر بھی تبصرہ کر سکیں۔

اخبار مفیدِ عام۔ ہر مہینے کی پہلی اور پندرہ تاریخ کو آگرہ سے تقریباً چھ سات سال سے شایع ہو رہا ہے۔ اس کی لکھائی چھپائی دونوں دیدہ زیب ہوتی ہیں۔ اس کی ادارت صوفی احمد خاں کے سپرد ہے جو نثر و نظم دونوں کے عمدہ نمونے جمع کرنے کا خاص التزام کرتے ہیں۔

آثار الاخیار کے ایڈیٹر سید سخاوت حسین ہیں جو کنز العلوم پریس کے مالک ہیں۔ دہلی اور الہ آباد دونوں سے نور الابصار نامی دو اخبار شایع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک کے ہندی ایڈیشن کا نام بدھی پرکاش ہے۔

اودھ اخبار کو اب بھی قبولِ عام حاصل ہے۔ ادارت میں

مولوی غلام محمد تپش کا نام اس کی ادبی خوبی کی ضمانت ہے۔

ہرش چندر پترکا کو بجا طور پر خاص و عام کی قدرافزائی حاصل ہے۔ بابو ہرش چندر بہ یک وقت نازک خیال شاعر اور نکتہ رس انشا پرداز ہیں۔ انگریزی نظم و نثر پر بھی انھیں قدرت حاصل ہے۔ ان کا رسالہ اس لحاظ سے بھی خوب ہے کہ اس میں قدیم ہندی شاعروں کے کلام کا انتخاب درج ہوتا ہے۔ یہ کلام اب صرف قلمی نسخوں تک محدود ہے۔ کئی مشہور عالم ان کے معاون ہیں۔ ایک تو بابو گدادھر سنگھ جنھوں نے ہندی میں سنسکرت رومان 'کادمبری' کو منتقل کیا ہے اور بابو گوکل چند جنھوں نے بنگالی ناول 'کپال کنڈلا' کا ترجمہ کیا ہے۔ منشی کاشی ناتھ نے علی گڑھ اخبار (۱۲ جون ۱۸۷۴ء) میں اس رسالے کی بڑی تعریف کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ نکتہ چینی بھی کی ہے کہ بابو ہرش چندر ایک طرف تو انگریزی کے استعمال کے مخالف ہیں۔ اور دوسری طرف خود اپنے مضامین میں انگریزی الفاظ اس کثرت سے لاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔

سیتا پور کی انجمن ترقیٔ تہذیب اپنے جلسوں کی ماہانہ روداد برابر شایع کرتی رہتی ہے۔

کلکتہ سے ایک نیا جریدہ (STUDENT) (اسٹوڈنٹ) کے نام سے نکلنے والا ہے۔ اشتہار میں یہ نہیں بتلایا گیا کہ اس کی زبان کیا ہوگی۔ اس میں تعلیمی مسائل پر بحث ہوا کرے گی۔

کلکتے سے 'ہنر اور پیشہ' کے نام سے ایک مفید اخبار جاری

اس کی قیمت بہت کم رکھی گئی ہے تاکہ اس کی اشاعت محدود نہ رہے
ہندستانی جرائد کے مضامین کے نفس یا معیار کے متعلق کوئی نئی بات نہیں کہنی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ اپنے سالانہ ریویو کا بیش تر مواد مجھے انھی جرائد میں ملتا ہے۔ اب میں چند قابلِ غور مضامین کا تھوڑا سا ذکر کرتا ہوں۔ اخبار انجمن پنجاب نے ان خطابات کا چرچا کیا ہے جو حکومت کی طرف سے ہندستانیوں کو ملنے لگے ہیں۔ اخبار پوچھتا ہے کہ یہ کیا ضرور ہے کہ لوگ صرف راے بہادر یا خان بہادر کہلائیں۔ آدمی کے منصب کے لحاظ سے خطاب میں تبدیلی کیوں نہ ہو چنانچہ مرزا علاء الدین احمد خاں صاحب بہادر نواب لوہارو کو فخر الدولہ کا خطاب اخبار کو عین پسند ہے۔ ایک دوسرے اخبار نویس کی راے ہے کہ ہر آدمی کو 'صاحب' نہ کہا جائے بلکہ یہ بھی ایک سرکاری خطاب قرار دیا جائے۔

گزشتہ سال میں نے اس جشن کا ذکر کیا تھا جو سید احمد خاں نے اپنے بیٹے کی انگلستان سے واپسی پر منعقد کیا تھا اور جس میں ہندستانی و فرنگی دونوں شریک تھے۔ میں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ اس قسم کے جلسے نہایت مفید ہیں کیوں کہ یہ دونوں قوموں کے افراد کو ایک دوسرے سے قریب لاتے اور انھیں ایک دوسرے سے واقف ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ اخبار پنجابی نے بھی یہی بات کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ انگریزوں اور ہندیوں میں آسانی سے ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ آگے چل کر

۱؎ پنجابی ۷ نومبر ۱۸۷۲ء

اخبار یہ راے ظاہر کرتا ہو کہ مسلمان اور عیسائی دونوں اہلِ کتاب ہیں اس لیے اُن کا میل جول آسان ہو۔ یہ قرینِ قیاس بھی ہو کیوں کہ عیسائیوں کی بہ نسبت مسلمانوں کو ہندووں سے زیادہ بُعد ہو۔ یہ ضروری ہو کہ ملک کے مختلف عناصر ایک دوسرے سے آشنا ہوں اور باہم ربط ضبط رکھیں۔ مقامِ مسرت ہو کہ ہندستانی اور یورپین ایک دوسرے کی تقریبوں میں خوشی خوشی شریک ہونے لگے ہیں۔ گو کہ ابھی بے تکلفی کی کمی ہو۔ اخبار اس لحاظ سے لاہور کے بھائی نند گوپال کو خاص طور پر قابلِ مبارک باد سمجھتا ہو جو اسی واحد مقصد سے مختلف قوموں کی مشترک مجلسیں منعقد کرتے ہیں جن میں طعام و تفریح کا انتظام کیا جاتا ہو اور ویسی ہی آزادی برتی جاتی ہو جیسی پیرس اور لندن میں۔ اخبار ہند کی راے ہو کہ اگر ہندستان کے دوسرے بڑے شہروں میں بھی کالے گورے اسی آزادی سے ملنے لگیں تو نتیجہ بڑا خوش گوار ہوگا۔

(۴)

پچھلے سال میں نے امید ظاہر کی تھی کہ بہت جلد ہگلی اور کلکتہ کے مدرسے دوبارہ کُھل جائیں گے اور ان کے علاوہ مسلمانوں کے نئے مدرسے بھی وجود میں آئیں گے۔ میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ ہگلی کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے ایک بہت بڑی جایداد وقف کی گئی ہو اور یہی بات اس قیاس کی وجہ تھی۔ اس سلسلے میں مجھے ایک ترجمہ ملا ہو جس میں اس واقعے سے متعلق جملہ اطلاعات

درج ہیں۔ شروع میں ایک سرکاری اشتہار کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے: "بنگال کے مسلمانوں کی تعلیمی ابتری کا گزشتہ گورنر جنرل لارڈ میو کو سخت احساس تھا۔ ۱۸۷۱ء میں انھوں نے اس مسئلے کو چھیڑا اور خواہش ظاہر کی کہ حاجی محمد محسن کے وقف کا بہترین استعمال کیا جائے تاکہ علم کے ہر شعبے میں مسلمان بھی وہی مرتبہ حاصل کر سکیں جس پر ہندو آج سرفراز ہیں۔ ان کی مرضی کے مطابق بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر جی۔ کیمپ بیل نے حکم صادر کیا کہ صوبے کے مشرقی اضلاع (جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے) کے اسکول میں عربی و فارسی کے استاد مقرر کیے جائیں۔ نیز حاجی محسن کے وقف کی آمدنی محض ہگلی کے مدرسے پر صرف نہ کی جائے بلکہ مسلمانوں کے دوسرے مدرسے بھی اس سے مستفید ہوں اور ان میں انگریزی کی تعلیم کا انتظام بھی کیا جائے۔ موجودہ گورنر جنرل لارڈ نارتھ بروک نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے پچاس ہزار روپے عنایت فرمائے ہیں۔ یہ طے پایا ہے کہ کلکتہ کے مدرسے کے نمونے پر ہگلی، ڈھاکہ، رنگ پور اور چاٹ گانو میں نئے مدرسے قائم کیے جائیں گے۔ ان اداروں میں فارسی، عربی و فقہ کی تعلیم دی جائے گی۔ لڑکوں کی رہایش کے لیے بورڈنگ ہاؤس بھی ہوگا اور ان میں نادار طلبا پر اخراجات کا بار نہ ہوگا۔

حکومتِ بنگال کے یہ احکام مسلمانوں میں مشتہر کیے جائیں گے تاکہ ان کے سربرآوردہ اصحاب اس تحریک کی رہنمائی کریں اور خاص طور پر اپنے غریب بھائیوں کو تعلیم کا راستہ دکھائیں۔ امید

ہے کہ مسلمانوں کا خوش حال طبقہ والے، درے تعلیمی اداروں کی مدد کرے گا تاکہ ان کی تعداد بڑھ سکے اور حاجی محمد محسن کی خواہش کے مطابق تعلیم کا انتظام کیا جا سکے"۔

اس فرمان کے ساتھ حسبِ ذیل تین احکام نتھی کیے گئے ہیں:۔

(۱) ہندی مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق تحقیقاتی کمیشن کی رپوٹ پر والئس رائے بہادر کا ارشاد۔

(۲) بنگال کے لیفٹننٹ گورنر کا فرمان کہ حاجی محمد محسن کے وقف کی آمدنی مسلمانوں کی تعلیم کے علاوہ اور کسی صیغے پر صرف نہ کی جائے۔

(۳) موصوف کا یہ فرمان کہ تین نئے کالج کھولے جائیں اور غریب مسلمانوں کے بچّوں کو تعلیم کی آسانی بہم پہنچائی جائے۔ ۱۳ صفحات کے کتابچے کے بیش تر حصّے میں یہی احکام نقل ہیں۔

شمال و مغرب کے صوبوں میں سرکاری اسکولوں کے ساتھ مدرسے بھی قائم کیے جائیں گے جن میں صرف فارسی و عربی کی تعلیم دی جائے گی اور اُن پر دس ہزار رُپے سالانہ صرف کیے جائیں گے۔

بوہروں کی جماعت میں تو یوں بھی مذہب کا بڑا غلو رہتا ہے۔ اب اس نے سورت میں عربی کا ایک مدرسہ کھولا ہے[1]

دسمبر کے آغاز میں پنجاب یونی ورسٹی میں مشرقی امتحانوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو لوگ کام یاب ہوتے انھیں سرکاری طور پر سنسکرت کے لیے پنڈت، عربی کے لیے مولوی اور فارسی اور

---

[1] علی گڑھ اخبار ۲ اکتوبر ۱۸۷۴ء

ہندستانی کے لیے منشی کی اسناد دی گئیں[1]

میجر ہول رائڈ لاہور میں ایک آرٹ اسکول قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس سے پنجاب کے تعلیمی نظام کی تکمیل بھی ہو جائے گی اور ملکی تمدن کو بڑا فائدہ ہوگا۔

راج کوٹ کے راج کمار کالج کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے۔ اس کے طلبا نے انگریزی زبان میں ایسی مہارت حاصل کی ہے کہ اس سال کی پہلی تاریخ کو انھوں نے شیکسپیر کے ڈرامے 'رچارڈ دوم' کو اسٹیج کیا اور ایسی کام یابی حاصل کی کہ ناظرین کے علاوہ مقامی اخباروں نے بھی بڑی داد دی۔

سالِ گزشتہ ۲۹ نومبر کو پٹیالہ میں محکمۂ تعلیم کا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس مرتبہ بھی یہ جلسہ بارہ دری میں ہوا جہاں شان دار شامیانے نصب تھے۔ ریاست کے مخصوص امرا و حکام کرسیوں پر فروکش تھے اور خوش نما چاندنی پر طلبا زانوے ادب تہ کیے بیٹھے تھے۔ سب لوگوں کے آجانے کے بعد مہاراجا کا جلوس وارد ہوا اور توپوں سے ان کی سلامی اُتاری۔ وزیرِ اعظم نے جو رپوٹ پڑھ کر سنائی اس کا خلاصہ ایک اخبار نے ان الفاظ میں کیا ہے[2]:

" پٹیالہ کالج اور اس کے اسکولوں کے سالانہ امتحان میں جو طلبا کام یاب ہوتے ہیں، اُن کی ہمت افزائی کے لیے انعام تقسیم کرنے

[1] Allen's Indian Mail ۱۱ مئی ۱۸۷۰ء

[2] اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ یکم جنوری ۱۸۷۰ء

تیسری مرتبہ مہاراجا بہادر بہ نفسِ نفیس تشریف لاتے ہیں اور یہ امر تعلیم و طلبا سے ان کے شغف کا بین ثبوت ہے۔"

"اگر یہ یاد رکھا جائے کہ اس محکمے کی عمر صرف چار سال ہے تو ہم اپنی ترقی پر جتنا بھی فخر کریں، بجا ہے۔"

اس کے بعد رپوٹ میں کالج اور اس سے وابستہ دس مڈل اور ۳۷ ابتدائی اسکول کا تفصیلی حال بیان کیا گیا ہے۔ والیِ ملک کی مرضی سے کالج کا نصاب لاہور و دہلی کے مطابق رکھا گیا ہے تاکہ یہاں کے طلبا کلکتہ یونی ورسٹی کے اعلا امتحانات میں شریک ہو سکیں۔

"آیندہ کالج میں یہ پانچ زبانیں پڑھائی جائیں گی: انگریزی، اُردو، فارسی، عربی اور سنسکرت۔ جملہ مضامین اُردو زبان میں پڑھائے جائیں گے۔ چوں کہ فارسی و عربی میں استعداد حاصل کیے بغیر اُردو میں معقول صلاحیت پیدا کرنا ناممکن ہے، لہٰذا ان دونوں زبانوں کی تعلیم کا انتظام بھی ضروری تھا۔ انگریزی کو لازمی اور سنسکرت کو اختیاری مضمون قرار دیا گیا ہے۔ نصاب کی ضروری کتابیں یہیں تیار ہوں گی اور سرکاری چھاپے خانے میں طبع ہوں گی۔

مہاراجا کی فرمایش پر آج سے تین سال پہلے منشی نول کشور نے پٹیالہ میں ایک پریس قائم کیا تھا جس میں اُسی زمانے سے پٹیالہ اخبار چھپتا ہے۔ ریاست کی طرف سے اخبار کی ۱۴۰ کاپیاں مدرسوں و دفتروں میں تقسیم کی غرض سے خریدی جاتی ہیں۔ اخبار

کے مالک سے دربار کا جو معاہدہ ہے اس کی رُو سے پرچے میں ایک ضمیمہ سرکاری اطلاعات کا جوڑ دیا جاتا ہے۔ بقیہ صفحات میں یا تو باہر کے مضامین ہوتے ہیں یا مدیر خود اصلاحی مقالات قلم بند کرتا ہے۔

مذکورہ رپوٹ کو گوش گزار کرنے کے بعد مہاراجا نے ہندستانی میں ایک تقریر فرمائی جسے سامعین نے مؤدب کھڑے ہوکر سنا۔ صوبۂ پنجاب کے کمشنر مسٹر پرنسپ نے یورپین حاضرین کی خاطر ارشادِ اعلا کا خلاصہ اپنی زبان میں سنایا۔ بعدازآں اسناد اور انعامات تقسیم ہوتے اور جلسہ برخاست ہوگیا۔

گزشتہ مارچ میں بنارس کالج میں تقسیمِ انعامات کی غرض سے اسی قسم کی ایک تقریب ہوئی تھی۔ جس کے صدر صوبے کے لیفٹننٹ گورنر صاحب تھے۔ ان کی داہنی جانب بنارس کے مہاراجا بیٹھے ہوئے تھے۔ شعبۂ تعلیم کے ناظم مسٹر کیمپسن صاحب صدر کی اعانت کے لیے موجود تھے۔ کالج پرنسپل مسٹر گرفتھ جنھوں نے راماین کا منظوم ترجمہ انگریزی میں کیا ہے، وہیں تھے۔ سر ولیم میور نے دیگر انعامات کے علاوہ ایک پروفیسر کو ہندی میں حساب پر ایک کتاب لکھنے کے صلے میں ہزار رُپے کی تھیلی دی۔ اس کتاب میں جدید نظریوں پر بحث ہے اور ہندی میں علمی اصطلاحات کی فہرست بھی درج کی گئی ہے۔ ایک دوسرے پروفیسر کو بھی اسی قدر رقم علمِ مثلث پر ایک کتاب لکھنے کے عوض عطا کی گئی۔

مہاراجا بنارس نے (جن کے اجداد نے کالج کی داغ بیل

رکھی تھی) ہندستانی میں ایک تقریر کی جس کا جواب سر ولیم میور نے اسی زبان میں دیا کیوں کہ اس پر انھیں کامل عبور حاصل ہے۔[۱]

مہاراجا جے پور کو جدید علوم سے خاص شغف ہے اور ہمیشہ ان کی اشاعت کے فکر میں رہتے ہیں۔ یہ بات ان میں اور ان کے جدِ امجد راجا جے سنگھ میں مشترک ہے جنھوں نے مغلوں کے عہد میں علمِ ہیئت کی بڑی خدمت انجام دی تھی۔ انھوں نے جو مختلف رصد گاہیں بنائی تھیں، ان میں سے ایک 'مان مندر' کے نام سے بنارس میں ہے۔ موجودہ مہاراجا نے اس کی ترمیم کے لیے دو لاکھ رُپے کی منظوری دی ہے۔[۲]

والیِ کشمیر کی طرح شہزادۂ ٹراونکور کو بھی سنسکرت زبان سے عشق ہے۔ وہ خود مدراس یونی ورسٹی کے طالبِ علم تھے اور ادبی و اخلاقی مسائل پر اکثر تقریر فرمایا کرتے ہیں۔ تعلیمِ عامّہ کے فوائد پر انھوں نے حال ہی میں ایک تقریر کی تھی۔ عیسائی نہ ہونے کے باوجود کنور صاحب پادریوں کو شرفِ باریابی بخشتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یورپ کے اخلاق کی اصلاح میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ تاہم پردیس کے اخباروں کے مطالعے نے ان پر یہ بھرم کھول دیا ہے کہ یورپ میں ہندستان سے کم جرائم نہیں ہوتے۔ ان کی رائے میں دونوں خطّوں کے متوسط طبقوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ البتہ عیسائیوں میں سے پست طبقے

---

[۱] علی گڑھ اخبار، ۲۰ مارچ ۱۸۷۴ء

[۲] Allen's Indian Mail ۱۰ فروری ۱۸۷۴ء

کے علاوہ — بداخلاقی کی ہمت افزائی نہیں ہوئی۔ یورپ میں کسی کو آسانی سے 'جھوٹا' نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن ہندستان میں کئی بُری باتوں سے چشم پوشی برتی جاتی ہے۔ ان بُرائیوں کا واحد علاج تعلیم ہے لیکن تا ایں دم کالجوں کا کوئی خاص اثر عام اخلاق پر نہیں ہوا۔ کنور صاحب کو خوب معلوم ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے بہت پہلے شاستروں نے اخلاق کی طرف توجہ کی تھی۔ لیکن انھوں نے ضروری باتوں کے ساتھ فروعات کو بھی اتنی اہمیت دی کہ سارا کیا دھرا بے کار ہوگیا۔ مثلاً شاستر میں کہا ہے کہ جھوٹ بولنے والا دوزخ کی آگ میں جلے گا۔ لیکن پیاز کھانے کی بھی یہی سزا تجویز کی گئی ہے۔ تاہم کنور صاحب کا خیال ہے کہ دونوں علاقوں میں کسی کو ترجیح نہیں دی جاسکتی کیوں کہ بہرحال تان سزا وجزا پر ہی ٹوٹتی ہے۔ دونوں مانتے ہیں کہ انسان کے عمل پر خدائے بزرگ کی نگاہ ہے اور قیامت کے روز سب کے حُسن و قبح کی جانچ ہوگی۔ جب عوام ان بنیادی اصولوں کو سمجھنے لگیں گے تو ان کا اخلاق خود بہ خود سُدھر جائے گا۔ ان اصولوں کی بنیاد عیسوی مذہب پر ہوگی۔ یہ سب باتیں کنور صاحب نے مدراس یونی ورسٹی کے ایک جلسے میں کہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے علمِ تاریخ کی اہمیت پر زور دیا اور بتلایا کہ مشاہیر کی تقلید اندھا دُھند نہ ہونی چاہیے کیوں کہ ان میں بھی خامیاں ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے نیپولین کا نام لیا جو مصر میں جھوٹ موٹ مسلمان بن گیا اور دھوکے سے (ENGHIEN) کے ڈیوک کو قتل کرا دیا۔

انجمنِ پنجاب نے (جس کا رُکن ہونے کی عزت مجھے بھی حاصل ہی) گزشتہ دسمبر میں سید احمد خاں کے اعزاز میں ایک شان دار جلسہ کیا۔ ساتھ ان کے بیٹے سید محمود بھی تھے۔ شدید مخالفت کے باوجود سید صاحب کو ہمیشہ یہی دُھن ہی کہ مسلمانوں کا کوئی مرکزی دارالعلوم قائم ہو جائے[1]۔

سب سے پہلے محمد حیات خاں نے انجمن کی طرف سے سید صاحب اور ان کے فرزند کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے مسلمانوں کی بہبودی کی خاطر لاہور تک کا طولانی سفر اختیار کیا۔ اس کے بعد ایڈرس پڑھا گیا جس کا جواب سید صاحب نے اُردو میں دیا۔ لیکن سید محمود نے انگریزی میں ایسی دھنواں دھار تقریر کی کہ سب انگشت بہ دنداں رہ گئے اور تمام اخباروں میں اس کا چرچا ہوا۔ بعد ازاں انجمن کے سکریٹری بابو نوبین چندر رائے نے ہندستانی میں جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہی:-

"میں یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ پہلے میں مسلمانوں کے لیے الگ کالج بنانے کے حق میں نہ تھا۔ اب میں نے اپنی رائے بدل دی ہی۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ اس قسم کے ادارے کے قیام سے کہیں فرقہ وارانہ اختلاف بڑھ نہ جائے۔ لیکن آپ کی تقریر سننے

---

[1] ان مخالفوں میں حاجی علی بخش خاں بھی ہیں جنھوں نے "تائید الاسلام" کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا ہی۔ لیکن سید صاحب نے تہذیب الاخبار میں اس کا دنداں شکن جواب دیا ہی اور نہایت عالمانہ پیرائے میں اسلام کے بنیادی اصولوں کی توضیح کی ہی۔

کے بعد مجھے اپنی غلطی محسوس ہوئی۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے تخیل کا جو بلند ایوان بنایا ہے، ہندو اس سے الگ ہوں گے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ ملک جہاں اختلافات کی گھما گھمی ہے، ایسے اداروں سے مستفید ہوتا جن میں اتحاد کا سبق پڑھایا جاتا ہو۔ جب تک ہندو، مسلمان اور عیسائی اپنے قدیمی کٹرپن کو چھوڑ کر باہمی بھائی چارے سے کام لینا نہ سیکھیں گے، اس ملک کی ترقی قطعاً ناممکن ہے۔"

اس کے جواب میں حیات خاں صاحب نے وضاحت سے بتلایا کہ سید صاحب کتنے لبرل اصول پر اپنے کالج کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خاص مقصد تو یہ ہے کہ سرکاری مدرسوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اسے اسلامی نقطۂ نظر سے تکمیل دیں۔ چناں چہ دینیات کی تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے گا اور اس شعبے کے دو صیغے سُنّی و شیعہ طلبا کے لیے ہوں گے۔ یہ امر سید صاحب کی وسیع النظری کا ثبوت ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی قوم دینی و دنیوی تعلیم میں یکساں ترقی حاصل کرے تاکہ وہ پہلے کی طرح دنیائے علم و فضل میں بلند رُتبہ حاصل کر سکے۔ کالج کے نصاب کی تفصیل میں میں نہیں جانا چاہتا۔ البتہ زبانوں کے معاملے میں کہہ دوں کہ صرف اُردو، فارسی یا عربی ہی نہیں بلکہ انگریزی، یونانی اور لاطینی پڑھانے کا بھی انتظام ہوگا۔

آخر میں حیات خاں صاحب نے امید ظاہر کی کہ ہندو بھی اپنے لیے اسی طرز کا کالج قائم کریں گے۔" اس امر سے ہمیں اتنی خوشی ہوگی کہ ہم آسمان کی طرف بہ یک وقت دونوں ہاتھ اُٹھا

سکیں گے۔[۱]

اس دوران میں حکومتِ ہند نے سید صاحب کو کالج کی تعمیر کے لیے علی گڑھ میں وسیع اراضی عطا کی ہے۔ رام پور کے نواب کلب علی خاں نے بھی ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا ہے اور پندرہ ہزار کی یک مشت رقم کے علاوہ عربی و دینیات کی تعلیم کے لیے ۱۲سو رُپے سالانہ آمدنی کی جاگیر دی ہے۔ نواب صاحب نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ وائس رائے بہادر سے کالج کا سنگِ بنیاد رکھوانے کی رسم میں جو مصارف ہوں گے، وہ اپنی ذات سے ادا کریں گے۔ یوں سمجھیے کہ سب ملا کر ان کی طرف سے پچاس ہزار رُپے دیے گئے ہیں۔ یہ عطیہ در اصل ان کے شایانِ شان ہے۔

صوبۂ اودھ کے نئے گورنر جنرل سر جون اسٹریچی نے کالج کی اسکیم سے اپنی دل چسپی کے ثبوت میں ہزار رُپے کی رقم پیش کی ہے۔

بمبئی کے مسلمان بھی اپنے شہر میں اسلامیہ کالج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس تحریک کے پیشوا شیخ احمد ہیں۔ ان کے والد تحفۂ الفنسٹن نامی ہندستانی گرامر اور دوسری کتابوں کے مصنف محمد ابراہیم مقبہ ہیں۔ کوشش یہ ہے کہ علی گڑھ کالج کے قیام کے ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی سنگِ بنیاد رکھا جائے۔ سب مسلمان اس تجویز کی تائید کر رہے ہیں اور حال ہی میں اس پر غور کرنے کے لیے ایک جلسہ ہوا تھا۔[۲]

---

[۱] پنجابی ۱۴ مارچ ۱۸۷۶ء

[۲] پنجابی ۱۶ مئی ۱۸۷۶ء

جالندھر میں مسلمانوں کا کالج بن چکا ہے اور امرت سر کا کالج تو شاہ راہِ ترقی پر گام زن ہے جیسا کہ سالانہ امتحان کے شان دار نتائج سے ظاہر ہے۔

سالِ گزشتہ میں کلکتہ یونی ورسٹی کے امتحانات میں ۲۵۴۵ طلبا شریک ہوئے۔ ان میں سے ۳۴۸ کام یاب ہوئے۔ بی۔ اے کے پہلے امتحان میں ۵۳۹ میں سے ۳۰۱ کو کام یابی ملی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس یونی ورسٹی کو طالبات کے داخلے کا بھی انتظام کرنا چاہیے تاکہ وہ بھی تعلیم کی برکتوں سے مستفید ہوسکیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا پردہ نشین خواتین مردوں کے تیار کردہ نصاب کے مطابق امتحان پاس کرنے کے لیے آمادہ ہوں گی؟[1] انھیں یہ کہیں زیادہ پسند ہوگا کہ ستار بجائیں اور اب تو انھیں اسے سیکھنے میں زیادہ آسانی ہوگی کیوں کہ میرٹھ سے اُردو میں 'معلم الستار' نامی کتاب شایع ہورہی ہے[2]۔

بمبئی میں ۱۰۲۵ طلبا میں سے صرف ۳۵۵ کو کام یابی نصیب ہوئی۔

یہ ضروری ہے کہ انڈین سول سروس اور کمپنی کی اسامیوں کے لیے جو امتحانات ہوتے ہیں، وہ قدرے آسان ہوجائیں۔ کیوں کہ فی الحال دو سال کی قلیل مدت میں امیدواروں کو یورپ و ایشیا کی قدیم و جدید زبانوں کے علاوہ تاریخِ عالم، ریاضی اور

۱؎ Allen's Indian Mail ۹ جنوری ۱۸۷۰ء

۲؎ اخبارِ عالم میرٹھ ۲۰ اگست ۱۸۶۹ء

دیگر علوم کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔

حال ہی میں لندن میں علوم مشرقیہ کی کانگریس ہوئی تھی۔ اس میں لندن کے ہندستانی میوزیم کے نگراں ڈاکٹر FORBES WATSON نے ایک پُرمغز مقالہ پڑھا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انڈیا ہاؤس کے کتب خانے (جو دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا) سے ایک ایسا ادارہ منسلک ہونا چاہیے جو ہندستان کے متعلق جملہ معلومات فراہم کرے۔ اس ملک کی تاریخ و جغرافیہ، رسوم و آئین، حرفت و زراعت غرض کہ ہر شعبۂ زندگی کا حال وہاں معلوم ہو سکے۔ اس قسم کے ادارے کی اہمیت ظاہر ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ایشیاٹک سوسائٹی یا یورپیوں نے دونوں ملکوں میں جو رابطہ قائم کیا ہے اس کی کوئی حقیقت اس قسم کے ادارے کے آگے نہیں۔ امید ہے کہ حکومتِ برطانیہ اس تجویز کو فوراً عملی جامہ پہنائے گی۔

انجمنِ پنجاب کے سکریٹری بابو نوین چندر یورپ جا رہے ہیں۔ ان کی جگہ برکت علی خاں لیں گے۔ بابو صاحب کی خدمات کے صلے میں انجمن کی طرف سے ایک ایڈریس دیا جائے گا جس کے ساتھ ایک تمغہ بھی پیش کیا جائے گا۔ ایڈریس کے مسودے اور تمغے کی عبارت پیارے لال تیار کریں گے اور انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ کیا جائے گا۔[1]

اخبار پنجابی نے انجمن کی کارگزاری کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ ہمیشہ سے علم و ادب کی ترقی میں کوشاں رہی ہے۔

---

[1] اخبار انجمن پنجاب ۲۶ دسمبر ۱۸۷۴ء

اور اس کے نئے ناظم برکت علی ملک و قوم کے سچے بہی خواہ ہیں۔ انجمنِ پنجاب جیسے ادارے کے لیے ایسے ہی بیدار مغز ناظم کی ضرورت ہے۔

علی گڑھ سوسائٹی کے سکریٹری راجا جے کشن بہادر کا تبادلہ الہ آباد ہو گیا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں جب سید احمد خاں نے کرسیِ نظامت خالی کی تو موصوف ان کی جگہ اس منصب پر منتخب ہوئے اور اپنے فرائض ایسی قابلیت سے انجام دیے کہ اب انھیں سوسائٹی کا آنریری صدر نامزد کیا گیا ہے۔ سکریٹری کے عہدے کے لیے مولوی محمد سمیع اللہ خاں کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔

انجمنِ ترقیِ قومِ ہنود Hindu National Improvement Society کے صدر راجا صاحب ٹاٹور ہیں۔ حسبِ دستور یہ انجمن ہندوؤں کی ذہنی، لسانی و اخلاقی ترقی کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ انگریزی سے ہندستانی زبانوں میں مذہبی کتابیں منتقل کرے اور دوسرا یہ کہ یتیم خانوں اور صنعتی مدارس کو مدد بہم پہنچائے۔[1]

انجمن دہلی ۱۸۶۵ء میں وجود میں آئی تھی۔ اب اس کے سکریٹری منشی تارا چند ہیں۔ ان سے پہلے پیارے لال تھے جو اب پٹیالہ کے محکمۂ تعلیم کے ناظم ہیں۔ شاہانِ مغلیہ کی قدیم راج دھانی کے خواص اس انجمن کے ارکان میں ہیں۔ اس کے جلسوں میں اکثر دل چسپ مقالے پڑھے جاتے ہیں جن پر بصیرت افروز مباحثے

---

[1] Journal of the National Indian Association ، ۱۰ مئی ۱۸۷۱ء

ہوتے ہیں اور پھر اِن کا خلاصہ انجمن کے ماہ نامے میں شایع ہوتا
پچھلے سال کے ماہِ ستمبر میں مظفر پور کی علمی وادبی انجمن
شاخ پٹنہ میں سید وزیر علی خاں کی صدارت میں قائم ہوئی۔ ا
کے دوامی ناظم مولوی سید امداد علی خاں ہیں۔ جنھوں نے ہندستا
میں متعدد کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کے نائب حافظ سید احمد ر
ہیں جنھوں نے انجمن کے پہلے جلسے میں ایک پُر جوش تقر
کی۔ 'اخبار الاخیار' نے اسے اپنے شمارۂ یکم اکتوبر ۳۷ء
چھاپا ہی۔ بہار سوسائٹی کا سالانہ جلسہ گیا میں گزشتہ ۲۸ اگست
ہوا تھا۔ اس کی صدارت وہاں کے مجسٹریٹ M.E.GREY صا
نے کی تھی۔

گجرانوالہ میں انجمن فیضانِ عام کی داغ بیل رکھی گئی ہی۔ ا
کے مہتم ڈاکٹر جی سنگھ ہیں اور ارکان میں شہر کے رؤسا و علماشا
ہیں۔ اسی شہر میں انجمنِ اسلامیہ بھی وجود میں آئی ہی جس کا
مقصد مسلمانوں کی مذہبی تعلیم پر زور دینا ہی۔ اس کے سکریٹر
کی راے ہی کہ سرکاری مدرسوں اور کالجوں میں دینیات کا
ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی مدرسوں کو ازسرِنو تقو
پہنچانی چاہیے۔

دہلی کے مضافات میں ایک مقام عرب سراے ہی۔ یہ
بھی ایک انجمن ہی۔ یہ چھوٹی سی سہی لیکن دوسری علمی انجمنوں سے
کسی طرح کم اہم نہیں۔ یہ ایک ماہانہ رسالہ شایع کرتی ہی جو ا
آزادیِ راے کے لیے مشہور ہی۔ اس کی نگرانی میں کئی کتابیں

یا ترجمہ ہو چکی ہیں۔ یہ سب اس کے سکریٹری لالہ فقیر چند کا فیض ہے جن کی قابلیت اور خلوص سب پر عیاں ہے۔ اپنے رسالے میں انھوں نے کئی قابلِ ذکر مضامین لکھے ہیں ان میں سے ایک اُردو شاعری پر ہے، دوسرا پیچیدہ عبارت آرائی کے خلاف، تیسرا القاب کے بے کار طول پر اور چوتھا انگریزی الفاظ کی بھرمار پر[1]

پشاور شہر اور گرد و نواح کے شرفا نے ایک انجمن اس غرض سے بنائی ہے کہ اس دور افتادہ علاقے میں علم کی روشنی پھیلے اور اخلاق کی جوت اس طرح جگمگائے کہ فرسودہ و قبیح رسوم کا قلع قمع ہو جائے۔ سرحد کے جو لوگ اب بھی نیم وحشیوں کی طرح رہتے اور لوٹ مار پر گزارہ کرتے ہیں، یہ ادارہ ان کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کرے گا۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس کا کام اتنا علمی نہیں جتنا اصلاحی ہے۔ اس میں ہندوؤں کا عنصر زیادہ ہے اور سبھی عہدے دار ہندو ہیں۔ نائب صدر لالہ دُرگا پرشاد ہیں جو اُردو کے مشہور شاعر ہیں اور شاد تخلص کرتے ہیں۔ اس انجمن کے کارکنوں میں جوش کی کمی نہیں اور یقین ہے کہ فلاحِ عام کے لیے ان کی کوششیں کامیاب ہوں گی۔ طوائفوں کی نگرانی کے لیے جو قوانین موجود ہیں ان کے متعلق انجمن پولیس سے گفتگو کر رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک تھیٹر کے قیام کی اسکیم پر بھی تبادلۂ خیال ہو رہا ہے۔ اس نے ایک عرض داشت بچّوں کے متعلق پیش کی ہے جنھیں ٹھیک سے کپڑے تو پہنائے نہیں جاتے لیکن زیور اتنے لاد دیے جاتے ہیں کہ بدمعاش ان کی

---

[1] سنہ ۱۸۷۲ء، اا اپریل ۱۸۷۲ء

جان کے لاگو بن جاتے ہیں۔ انجمن نے یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ پارچہ بافی کے لیے ولایت سے مشینیں لائی جائیں اور دقیانوسی کرگھوں کا پیچھا چھوڑا جائے تاکہ کپڑے کم دام میں آسانی سے بن سکیں۔ ان مفید مشوروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انجمن کو مادی و اخلاقی دونوں رُخوں کا خیال ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ اسے شعر و شاعری کا ذوق نہیں کیوں کہ اُس کے ایک حالیہ جلسے میں کسی نے اُردو کی نظم سُنائی تھی۔[1]

بنارس میں سوادھرم سبھا یا انڈین سنسکرت ایسوسی ایشن کا وجود ظہور میں آیا ہے۔ برسبیلِ تذکرہ اس کا ذکر آگیا ورنہ اس کا تعلق محض سنسکرت زبان سے ہوگا۔ اس کے صدر منشی منگل سین اور سکریٹری راجا جے کشن داس ہوں گے۔[2] پہلے یہ علی گڑھ سوسائٹی کے سکریٹری تھے۔ الہ آباد میں انھوں نے اس سبھا کا ابتدائی جلسہ کیا تھا جس میں یہ مسئلہ زیرِ غور تھا کہ سنسکرت کی تعلیم کے لیے آریہ کالج کے نام سے ویسا ہی ادارہ قائم کیا جائے جیسا کہ بریلی میں بن چکا ہے۔

ایسی تحریکوں کا مقصد اتنا علمی نہیں جتنا مذہبی ہے۔ ہندوؤں میں مسلمانوں کی دیکھا دیکھی مذہبی جوش پیدا ہوا ہے جو اب تک یورپین تعلیم کے غبار میں چھپا ہوا تھا۔ مسلمانوں میں خاص طور پر سید احمد خاں کی کوششوں سے جو جاگ پڑ گئی ہے اس نے

---

[1] اخبار انجمن پنجاب ۲۳ اکتوبر ۱۸۷۲ء

[2] علی گڑھ اخبار کے مطابق راجا صاحب موصوف اس کے ناظم نہیں بلکہ صدر منتخب ہوتے ہیں۔

ہندوؤں کو بھی خوابِ خرگوش سے جگایا ہی اور وہ ان خیالات پر عمل کرنا چاہتے ہیں جن کا اظہار ایک خط میں ہوا تھا جسے میں سالِ گزشتہ کے مقالے میں درج کر چکا ہوں۔

سنسکرت زبان وانشا کی ترویج کے لیے بلند شہر میں بھی ایک کمیٹی بنی ہی۔ پچھلی ۱۰ فروری کو اس کا جو جلسہ ہوا اس میں کئی لوگوں نے چندے دیے۔

اُدھر بسوان کے ٹھاکر گرپرشاد نے اپنے صدر مقام میں سنسکرت کا اسکول کھول رکھا ہی۔ یورپ میں اس پُرانی زبان کا جو چرچا ہوا ہی اس سے ہندوؤں میں بڑا شوق پیدا ہو گیا ہی اور اب اپنے دیس میں بھی اسے چلن دینے کے جتن کر رہے ہیں۔ جو طبقہ اس تحریک کی رہ بری کر رہا ہی اس کے اثر کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کوشش کام یاب ہو جائے تو عجب نہیں۔ بہت ممکن ہی کہ مسلمانوں کے مجوّزہ کالج کے وزن پر وہ بھی ایک مرکزی ہندو کالج کی پیروی کریں۔

پچھلے سال کی آخری تاریخ کو آگرہ کی 'انجمن آثارِ قدیمہ' کا جلسہ ہوا۔ اس کا مقصد یہ ہی کہ خصوصاً راج پوتانے کی قدیم عمارتوں کی تحقیق کرے تاکہ تاریخ کے دُھندلے نقوش صاف ہو سکیں۔ قلمی کتابوں کی تلاش اس کا دُوسرا مقصد ہی[1]

اگر ان کی نظر زمانۂ حال کی تاریخی عمارتوں پر بھی پڑے تو بڑا اچھا ہو۔ اس سلسلے میں مجھے ٹیپو سلطان کے محل "دریِ دولت"

---

[1] اخبارِ عالم میرٹھ ۱۵ جنوری

کا خیال آتا ہے۔ یہ محل میسور کی راج دھانی سرنگا پٹم میں بنا ہوا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک ہندستانی اخبار نویس لکھتا ہے:[1]

"جب ٹیپو اور انگریزوں میں لڑائی چھڑی ہوئی تھی تو بہت سے قیدی اس کے ہاتھ لگے۔ سلطان نے انھیں حکم دیا کہ محل کی دیواروں پر ایسے نقش و نگار بنائیں جو اس کے لیے دل چسپی کا موجب ہوں۔ لیکن قدرت خدا کی کہ ایک روز ٹیپو کو شکست ہوئی اور اسے سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ گورنر جنرل نامزد ہونے کے بعد لارڈ ولزلی نے محل کی مرمت کے لیے ایک لاکھ روپے کی رقم علاحدہ کی۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہندستانی آرٹ کا یہ نادر نمونہ کس مپرسی کی حالت میں ہے اور اتنا شکستہ ہو چکا ہے کہ اگر جلد اس کی خبر نہ لی گئی تو بالکل نابود ہو جائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس عمارت کی حفاظت سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو لارڈ ولزلی کی یادگار قائم رہے گی دوسرے جو بھی محل کے در و دیوار اور تصاویر کو دیکھے گا اسے عبرت ہوگی کہ تکبر کی سزا تنزل ہے۔ علاوہ بر ایں یہ میسور کی عمارت سازی کا عجیب و غریب نمونہ ہے جسے زندہ رہنا چاہیے۔"

اُدھر "برہمو سماج" کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ بہتیرے شریف و معزز لوگ اس کے عقائد پر ایمان لاتے جاتے ہیں۔ ان میں بیتیا کے مہاراج کمار بھی ہیں۔ سماج کی پوجا میں صرف ایک مرتبہ شریک ہو کر وہ اتنے متاثر ہوئے کہ اس کے

---

[1] پنجابی ۲۰ فروری ۱۸۷۲ء

زمرے میں شامل ہو گئے۔ جاورا راج کے وزیر سماج کے زبردست مبلغ ہیں اور خاص طور پر دہلی و بنگلور میں سماج کا بڑا چرچا ہے۔ اس کامیابی سے بابو کیشب چندر سین کا دل بڑھ گیا ہے اور وہ ملک بھر میں دؤرہ کر کے اپنے مت کا پرچار کر رہے ہیں۔ ان کے خطبوں کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔ اس لیے امرت سرو غیرہ میں انھوں نے حال میں جو کچھ کہا ہے اسے دُہرانا نہیں چاہتا۔

گزشتہ ۱۲ دسمبر کو الہ آباد میں برہمو سماج کے قیام کی سال گرہ منائی گئی۔ پوجا گھر میں پھولوں کے ہار مہک رہے تھے، فضا منتروں کے جاپ سے گونج رہی تھی اور بھکاری جو دُور دُور سے آئے تھے ہنٹی گرم کر کے مگن ہو رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے عیسوی مذہب کا ایک ایسا فرقہ سمجھنا چاہیے جو عیسیٰؑ کا نام لیے بغیر راہِ راست کی طرف لے جاتا ہے۔[۱] کم از کم پادری وائسی (VOYSEY) کا تو یہی خیال ہے کیوں کہ ایک اتوار کو انھوں نے بابو کیشب چندر سین کے نمایندے پرتاپ چندر کو اپنے گرجا گھر میں تقریر کرنے کی اجازت دی بلکہ پادری صاحب نے ایسی اعلا ظرفی کا ثبوت دیا کہ اپنے خطبے میں عیسیٰؑ کا نام تک نہ آنے دیا اور موقع کے لحاظ سے نہایت مناسب باتیں کہیں۔[۲] یہ وہی پرتاپ چندر ہیں جنھوں نے مینچسٹر (انگلستان) کے ایک کلیسا میں انجیل کے ایک موضوع کو لے کر تقریر کی تھی۔ اس کے

---

[۱] کوی دچن سُدھا ۲۶ جنوری ۱۸۷۴ء

[۲] Indian Mail ۲۴ اگست ۱۸۷۴ء

دوران میں انھوں نے کہا تھا کہ ابتدا میں ہندو توحید پرست تھے اور برہمو سماج کا مقصد اسی تعلیم کی تجدید اور جہالت و اوہام کا انسداد ہے۔

اسی شہر مینچسٹر میں سال رواں کے اوائل مارچ میں نیشنل انڈین ایسوسی ایشن National Indian Association کا عام جلسہ ہوا۔ اس کی بانی Miss Mary Carpentter کے علاوہ چار ہندستانی بھی شریکِ جلسہ تھے۔ حاضرین نے انجمن کے مقاصد کو سراہا اور اس تجویز پر صاد کیا کہ شہر میں اس کی شاخ قائم کی جائے جس کے صدر مسٹر Hugh Masson ہوں۔ ایسوسی ایشن کی سکریٹری Miss E. A. Manning ہیں جن کے سسٹر Ancient and Mediaeval India نامی کتاب کے نام ور مصنف ہیں۔

اسی زمانے میں لندن کے مشہور ڈاکٹر لائٹنر Leitner اور ان کی بیوی نے ہندستانی باشندوں کے اعزاز میں ایک دعوت دی جس میں وہ انگریز بھی مدعو تھے جو مشرقی چیزوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ دعوت میں امیرِ کابل کے بھتیجے شاہزادہ سکندر احمد بارک زئی، شاہ اودھ کے نمایندے کلب علی خاں، مس مینگ وغیرہ معززین بھی موجود تھے[۱]۔

اگر ہندستانیوں کو یورپینوں سے گھلنے ملنے کا موقع ملے تو انھیں بڑا فائدہ ہو۔ عربی زبان کی یہ کہاوت خوب ہے کہ سفر کو ظفر کا

---

[۱] Indian Mail ۲۴ اگست ۱۸۷۰ء

پہلا زینہ سمجھنا چاہیے۔

کچھ عرصہ پہلے لالہ بہاری لال نے لاہور میں توحید پرست ہندوؤں کی ایک منڈلی "ست سبھا" کے نام سے قائم کی تھی۔ اسے اپنے پیش رووں کی مذہبی اصلاح کے ساتھ علمی و ادبی ترقی کا بھی فکر ہے۔ سبھا کے کالج میں دیگر مضامین کے علاوہ دھرم کے اصول بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ سبھا کے بانی اور ان کے رفیقوں نے ان اصولوں کو بھجن کا روپ دیا ہے جسے طلبا بہ بانگِ دُہل گایا کرتے ہیں۔ یہ سب بھجن ہندی رسم خط میں "نبھوپتر" کے نام سے کوئی ۲۴۴ صفحات کی پوتھی میں شایع ہوئے ہیں۔ کوئی بھجن خلوص و روانی سے خالی نہیں اور پوری کتاب خوش اخلاقی کسرِ نفس اور عبادتِ الٰہی کی تلقین کرتی ہے۔[1]

برہمو سماج کی اصلاح پروری کے توڑ پر کٹر ہندوؤں نے دھرم سماج کے نام سے ایک تحریک چلائی ہے جس کا تذکرہ پہلے بھی کئی مرتبہ آچکا ہے۔ ماہِ اگست میں اس کا جلسہ مظفر پور میں اس غرض سے ہوا تھا کہ سماج کے ہندی و سنسکرت کالج کے معاملات پر غور کیا جائے۔ اس کالج کے قیام میں حکومت نے بھی تعاون کیا ہے۔

اپنے ۱۸۷۲ء کے مقالے میں میں نے "کوکا" نامی سکھ فرقے کا ذکر کیا ہے جس نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا تھا۔ اب مجھے ایک کتاب دست یاب ہوئی ہے

---

[1] بخالی ۱۵ اگست ۱۸۷۴ء

جس میں اس فرقے کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب پہلے گرمکھی میں لکھی گئی تھی۔ اس کا کچھ حصہ نثر میں تھا اور کچھ نظم میں۔ بعدور کے دتبیں سردار اتر سنگھ نے اس کا ترجمہ ہندی اور انگریزی میں کیا ہے۔ انگریزی میں اس کا نام کچھ اُٹپٹا سا ہے یعنی Sakhee Book لفظ 'سکھی'، کا استعمال کبیر اور دوسرے بھگت شاعروں کے بولوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس کتاب میں گروگووند سنگھ کے عقائد کا بیان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کوکا فرقے کے روحِ رواں یہی تھے۔ لیکن اصل کتاب ان کے بہت بعد ۱۸۴۳ء میں لکھی گئی اور اس میں گروبخش رام سنگھ کوکا کا ذکر ہے۔ دراصل فرقے کے بانی یہی ہیں اور عجب نہیں کہ کتاب بھی انھی کی لکھی ہوئی ہو۔ حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ سب کو معلوم ہے کہ گرو رام سنگھ نے اسی کتاب کو اپنی قیادت کا سہارا بنایا اور ان کے ماننے والوں کو بغاوت کی ترغیب بھی اسی سے ملی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں جو مقام وہابیوں کو حاصل ہے وہی کوکا پنتھیوں کو ہندوؤں میں حاصل ہے۔

(۶)

ہندستانی اب سمجھنے لگے ہیں کہ مذہب کے نام پر وہ غلط راستے پر بھٹک رہے ہیں۔ ان کے ایک مشہور عالم نے "ایک ہندی کا ترانۂ غم" کے نام سے جو نظم لکھی ہے اس میں اس امر کا اقرار ہے:

"اے میرے بدنصیب وطن! تو کب تک نیند کا ماتا رہے گا۔

اُٹھ جاگ کہ مغرب کا نورِ علم ہر طرف اُجالا کر رہا ہی۔ اپنی عظمتِ رفتہ کو یاد کر! کاش کہ تیری جہالت کا اندھیرا علم کے اُجالے کے آگے نہ ٹھیر سکے۔ دینِ حق تیری رہ بری کرے اور اصنامِ خیالی تجھے اپنا غلام نہ بنائے رکھیں"۔[1]

شمالی بنگال میں عیسائیوں کے ایک نئے فرقے نے جنم لیا ہی۔ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ اس کے حلقہ بگوش ہو گئے ہیں۔ ان کی دو رسمیں انوکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں سے کوئی جب بیمار ہوتا ہی تو علاج نہیں کرتا بلکہ عیسیٰؑ کا نام جپتا ہی۔ دوسرے یہ کہ یہ لوگ گوشت نہیں کھاتے۔ اس میں برہمنوں کا اثر صاف جھلکتا ہی۔[2]

گزشتہ مارچ میں بنگلور میں رومن کیتھولک کلیسا کے بشپ کی تعیناتی کی رسم ادا کی گئی۔ یہ عہدہ Chevalier صاحب کو ملا جو پہلے اسی شہر میں ایک کم تر عہدے پر فائز تھے۔ تین بشپ اس رسم کی ادائی کے وقت موجود تھے۔ بڑی بھیڑ بھاڑ تھی اور اس کی وجہ غالباً یہ ہی کہ ہندستان میں اس قسم کی رسم کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔

کلکتہ کے کئی کیتھولک عیسائی حال ہی میں گووا جیسی دُور دراز جگہ تیرتھ کی غرض سے پہنچے۔ وہاں سینٹ زیویر Xavier کا

---

[1] R—Mitra ——Journal of the National Indian Association – Jan 1874

[2] اخبارِ انجمن پنجاب ۱۶ جنوری ۱۸۷۴ء

مزار ہے۔

ریاست میسور میں ۸ ہزار سے زیادہ کیتھولک اور سات سے زیادہ پروٹسٹنٹ ہیں[1]

برطانوی کلیسا کے جو تین بشپ ہندستان میں ہیں، با مشورے کے لیے ناگ پور میں اواخر نومبر میں جمع ہوتے۔ عیسوی مذہب کے پرچار کے لیے جو مختلف سبھائیں کام کر رہی ہیں ان نے ان حضرات سے پوچھا تھا کہ ہندستانیوں کو عیسائی بنانے کے کارگر ذرائع کیا ہیں؟ اسی مسئلے پر غور کرنے کے لیے یہ جلسہ ہوا تھا۔ غور و خوض کے بعد انھوں نے انگلستان کے لاٹ پادری کے آگے یہ تجویزیں پیش کی ہیں: برطانوی پارلیمنٹ فلاں فلاں امور میں ہندستان کے پادریوں کو خود مختاری دے۔ کسی برطانوی یونی ورسٹی میں ایسے ہندستانی طلبا کو اسکالرشپ دیا جائے جو آگے چل کر تبلیغ کا کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ جن عیسائی اسکولوں میں ملکی زبانوں میں تعلیم دی جاتی ہے ان کے مدرسوں کو معقول تنخواہیں دی جائیں، اور ملکی زبانوں میں عیسوی مذہب سے متعلق کتابیں لکھوائی جائیں[2]

عیسائی مشنری محض مذہبی تحریروں پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ دوسرے علوم میں بھی دل چسپی ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے سہ ماہی رسالے کے پانچویں نمبر کو لیجیے جو گزشتہ جولائی میں شایع

[1] علی گڑھ اخبار ۱۹ جون ۱۸۷۲ء

[2] Colonial Church Chronicle جولائی ۱۸۷۲ء

ہوا تھا۔ اس میں بُدھ مت، صوبۂ بنگال میں تعلیم کا مسئلہ اور اس قسم کے کئی افادی مضامین عیسائی پادریوں کے لکھے ہوئے ہیں۔

چھوٹا ناگ پور کے گرجا گھر میں پچھلی بار کرسمس کا تیوہار دھوم دھام سے منایا گیا۔ یہ علاقہ قدیم باشندوں کا مسکن ہے۔ لکھا ہے کہ رات بھر ہندی میں بھجن گاتے گئے اور صبح کا خطبہ بھی اسی زبان میں سنایا گیا۔ کلیسا میں وہ بھیڑ تھی کہ کھوے سے کھوا چلتا تھا۔ کوئی پان سو آدمی تو ہوں گے۔ اسکول کے لڑکوں کی نماز الگ ہوئی اور کوئی تیس امید واروں کو بپتسمہ دیا گیا۔

پادری ریباک (Rebach) نے اس مشن کے حالات چھاپے ہیں جو کوٹ گڑھ گیا تھا۔ یہ قصبہ شملے کے شمال میں تیس میل کی دوری پر ہے اور یہاں انگریز تبدیلِ آب و ہوا کے لیے آتے ہیں۔ سنہ ۱۸۴۳ء میں انھی لوگوں نے مشورہ دیا کہ اس جگہ ایک مشن کا اڈا ہونا چاہیے۔ نیپال کی لڑائی کے بعد کوٹ گڑھ میں فوج رہنے لگی تھی۔ جب چھاؤنی توڑ دی گئی تو اس کی کئی عمارتیں مشنریوں کے لیے خرید لی گئیں۔ سنہ ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ یہاں عیسائیوں کی اچھی خاصی تعداد ہو گئی اور انھیں ایک کلیسا کی ضرورت ہوئی۔ اس کے لیے مہاراجا پٹیالہ نے صرف دو سو رُپے دیے، حالاں کہ لاہور کے گرجا گھر کو انھوں نے بخوشی ہزار رُپے کی رقم دی تھی[۵]۔ اس کی تعمیر کے لیے مہاراجا کشمیر نے دس ہزار رُپے کا بیش بہا عطیہ مرحمت فرمایا تھا۔ موصوف ہیں بھی بڑے

---

[۵] اخبار انجمن پنجاب ۲۵ ستمبر ۱۸۶۴ء

روادار اور فیض رساں[۱]۔ خیبر کوٹ گڑھ کے ۴۲ آدمی تو دیکھتے ہی دیکھتے عیسائی ہو گئے اور مشن اسکول میں پڑھنے کے لیے ۱۹۹ پہاڑی بچے آنے لگے۔ اب تو مہاراجا کے سگے بھائی جالندھر میں دینِ عیسوی پر ایمان لے آتے ہیں۔

دہرہ دون چائے کمپنی نے ۱۷ گاؤں دیسی عیسائیوں کو بسانے کے لیے بیچ دیے ہیں۔ اس نوآبادی کا نام "امید آباد" HOPE TOWN رکھا جائے گا۔

برطانیہ کے لاٹ پادری کے صدر مقام کینٹربری کے مذہبی مدرسے میں ہندستان کے لیے ایک خاص شعبہ کھولا گیا ہے۔ اس میں ایسے مبلغ تیار کیے جائیں گے جو وہاں جاکر کام کریں۔ انھیں ہندستانی زبان ورسوم، مذہب و فلسفے کی تعلیم ملے گی تاکہ وہ اپنی خدمات بہتر طریقے سے انجام دے سکیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہندستان میں ان کا کام آسان ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی میں مدراس میں ایک ہندو نوجوان عیسائی بن کر مشن میں رہنے لگا۔ اس کے باپ نے پادریوں پر مقدمہ قائم کیا لیکن عدالت نے اس کی بات نہ مانی کیوں کہ لڑکے نے کہہ دیا کہ اس نے اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کیا ہے۔ بگڑے دل باپ نے جتھا بنا کر مشن پر دھاوا بول دیا اور پادری کو بُری طرح زخمی کیا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ پولیس موقعۂ واردات پر پہنچ گئی[۲]۔

کیمبرج یونی ورسٹی کی عیسائی یونین میں تقریر کرتے ہوئے

---

[۱] پنجابی ۲۹ ستمبر ۱۸۴۷ء

[۲] Colonial Church Chronicle مئی ۱۸۴۷ء

حال ہی میں (Sir Bartle Frere) نے یہ خیال ظاہر کیا کہ گزشتہ چالیس سال کے اندر ہندستانی سماج میں زبردست تبدیلی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ اس میں مغربی تہذیب کے بُرے عناصر داخل ہو رہے ہیں۔ اگر عیسائی مت کے پرچار نے توازن قائم نہ کیا تو سماج پر اس اثر کا ردِّ عمل بہت بُرا ہوگا۔[1]

لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ مشنریوں کی ہمت افزائی کریں۔

۱۳ مارچ کو لندن میں ایک سوسائٹی کا جلسہ نارائن شیشادری نامی برہمن کے اعزاز میں ہوا جو اب عیسوی مذہب اختیار کر کے اس کی تبلیغ کا کام کر رہا ہے۔ لندن کے بشپ ڈاکٹر جیکسن نے اس جلسے کی صدارت کی اور شروع میں جو کچھ کہا اس سے ثابت ہو گیا کہ ہندستان کے معاملات سے وہ بے خبر نہیں ہیں۔ ان کی بے تعصبی کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اس برہمن کے قبولِ مسیحیت کا مقابلہ سینٹ پال سے کرتے ہوئے انھوں نے امید ظاہر کی کہ وہ اپنے ملک میں ایمان کی مشعل روشن کرے گا۔ حاضرین میں ایک اور ہندستانی عیسائی بھی تھا۔ اس کا نام "سبرامینن" ہے اور یہ مدراس کا رہنے والا ہے۔[2]

کیمبرج کے شعبۂ دینیات میں پادری ولیم صاحب نے بتایا کہ مشرق میں اسلام کی تبلیغ زور و شور سے ہو رہی ہے۔ قسطنطنیہ میں جو مذہبی مباحثے ہوئے ان میں مسلمانوں نے ایسی قابلیت دکھائی

---

[1] Indian Mail ۱۶ مئی ۱۸۷۴ء

[2] Indian Mail ۶ اپریل ۱۸۷۴ء

کہ بہت سے عیسائی فوراً مذہب بدلنے کو تیار ہو گئے۔ اس ضمن میں مقرر نے ایک نئی عربی کتاب کا ذکر کیا جس کا جواب مشرقی عیسائیوں سے نہ بن پڑا۔ اگر ان کی یہی حالت رہی تو اسلام کے حملے کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ پادری موصوف نے عربی کے ایک مسودے کا ذکر کیا جو نو سال پہلے لکھا گیا تھا۔ اس میں اسلام پر بنیادی اعتراض کیے گئے ہیں اور طرزِ تحریر بھی قطعاً مشرقی اور پُر اثر ہے۔ اگر اسے زیورِ طبع سے آراستہ کیا جائے تو مسلمان مبلغوں کی روک تھام ہو سکے۔ مسودے کا ایک نسخہ کیمبرج کے کتب خانے میں موجود ہے اور میرے دوست پروفیسر پالمر (PALMER) نے اسے طاقِ نسیاں سے نجات دلانے کا وعدہ کیا ہے۔

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہندستان میں اسلام کو جو عروج حاصل ہوا اسے صرف زورزبردستی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ اصل سبب تبلیغ کے پُر اثر طریقوں میں ڈھونڈنا چاہیے۔ چنانچہ ہندوؤں کے پورے فرقے اسلام میں ضم ہو گئے۔ علاوہ بر ایں ملک بھر میں دونوں قوموں میں جو ملی جلی شادیاں ہوئیں انھوں نے بھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا۔ اس کا اثر بنگال میں خاص طور پر نمایاں ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تو ہے ہی اور پھر ان کی آبادی روز بہ روز بڑھتی جاتی ہے۔

صرف مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ ہندوؤں اور بودھوں تک میں بیداری کا جو عدیم النظیر دور شروع ہو رہا ہے ہم اس کی اہمیت اور وسعت کا صحیح اندازہ نہیں لگا رہے ہیں؛ ورنہ عیسائی مبلغ روحانیت

ان بھوکوں کی طرف ضرور زیادہ توجہ کرتے[1]

روسیوں کا خیال تھا کہ کا کیشیا کے علاقے میں آسانی سے اپنا
ب پھیلا دیں گے۔ لیکن انھوں نے یہ دیکھا کہ لوگ کسی طرح
م کا دامن نہیں چھوڑنا چاہتے۔ یہاں تک کہ پانچوں وقت نماز
ھتے ہیں اور تیسوں روزے رکھتے ہیں۔

قسطنطنیہ کے اخبار 'بصیرت' نے عیسائی مشنریوں سے خفگی
ہار کیا ہو کہ وہ انجیل دبائے یہاں وہاں منڈلاتے پھرتے ہیں اخبار
رائے دی ہو کہ ان کی روک تھام کے لیے ایک خاص انجمن بنی
ہیے جو مسلمانوں کو صراطِ مستقیم سے بھٹکنے نہ دے۔

لیکن سب سے افسوس کا مقام تو یہ ہو کہ جو مسلمان ہمارے
ے میں شامل ہو چکے تھے، اب توبہ کرکے پھر اپنے پُرانے حلقے
ٹ رہے ہیں۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ اپنے ۶۷ء کے خطبے میں
نے مشہور مسلم عالم عماد الدین کا ذکر کیا تھا۔ جو عیسائی پادری
ئے تھے ان کے بھائی خیر الدین نے بھی ان کی پیروی کی لیکن سات
مشنری کے فرائض انجام دینے کے بعد اب پادری صاحب
امرت سر میں پھر سے اسلام قبول کر لیا اور توبہ کی کہ جہالت کی
سے باپ دادا کے مذہب سے غداری کی تھی۔ انھوں نے
کتاب بھی لکھی ہو جس میں لکھا ہو کہ سات سال کے عرصے
یں نے عیسائیت کا غائر مطالعہ کیا اور اب اس نتیجے پر پہنچا

---

[1] مہاراجا بڑودہ نے ویدوں کی تعلیم کے لیے تین اسکول کھولے ہیں
میں برہمن طلبا کو مفت پڑھایا جاتا ہو۔

کہ اسلام اس سے کہیں زیادہ صائب و صحیح پیغام کا حامل ہو[1]
طرفہ یہ کہ یورپین آبادی کے بعض افراد کبھی کبھی اُس اُلٹی گنگا میں بہ کر اپنا مذہب بدل لیتے ہیں۔ اس سال پنجاب کے مسٹر جونسن، سندھ کے دور یلوے افسر اور ایک انگریز خاندان پر یہ اُفتاد گزری ہو۔ یہ خاندان چار آدمیوں پر مشتمل ہو جس میں ایک عورت بھی ہو۔
انھوں نے اب یہ نام قبول کر لیے ہیں: محمد عبدالرحیم، محمد ابراہیم، محمد اکبر اور محمدی۔ کوئی مادام لُبٹی ہیں جنھوں نے بمبئی کی زکریا مسجد میں مذہب بدل کر ہیر احمد خاں نامی پٹھان سے شادی کر لی[2] بمبئی کے کشف الاخبار نے ان الفاظ میں اس واقعے کا ذکر کیا ہو: خدا کے فضل سے اسلام اب بھی سر بلند ہو۔ پچھلے جمعے کو ایک انگریز خاتون کو اپنی گُم راہی کا احساس ہوا اور راہِ حق پر آنے کی ہدایت ہوئی۔ چناں چہ اپنے بیٹے بیٹی سمیت وہ دینِ حق پر ایمان لے آئی۔ وہ ایک موسیے لبٹی کی بیوہ ہو جنھوں نے بمبئی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان سے اس کے دو بچے تھے۔ اسلام نے اس کے قلب پر ایسا اثر کیا کہ مسجد میں آکر اس نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا اور اسی رات کو محمد خاں نامی افغان سے شادی کر لی[3]۔
اس زمانے میں اسی قسم کے دو اور واقعات ہوئے جنھوں نے ملک بھر میں کھلبلی ڈال دی۔ ایک تو SIR W. MAC NAGHTEN

---

[1] پنجابی ٢٤ جنوری ١٨٦٧ء
[2] علی گڑھ اخبار ١٣ جولائی ١٨٦٧ء
[3] Indian Mail ٢٠ جولائی ١٨٦٧ء

سرڈبلیو میکناٹن کی لڑکی کا ذکر ہو جو انگریزی فوج کے مقابلے میں افغانیوں کی ہار کے بعد مسلمان ہوکر اکبر خاں کے حرم میں داخل ہو گئی۔ یہی حال ہندستان کے گورنر جنرل لارڈ ایلن برو کی بیوی کا ہوا جس نے ایک عرب شیخ سے بیاہ رچا لیا۔ ایک اخبار نویس نے ان مسمات کی زبان سے ایک شعر بھی کہوایا ہو جس کا مفہوم ہو کہ: "شومئی قسمت سے میں پیدا ہوئی کفر کی تاریکی میں، لیکن خوش نصیب کہ مجھے سچا راستہ مل گیا اور میں مسلمان ہو گئی"[۱]

معلوم ہوتا ہو کہ ایک دو نہیں بلکہ بہ کثرت عیسائی اسلام اختیار کر رہے ہیں۔ اخبار پنجابی نے یہ بحث چھیڑی ہو کہ جو عیسائی مسلمان ہو جائیں ان کی گزر اوقات کا کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ایمان کی خاطر ان بے چاروں کو سخت ناداری سے دوچار ہونا پڑتا ہو۔

اسی اخبار کے ایک نامہ نگار نے لکھا ہو کہ ان نومسلموں کی دست گیری ساری ملت کا فرض اور اس کے لیے باعثِ افتخار ہو۔ یہ مناسب نہیں کہ جو لوگ عیسائی ہونے کی حالت میں خوش حال تھے اور محض جوشِ ایمان کی وجہ سے ایک کنبہ اور برادری سے بچھڑ گئے ہیں، وہ مسلمان ہوکر غربت و افلاس کی زندگی بسر کریں۔ نامہ نگار نے ان میں سے کئی کو لاہور کی شاہی مسجد کی سیڑھیوں پر بھیک مانگتے دیکھا ہو۔ اس معاملے میں مسلمانوں کو عیسائیوں کی پیروی کرنی چاہیے جو ضرورت کے وقت اپنے نئے بھائیوں

---

[۱] میرٹھ گزٹ ۶ نومبر ۱۸۶۸ء

کی مدد کرتے ہیں۔ کم ازکم نومسلموں کو قرضِ حسنہ ہی دے دیا جائے کہ وہ کوئی چھوٹی موٹی تجارت شروع کرسکیں۔ کیا ان بے گھرے نومسلموں کو ٹھیرانے کے لیے کوئی سرائے بھی نہیں مل سکتی! البتہ کاہلی کو پاس نہ پھٹکنے دینا چاہیے اور ان میں سے جو کام کرسکیں انھیں کام کرنا چاہیے۔

آگے چل کر یہی نامہ نگار لکھتا ہے کہ "لوگ یہ سوچ کر عیسائی بن جاتے ہیں کہ عاقبت جو بھی ہو، یہ زندگی تو مزے میں کٹ جائے گی، یہ خام خیالی ہے۔ باپ دادا کا مذہب اس آسانی سے نہیں چھوڑا جاتا۔ تاہم دنیوی آسایش کے لیے جو عیسائی بن جاتے ہیں، انھی کی اولاد اپنے نئے دین پر ثابت قدم ہوسکتی ہے۔ اس کی مثال ہندی مسلموں سے لیجیے جن کی اکثریت باہر سے نہیں آئی اور دنیوی اثرات کے تحت اسلام پر ایمان لے آئی"۔

آگے چل کر یہ نامہ نگار عیسائی مبلغوں کو سراہتا ہے جو سمندر پار سے آکر اپنے کام کے لیے بڑے دکھ جھیلتے ہیں، کوڑی کوڑی جوڑ کر کتابیں چھاپتے اور مفت بانٹتے ہیں۔ پارسی یا ہندو تبلیغ کی طرف نہیں جاتے، صرف برہمو سماج اس طرف کچھ کچھ توجہ کر رہی ہے۔ مسلمانوں کو البتہ خیال ہے کہ ان کی جماعت وسعت پکڑے اگر وہ یہ نہ کرسکیں تو کم ازکم یہ تو کریں کہ جو اُن میں شامل ہوگئے ہیں پھر بھٹکنے نہ پائیں"۔

اس نامہ نگار کی رائے بمبئی کے مسلمانوں کے کان پڑی، اور انھوں نے نومسلموں کی امداد کی غرض سے ایک فنڈ کھولا ہے

اس کی طرف سے شہر کے قبرستان میں ایک گولک رکھ دی جائے گی جس میں فاتحہ خواں حسبِ مقدور چندہ ڈال دیا کریں گے[1]

اسی سلسلے میں علی گڑھ اخبار (۱۶ جون سالِ رواں) کے ایک مضمون کا اقتباس درج کرتا ہوں جسے پڑھ کر ناظرین کو یقیناً ہنسی آئے گی: جنھیں اپنے مذہب سے اُلفت ہو انھیں نے یہ مژدہ سنایا ہو کہ ہندستان کے تینوں بشپ جو عیسائی مبلّغوں کے قائد ہیں، یہ اقرار کرنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کی تگ ودو کا کوئی اطمینان بخش نتیجہ ہنوز برآمد نہیں ہوا۔ ان کی تحریروں اور تقریروں کا سیلاب اس اعتراف کی چٹان سے ٹکرایا ہو کہ ان کی کوششوں نے کوئی پھل نہ دکھایا کیوں کہ مُشرک و ملحد اب بھی اپنی پُرانی راہ جا رہے ہیں۔ بُت پرست مندروں کو جانے سے نہیں رُکتے۔ اور اگر کسی نے انحراف کیا بھی تو وہ ضرور اونچی ذات کا ہندو ہوگا۔ بہ فرضِ محال وہ عیسائی ہو بھی گیا تو یہ سب برائے نام ہی اصل میں کچھ نہیں۔ رہ گئے مسلمان تو ان میں نام نہاد عیسائی بھی نہ ملیں گے کیوں کہ انھیں دوسروں کی بہ نسبت اپنے مذہب سے زیادہ عشق ہی۔

اوپر ہم نے Hindu Patriot کے مضمون کا خلاصہ دیا ہی۔ عیسائی مشنری اپنی تحریک کے متعلق جو رائے رکھتے ہیں، وہ اس سے ظاہر ہی۔ یہ ایسی خوش خبری ہی جسے پڑھ کر مذہب کے سب شیدائی مطمئن ہوں گے۔ البتہ اس بیان کو مکمل کرنے کے لیے

---

[1] پنجابی ۳ اکتوبر ۱۸۶۴ء

یہ بات ضروری ہے جو اگرچہ تحریر میں نہیں آئی لیکن ان پادریوں کے دل میں ضرور ہوگی۔ وہ یہ کہ: ہمارے بلند بانگ خطبوں کا یہ الٹا اثر ہو رہا ہے کہ بہتیرے انگریز[1] مسلمان ہوتے جارہے ہیں اور گو دینِ محمدیؐ کے مبلغ ہماری طرح گلی کوچوں میں مذہب کے نسخے بیچتے نہیں پھرتے۔ تاہم یہ نومسلم اپنے نئے ایمان پر اٹل ہیں۔ یہ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہندو اخبار کے مضمون میں یہ ٹکڑا جوڑ دیا جائے تو اس کا مفہوم زیادہ واضح ہو جائے گا۔"

ہندو اخبار نے یہ اقتباس اس بیان سے لیا ہے جو ناگ پور کانفرنس کے بعد شائع ہوا تھا اور بالتفصیل Colonial Church Chronicle کے اگست ۱۸۷۶ء نمبر میں چھپا ہے لیکن یہ اقتباس صحت سے بہت دور ہے کیوں کہ تینوں پادریوں کا متفقہ بیان عیسوی تحریک کے لیے ہمت افزا ہے۔ اس وقت ملک میں عیسائیوں کی تعداد سوا دو لاکھ ہے جو مجموعی آبادی کو دیکھتے ہوئے بلا شبہ بے حقیقت ہے۔ بہرحال ان میں سے ۲۰ نے ایسی قابلیت کا ثبوت دیا کہ پادری بنا دیے گئے۔

مسلمانوں پر اس تحریک کا جو ردِ عمل ہوا ہے، اسے فراموش نہ کرنا چاہیے۔ وہابیوں نے حال ہی میں ایک منظوم دعا شائع کی ہے جو ملک بھر میں مقبول ہو گئی ہے۔ اس میں کہا ہے کہ:

"ہمارے سینوں میں ایمان کی آگ ٹھنڈی پڑ رہی ہے۔ کافر کا ظلم ہمارے دلوں کو چاک کر رہا ہے۔ اسلام کو ہمیشہ اپنی تلوار

---

[1] یہ مغالطہ تو نہیں لیکن مبالغہ ضرور ہے۔ مؤلف

بھروسا رہا ہو۔ اگر ہمارے اجداد کے ہاتھ میں تلوار نہ ہوتی تو وہ کہاں ہوتے؟ ہم سب کو ایک دن مرنا ہی ہو تو پھر راہِ خدا پر اپنی جان کیوں نہ قربان کریں۔ میدانِ جنگ میں لڑنے والوں میں بہت سے بخیریت غازی بن کر لوٹ آتے ہیں اور بہت سے گھر میں پڑے پڑے ایڑیاں رگڑ کر مرجاتے ہیں۔موت کا وقت سب کے لیے معیّن ہو اس لیے تن آسانی اور کاہلی کو چھوڑو، اٹھو اور ایمان کے لیے لڑو۔

اللہ ہند میں اسلام کا بول بالا کر — اس حد تک کہ تیرے سوا اور کسی کا نام باقی نہ رہے[1]

مسلمانوں کو یہ بات ہرگز گوارا نہیں کہ کوئی ان کے رسول یا رسالت پر حرف گیر ہو۔ فرنگیوں کی نکتہ چینی کو تو وہ ایک بار برداشت بھی کرلیں گے لیکن کسی ہم وطن کی کیا مجال کہ اس باب میں مُنھ کھولے۔ اس رویّے کی وجہ سے کبھی کبھی بڑے ہنگامے ہو جاتے ہیں اور پولیس کی سرگرمی کے باوجود خون کی ندّیاں بہ جاتی ہیں۔ اس قسم کا ایک دنگا بمبئی میں محرم کے زمانے میں ہوا۔ عام طور پر اسی زمانے میں مذہبی فساد ہوا کرتے ہیں۔ اس مرتبہ مسلمانوں کا غضب پارسیوں پر ٹوٹا۔ وجہ یہ تھی کہ انھوں نے Washing Ton Irving کی لکھی ہوئی سیرتِ رسول اللہ کا ترجمہ گجراتی زبان میں چھاپا تھا۔ اس کتاب کے بعض حصّوں کو مسلمان قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں۔ مترجم نے مسلمانوں کا غصّہ ٹھنڈا

---

[1] Indian Mail ۲۷ جولائی ۱۸۵۱ء

کرنے کے لیے وعدہ کیا ہے کہ اب یہ کتاب نہ بکے گی اور جو نسخے فروخت ہو چکے ہیں، وہ بھی واپس لے لیے جائیں گے۔ مسجد میں اس ارادے کا اعلان بھی کیا گیا لیکن جو عظیم الشان مجمع احتجاج کی نیت سے آیا تھا ہرگز مطمئن نہ ہوا اور "دین دین" کے سوا اس کی زبان پر کوئی لفظ نہ آیا۔ اس کے بعد جمعے کی نماز پڑھ کر ان سرپھروں کا ایک جتھا پولیس کو سخت پریشان کر کے پارسیوں پر ٹوٹ پڑا۔ صرف ڈنڈوں اور پتھروں سے انھی کو زدوکوب نہیں کیا بلکہ ان کے گھروں پر بھی دھاوا بول دیا۔ پارسیوں کے دو مندر توڑ دیے گئے اور ان کی مقدس آگ بجھا دی گئی۔ پولیس کے لاکھ سر مارنے پر بھی تین دن متواتر یہ ہنگامہ جاری رہا اور طرفین کے کئی افراد ہلاک ہوئے۔ مسلمانوں کے متعلق یہ کہنا چاہیے کہ اپنے عقیدے کے بہ موجب انھوں نے جامِ شہادت پیا۔

بعد ازاں مسلمانوں میں کھلبلی مچی کہ کہیں محرم کے جلوس ممنوع نہ قرار دے دیے جائیں۔ مقامِ افسوس ہے کہ پارسیوں پر یہ مصیبت نازل ہوئی کیوں کہ یہ بڑے روادار ہوتے ہیں اور فوراً یورپین تمدّن کو قبول کر لیتے ہیں۔ مثلاً پارسی لڑکیوں کے اس اسکول کو لیجیے جو مانک جی کرسٹ جی نے بمبئی میں 'lexandra Native Girl's Institution کے نام سے کھولا ہے۔ بلا مبالغہ یہ ملک کا بہترین زنانہ اسکول ہے۔[۵]

اس قسم کا زنانہ اسکول بمبئی میں پہلے نہ ہوا تھا اور امید ہے کہ آئندہ

۵؎ Indian Mail ۲۳ مارچ ۱۸۶۴ء

اس کا اعادہ نہ ہوگا کیوں کہ شہر کے مسلمان اپنی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگے ہیں۔ انھوں نے ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی ہو کہ بمبئی کے مسلمان بچّوں کی تعلیم کا معقول انتظام کرے اور غریب بچّوں کو مفت تعلیم دلائے۔ اس مقصد سے ایک فنڈ بھی کھولا گیا ہو۔ امید ہو کہ یہ اسکیم کام یاب ہوگی۔[۱]

گزشتہ ۱۴ جنوری کو ترپلیکین کے شادی محل میں شہزادۂ ارکاٹ عظیم جاہ بہادر کا ۷۲ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ کرناٹک کے آخری فرماں روا نوّاب عظیم الدّولہ کے فرزند تھے جنھوں نے ۱۸۰۱ء میں اپنی ریاست کمپنی کے حوالے کر دی۔ عظیم جاہ اپنے علم و فضل اور ذکاوت و بزلہ سنجی کے لیے مشہور تھے۔ ہندستان کے اکثر نوّابوں کی طرح اردو و فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد ارکاٹ کے قلعے سے ۷۲ توپیں داغیں گئیں جن کا اشارہ یہ تھا کہ شاہزادے کا اس عمر میں انتقال ہوا۔ یہ خبر آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی اور ہندو مسلمانوں کا جمِ غفیر محل کے اردگرد جمع ہوگیا۔ گو کہ جنازہ شام کو نکلنے والا تھا لیکن صبح سے ماتم کرنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ جب جنازہ اُٹھا تو فضا مرنے والے کے لواحقین کے نالہ و شیون سے گونج اُٹھی۔ گورنر کی گارد کے سپاہی محل سے مسجد تک سڑک پر دو رویہ پہرا دے رہے تھے۔ جنازے پر گلاب و چمیلی کے پھول بکھرے ہوئے

---

[۱] علی گڑھ اخبار ۱۵ مئی ۱۸۷۴ء

نے اور اسے مسلم شرفا بہ صد ادب کاندھے پر لیے جا رہے تھے۔
ں ماتمی جلوس کے آگے مرحوم کا چھوٹا بیٹا پوتے کے ساتھ چل رہا
تھا اور مسجد کے دروازے پر ان کے ولی عہد شاہزادہ ظہیر الدولہ
بہادر اپنے منجھلے بھائی کے ساتھ کھڑے تھے۔ نمازِ جنازہ کے
تت ہزاروں آدمی موجود تھے۔ بعد ازاں جنازہ کسنم پیٹ پہنچا
یہاں ہزاروں ہندو مسلمانوں کی موجودگی میں وہ دفن کر دیا گیا"

مرحوم کے ایک چچا نے بھی انھی دنوں اس دنیائے فانی سے
کوچ کیا۔ ان کا انتقال کارومنڈل کے ساحلی شہر میلاپور میں
ہوا۔ یہ شہر سینٹ ٹامس کے نام سے زیادہ مشہور ہے کیوں کہ
روایت ہے کہ اس عیسائی ولی نے یہیں شہادت کا مرتبہ حاصل
کیا۔ اس روایت کی بنا پر ہر سال یہاں عیسائیوں کا میلا لگتا ہے۔

اس سال کی ۱۸ اپریل کو بنارس کے راجا کا ۷۰ سال کی عمر
میں انتقال ہوا۔ دھرم سبھا کے قائد کی حیثیت سے آں جہانی
نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اب یہ جگہ راجا کمل کرشن کو ملی ہے۔

کلکتہ کے شہریوں نے طے کیا ہے کہ راجا کالی کرشن بہادر کا
مجسمہ سنگِ مرمر کا بنایا جائے۔ ان کی ذات اپنے وسیع کلچر اور
علم کی وجہ سے بے مثل تھی۔ انھوں نے صرف بنگالی، اُردو اور
ہندی ہی میں نہیں بلکہ انگریزی، فارسی اور سنسکرت میں بھی نثر و
نظم کے نمونے چھوڑے ہیں۔ وہ کلکتہ یونی ورسٹی کے کورٹ کے
ممبر، کئی یوروپین انجمنوں کے رُکن اور جج تھے۔ میں نے ان کی

ا۔ Allen's Indian Mail ۱۰ فروری سنہ ۱۸۷۲ء

ادبی صلاحیت سے یورپ کو روشناس کیا۔ GAY کے قصّوں کا انھوں نے اُردو نظم میں جو ترجمہ کیا ہے وہ ازحد مقبول ہے۔

بمبئی میں ۳۰ مئی کو ڈاکٹر بھاؤ جی نے اس دنیا کو خیرباد کہا[1] آثارِ قدیمہ پر انھوں نے جو پُرمغز مقالے لکھے وہ یورپ اور ہندستان میں یکساں مقبول تھے۔ اصلاح کے بہت بڑے حامی ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے قدیم مذہب کو بدلنے کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی۔ ساری عمر وہ علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ Victoria and albert Museum کو قائم کرنے میں انھوں نے اپنے دوست ڈاکٹر Bird Wood کی بڑی مدد کی۔ یہ صاحب اب انڈین میوزیم کے نائب نگراں ہیں۔ شاید ہی کسی دوسرے ہندستانی نے اپنے ملک کی اتنی سیر کی ہو جتنی ڈاکٹر بھاؤ جی نے کی تھی۔ ۷۲ء میں وہ لارڈ نارتھ بروک کو ایلورا کے نظارے کے لیے لے گئے تھے۔

الٰہ آباد میں ۱۰ نومبر کو بابو پیاری موہن بنرجی کا سورگ باس ہو گیا۔ یہ تھے تو مجسٹریٹ، لیکن اپنے علم کی وجہ سے سب کو عزیز تھے۔ انھوں نے ہندی زبان میں سنسکرت کی جو گرامر لکھی تھی وہ بنارس سے شائع ہو چکی ہے۔

یہ مقالہ میں انجیل کی اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ:
"ہم اس وقت شب کی تاریکی میں بھٹک رہے ہیں لیکن روزِ روشن کے طلوع ہونے میں زیادہ دیر نہیں"

---

[1] Indian Mail ۲۹ جون ۱۸۷۴ء

ہندُستانی زبان و ادَب ۱۸۷۵ء میں

اِن دنوں ہندستان کو شہزادۂ ویلز کی میزبانی کا فخر حاصل ہے۔ انگلستان کی طرح ہندستان میں بھی وہ بے حد مقبول ہیں اور عرصے سے ان کی آمد کا انتظار تھا۔ اب تو وہ اپنی رعایا کے دل میں جگہ کر لیں گے اور ان کا یہ سفر حکومتِ برطانیہ کے استحکام میں اضافہ کرے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس حکومت کی رواداری اور تہذیب پروری اس کی مستحق بھی ہے۔

پچھلے سال کا مقالہ شائع ہو چکنے کے بعد مجھے مسٹر کلی منٹس مارکھم Clemento Markham کی مُرتبہ رپوٹ بہ عنوان "۷۳-۱۸۷۲ء میں ہندُستان کی اخلاقی و مادی ترقّی کے اعداد و شمار"[۱] موصول ہوتی۔ یہ رپوٹ میرے کرم فرما سر لوئس مالٹ نے بھیجی ہے۔ یہ ہر سال شائع ہوا کرے گی اور اس میں ہندستان کے آئین و قوانین، زراعت و حرفت وغیرہ کا تذکرہ ہوا کرے گا۔ آسانی کے لیے جا بہ جا نقشے بھی دیے ہیں۔

۱؎ East India Progress and Condition, statement exhibiting the moral and material progress of India during the year 1872-73.

افسوس ہو کہ یہ اہم و مفید رپوٹ پہلے دست یاب نہ ہو سکی ورنہ میرا مقالہ زیادہ مکمل ہو جاتا۔ جس محنت سے اس کے لیے اعداد جمع کیے گئے ہیں اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہو اور اگر یہ سلسلہ سال بہ سال جاری رہا تو ہندستان پر مفید ترین معلومات فراہم کرے گا۔

اودھ کے نئے ناظمِ تعلیمات مسٹر جان سی نسفیلڈ JOHN C. NESFIELD نے ۱۸۷۴-۷۵ء میں اودھ کی تعلیمی حالت پر جو رپوٹ شائع کی ہو، اس میں ایک ایسی بات کہہ گئے ہیں جس کی تردید کی ضرورت بہ ذاتِ خود صوبے کے چیف کمشنر کو محسوس ہوئی۔ چناں چہ ان کے سکریٹری مسٹر ایچ۔ جے اسپارکس نے سرکاری طور پر جو احتجاج نامہ تحریر کیا ہو، وہ بھی رپوٹ میں شامل کیا گیا ہو۔ اس میں کہا ہو کہ: "آپ کا خیال ہو کہ اُردو عدالتوں کی زبان نہ رہی تو رفتہ رفتہ فنا ہو جائے گی۔ لیکن اس زبان نے جو قبولِ عام حاصل کر لیا ہو اس کا ثبوت اس کی مطبوعات سے ملتا ہو۔ اس سال تنہا لکھنؤ سے اُردو میں ۲۷۱ کتابیں شائع ہوئی ہیں اور ہندی میں صرف ۱۴۔"[1]

اس دلیل کی تردید نہیں ہو سکتی۔ اس کی تصدیق کے لیے

---

[1] اخبارِ سررشتۂ تعلیم اودھ (اپریل ۱۸۷۵ء) نے مطبوعات کی تعداد ۱۳۴ بتلائی ہو۔ ان سب میں فارسی و عربی الفاظ کی بہتات ہو اور ہندی کے بول تو خال خال نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بھی کئی ایسے ہوتے ہیں جن کا مفہوم سمجھانے کے لیے حاشیے میں فارسی کے ہم معنی الفاظ دیے جاتے ہیں۔

طلبا کی تعداد کا مقابلہ کریجیے جو اسی سال اودھ کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ گو کہ صوبائی حکومت ہندی کی پشت پناہ بنی ہوئی ہی تاہم اس زبان کے پڑھنے والے اُردو خوانوں سے تقریباً چھ ہزار کم تھے۔ دراصل ہندستانی میں اتنی قوت ہی کہ اگر اس میں ضبط کا مادہ پیدا ہو سکے تو وہ کبھی فنا نہ ہوگی۔ بلاغت کی وجہ سے اس میں زور بڑھ جاتا ہی اور ورجل کی شاعری کے متعلق جو بات کہی گئی ہی اس کا اطلاق ہندستانی پر بھی ہو سکتا ہی — "یہ جوش اور یہ روانی بھلا سب کو کب میسّر!"

صوبے کے گورنر سرجون اسٹریچی نے اس مسئلے کی تحقیق کی ہی کہ اگر عدالتوں کی زبان اُردو سے بدل کر ہندی کر دیں تو یہ کس حد تک مناسب ہوگا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نیچے طبقے میں ہندی کا زیادہ چلن ہی لیکن جو لوگ ذرا سی شُدبُد بھی حاصل کر لیتے ہیں، وہ اُردو سے ہی واقف ہیں۔ آگرہ و اودھ سے جو اخبار نکلتے ہیں، ان میں سے ۲۵ تو اُردو میں ہوتے ہیں اور صرف ۹ ہندی میں۔ ۱۸۷۳ء میں درسی کتابوں کے علاوہ جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں سے ۴۰ اُردو میں تھیں اور ۳۵ ہندی میں۔

سر جارج کیمبل George Campbell نے جو ہندستانی (اُردو) کے مخالف ہیں اور جن کی تردید کا فرض مجھے کئی مرتبہ ادا کرنا پڑتا ہی، خود تسلیم کیا ہی کہ: "شمالی و وسطِ ہند (بنگال کے علاوہ) کے رہنے والے ایک ہی نسل کے ہیں اور ایک ہی زبان بولتے ہیں، یہ زبان ہندستانی ہی۔"[1]

---

[1] Moden India —P. 38

محمد منظور صاحب نے اس پر یہ رائے زنی کی ہو: "یہ ہماری اور ہمارے ملک کی زبان ہو۔"[1]

ہندستانی (اُردو) کی حمایت میں حال میں جو مضامین دیسی اخباروں میں شائع ہوئے ہیں، ان سے میں ساری کتاب بھر سکتا ہوں۔ لیکن صرف مخزن الفوائد[2] کے اقتباس پر اکتفا کروں گا کیوں کہ کئی لحاظ سے یہ سب سے دل چسپ ہو۔

"سب جانتے ہیں کہ لفظ 'اُردو' کا مطلب لشکر ہو اور چوں کہ یہ زبان فوج سے نکلی اس لیے اُردو کہلائی۔ محمود غزنوی نے اس کی داغ بیل ڈالی۔ یہ بات نہیں کہ اُردو کا رنگ روپ اسی زمانے میں نکھر آیا تھا لیکن یہ ضرور سچ ہو کہ ۹۹۸ء سے لے کر ۱۰۳۲ء تک اس نے ہندستان پر جو متواتر حملے کیے، ان کی بہ دولت ایک نئی بولی کی لیک پڑ گئی۔ محمود کے بعد بہت سے سُلطان آئے جنھوں نے جگہ جگہ فوج کی چھاؤنیاں قائم کیں اور دُور دُور کے علاقے فتح کیے۔ ان کی فوجوں میں غیر ملکی سپاہی ہوتے تھے جو یہاں کی زبان نہ جانتے تھے۔ بہ ہر صورت باشندوں سے ربط وضبط ضروری تھا اپنی بات دوسروں کو سمجھائے بغیر زندگی بالکل ناممکن تھی۔

اس زمانے میں سنسکرت مردہ ہو چکی تھی اور اس سے ایک ایسی بولی نکل آئی تھی جو دیس بھر میں سمجھی جاتی تھی اور جسے 'بھاشا'

---

[1] کلیاتِ ولی کا دیباچہ

[2] ۲۵ ستمبر ۱۸۶۵ء

کہتے تھے مسلمان سپاہی اسی بولی کو اپناتے تھے اور فطری طور پر بیچ کے الفاظ اس میں ملاتے جاتے تھے۔ جیسے جیسے مسلمانوں کی حکومت پھیلتی گئی، ہندؤ مسلمانوں کے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ سیاسی اور تجارتی امور کا یہ تقاضا تھا کہ یہ کچی بولی ایسی شکل اختیار کرے کہ باہمی رابطے کا وسیلہ بن سکے۔ چناں چہ فارسی و عربی اور بھاشا میں بڑے پیمانے پر لین دین ہونے لگا۔ کچھ عرصے بعد یہ بولی جو آگے چل کر اُردؤ کہلائی، اس لائق ہو گئی کہ ہندؤ مسلمان سبھی اسے سمجھنے بولنے لگے۔ حاکموں کا یہ اثر ہونا ہی تھا کہ بھاشا میں ترکی، فارسی و عربی کے الفاظ کی تعداد بڑھتی جائے اور اسی نسبت سے خالص بھاشا کا اثر کم ہو جائے۔ رفتہ رفتہ اس اَنگھڑ بولی کی ایسی تراش خراش ہوئی اور اس نے ایسا جوبن نکالا کہ ہندستانی زبانوں کی ملکہ بن گئی اور پُرانی بھاشا نے ایسی مات کھائی کہ برج کی گلیوں کی جوگن بن کر رہ گئی اور اسی وجہ سے برج بھاشا کہلائی۔

شروع سے ہی اُردؤ کو بڑا رواج ملا پھر بھی بہت سے لوگ اس کے استعمال سے دامن بچاتے رہے اور فوجیوں کے علاوہ کوئی اس کی ضرورت محسوس نہ کرتا تھا۔ کچھ کا بیان ہی کہ اس کا سکّہ اکبر کے عہد میں بیٹھا اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ اورنگ زیب کے زمانے میں ہوا۔ کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اُردؤ کو ایرانیوں نے جنم دیا۔ لیکن اس میں زیادہ اصلیت نہیں کیوں کہ مسلمانوں کی فوجوں میں ایرانیوں کے علاوہ دوسرے بھی تو تھے۔ یہ سچ ہی کہ نئی زبان

کو سنوارنے میں ایرانیوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ عربی سے الفاظ لے لے کر انھوں نے ایک طریقہ بنا لیا تھا اور وہ اس کے اُستاد تھے۔ مگر یہ کہنا کہ اُردو ان کی بنائی ہوئی ہے، صحیح نہیں ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ اُردو عالم گیر کے زمانے میں وجود میں آئی اور ولی دکنی اس کا پہلا شاعر ہے۔ اس سے بہت پہلے غیاث الدین بلبن کے دوْر میں بھی اس زبان کا چلن تھا۔ امیر خسرو اسی زمانے کے تھے اور ان کی نظم 'قران السعدین' کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کا سانچہ اسی وقت تیار ہو چکا تھا۔ مزید ثبوت کے لیے ان کی پہیلیوں، مکریوں اور 'بسنتوں' کی طرف رجوع کیجیے۔[1]

مگر وہ محمد شاہ رنگیلے کا دوْر تھا جب اُردو کا سنگار پورا ہوا۔ یہ دہلی کے عروج کے دن تھے اور اگر اس کی رنگ رلیوں کا ذکر کیا جائے تو پوری داستان بن جائے۔ دہلی کے بازاروں میں جو حُسن برستا تھا، اس کے آگے لندن کی چمک دمک کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ ہر امیر حاتم ثانی اور ہر کنگال مالا مال تھا۔ ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات کا مضمون تھا۔ اس آرام و آسائش کا یہ تقاضا تھا کہ نئے نئے محاورے اور اسلوب پیدا ہوں اور مقبول ہوں۔ چناں چہ اُردو کے سرمایے کا ایک تہائی رنگیلے کے عہد کی دین ہے۔ بعد ازاں جب سے انگریزوں نے فارسی کی کرسی اُردو کو دے دی، اس کا دخل اور بھی زیادہ ہو گیا۔ پھر تو خط و کتابت، کچہری عدالت، مدرسہ و اسکول کے علاوہ ہزاروں اخباروں اور

---

[1] اس جگہ مضمون نگار نے خسرو کے کلام کا کچھ نمونہ نقل کیا ہے۔

ترجموں کے ذریعے اُردو کو اپنی تہذیب اور ترقی کا موقع ملا۔ ہندستان کا کوئی ایسا علاقہ نہیں جہاں یہ زبان بولی یا سمجھی نہ جاتی ہو۔ اس دن کے آنے میں دیر نہیں جب اُردو ہمارے ملک کی قومی زبان بن جائے گی اور مختلف عناصر میں یک جہتی پیدا کرے گی۔ اُردو کو جو فوقیت حاصل ہے، وہ ظاہر ہے۔ ایک تو یہ کہ زیادہ پُرانی نہ ہونے کی وجہ سے وہ قدامت پرست نہیں اور مغربی خیالات کو اپنے میں سمونے کی صلاحیت ہندی سے زیادہ رکھتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ گو کہ مسلمان حاکم سو فی صدی ترقی یافتہ تمدن کے علم بردار نہ تھے لیکن بہر حال ہندو تمدن سے وہ آگے تھے۔ وہ توحید پرست بھی تھے اور اس لحاظ سے عیسائیوں سے ان کا میل جول زیادہ آسان تھا۔ عرب یونانیوں کے جانشین تھے اور عرصے تک یورپ میں علم جدید کا چراغ انھوں نے روشن رکھا۔ یہی روشنی انھوں نے ایران میں پھیلائی اور اس کی ایک کرن مغلوں کے ساتھ ہندستان میں آئی۔

انھوں نے جس اُردو کو پروان چڑھایا وہ ہندستان کی قدیم و جدید تاریخ کے عناصر کی حامل ہے۔ عربی و فارسی کے سرمایے سے اس نے اس ملک کو روشناس کرایا۔ اس کے برعکس ہندی کسی نئے اثر کی متحمل نہیں۔ وہ ایک ایسے ماضی کی یادگار ہے جو ہمیشہ کے لیے بیت چکا اور کبھی زندہ نہ ہوگا۔ خواہ یہ ماضی کتنا ہی شان دار کیوں نہ ہو۔ فاتحوں نے اس زبان کو ملک کے کونے کونے میں پہنچا دیا اور صدیوں سے اس نے ہر طرف اپنا گھر بنا لیا۔ ہماری آنکھوں کے

سامنے یہ زبان ترقی کے زینوں پر چڑھ رہی ہو اور ہندی ہرگز اس کے مرتبے کو نہیں پہنچتی کیوں کہ اسے بہت کم لوگ لکھتے پڑھتے ہیں۔ اُردو کے رواج کی راہ میں رُکاوٹ ڈالنا ہر لحاظ سے بے کار ہوگا۔ پانی کا دھارا مصنوعی بندھنوں سے نہیں رُک سکتا وہ ان کے سر سے گزر کر اپنی راہ بناتا ہو۔ ہوشیار وہ ہو جو دھارے کی راہ میں نہیں آتا بلکہ اس کی رَو کو ایک حد کے اندر رکھتا ہو۔"

رجعت پسندوں کی جدوجہد کے باوجود حکومت نے یہ عقل مندی کی کہ انڈین سول سروس کے امیدواروں کے لیے ہندستانی جاننے کو لازمی قرار دیا اور انگلستان کی یونی ورسٹیوں میں بھی اس کی تعلیم کا انتظام کیا۔ پروفیسر مونیر ولیمس Monier Williams کی رائے ہو کہ آکسفورڈ میں ایک انڈین انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے جو وہی فرائض انجام دے جو ہیلری بری Hailery Bury کا ادارہ انجام دیتا تھا۔ سب کو اس ادارے کے بند ہو جانے کا افسوس ہو۔ پروفیسر موصوف شہزادۂ ویلز کے ساتھ ہندستان گئے ہیں تاکہ اپنی اسکیم کے لیے مدد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ کیمبرج میں ہندستانی زبانوں کا ایک خاص نصاب Indian-Languages Tripos پہلے سے موجود ہو۔

حال ہی میں رائل انڈین انجینیرنگ کالج Royal Indian Engineering College میں سالانہ تقسیمِ انعام کا جلسہ ہوا جس کی صدارت وزیرِ ہند لارڈ سیلسبری کر رہے تھے۔ اس موقع پر

کالج کے پرنسپل کرنل چیز نی نے کہا کہ طلبا کو ہندستانی زبان اچھی طرح سیکھنی چاہیے۔ وزیرِ ہند نے بھی پُر زور الفاظ میں ان کی تائید کی[1]۔

ہندی اور اُردو کی رقابت کے مسئلے پر علی گڑھ اخبار (۲۶ مارچ ۱۸۷۵ء) کے ایک نامہ نگار نے لکھا ہے: "معلوم ہوا ہے کہ بنگال کے حاکمِ اعلا نے اسکولوں کے انسپکٹروں سے پوچھا ہے کہ کیا یہ سچ ہے کہ بہار کے شرفا ہندی پر اُردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس تحقیقات سے حقیقت پر روشنی نہیں پڑ سکتی کیوں کہ بہار کے محکمۂ تعلیم کے عہدے دار ہندو ہیں اور تعصب کی وجہ سے وہ یقیناً ہندی کی تائید کریں گے۔ بہار میں ہندی کا چرچا حال ہی میں سُنا جا رہا ہے کیوں کہ وہاں کی سرکاری زبان ہمیشہ فارسی رہی جسے ہندو مسلمان سبھی سیکھتے تھے۔ بعد ازاں ہندی اور فارسی کے میل جول سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی جس کا نام اُردو تھا اور جسے اب تک دونوں قوموں کی مشترکہ زبان ہونے کا شرف حاصل ہے۔

یہ زمانہ ترقی کا ہے اور سب چاہتے ہیں کہ تہذیب کی برکتیں اس ملک میں بھی جلد سے جلد عام ہو جائیں۔ لیکن یہ ہندی یا انگریزی کی وساطت سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ہر جگہ اور خاص طور پر بہار میں اُردو کا سہارا لینا ہوگا جسے غریب، امیر، ہندو مسلمان، راجا، زمین دار سبھی بولتے اور لکھتے ہیں اور جہاں کی مجلسی زبان ہمیشہ فارسی رہی ہے۔

---

[1] Indian Mail ۲۴ جولائی ۱۸۷۵ء

جب سے بہار میں محکمۂ تعلیمات کی نئی تنظیم ہوئی ہے، اسکولوں میں ہندی اور اُردو دونوں کے اُستاد مقرر کر دیے گئے ہیں حالاں کہ طلبا کی بہت بڑی اکثریت اُردو پڑھتی ہے اور ہندی کے رسیا ڈھونڈے نہیں ملتے۔ ہندستانی اُردو سے صرف اسی لیے محبت نہیں کرتے کہ یہ ان کی مادری زبان ہے بلکہ اس لیے بھی کہ اسے جاننا گویا ترقی اور شرافت کی سند لینا ہے اور یہ ایسی سند ہے جو ہندی سے نہیں مل سکتی۔ لہٰذا حکومتِ وقت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہر طرح اس زبان کی ہمّت افزائی کرے نہ یہ کہ اسے نقصان پہنچا کر ہندی کی بے جا حمایت کی جائے۔ حکومت کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کوششیں بالکل بے سود ہیں کیوں کہ وہ رعایا کی مرضی اور ضرورت دونوں کے خلاف ہیں۔
اگر اس مسئلے کے سیاسی پہلو کو لیجیے تو ہندو مسلمانوں میں اشتراک بڑھانے والی جتنی باتیں ہیں اُن سب کی مدد کرنی چاہیے۔ صدیوں سے دونوں قوموں کی زبان ایک ہے۔ اگر اسے زندہ رہنے دیا جائے تو دونوں قوموں میں جذبات وخیالات کی ہم آہنگی ہونی لازمی ہے۔ جب دو آدمیوں کی دوستی کا ذکر کرنا ہو تو اُنھیں ہم زبان و ہم کلام کہا جاتا ہے۔ اگر اب مسلمانوں کو ہندی پڑھنے کے لیے مجبور کیا گیا اور ہندوؤں کو پھر دورِ جہالت کی طرف جانا پڑا تو دونوں کی پُرانی عداوت از سرِ نو شروع ہو جائے گی۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ پڑھنے والے تو اُردو کی طرف راغب ہیں لیکن حکومت خواہ مخواہ ان کے سر پر ایک نئی زبان تھوپ رہی ہے؟ یہ تو وہی بات ہوئی کہ آپ کے مُنھ میں زبردستی ایسا کھانا ٹھونسا جائے جسے طبیعت قبول نہ کرتی ہو۔

حکومت کا یہ فیصلہ کہ ہر ضلع کے باشندوں کو زبان کے انتخاب کی آزادی ہے، سراسر غلط ہے۔ یہ طریقہ تو مینارِ بابل تعمیر کرنے والوں کا ہے۔ اس طرح ہر ضلع اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے گا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اور ملکوں کی طرح ہندستان میں بھی پڑھے لکھوں اور اَن پڑھوں کی بولیوں میں فرق ہوتا ہے، تاہم دونوں بلا دقت ایک دوسرے کی بات سمجھ جاتے ہیں۔ پڑھے لکھوں کی زبان مستند ہوتی ہے کیوں کہ وہ عدالتوں، اخباروں اور کتابوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ یہ علم وادب، حکومت و مجلس کی زبان ہے۔ بول چال کی زبان بولنے سے آتی ہے کیوں کہ مدرسوں میں ادبی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُردو پڑھے لکھوں کی زبان ہے۔ یہ ہمارے ملک کی زبان ہے جس میں اتنی صلاحیت ہے کہ ہر مضمون کا اظہار کر سکے اور تعلیم عامہ کا واحد ذریعہ بن سکے..... حکومتِ بہار چاہے تو اپنے منصفوں سے ہی پوچھ دیکھے کہ وہ کس زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ تو کیا یہ ضرور ہے کہ کچھ ہٹ دھرموں کی خوش نودی کے لیے گنواروں کی بولی کو رواج دیا جائے، جانی پہچانی کتابوں کو طاق میں رکھ دیا جائے اور ہندی کی ورق گردانی شروع ہو جسے چند پنڈتوں کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھتا۔ لطف یہ ہے کہ اس زبان کو نہ پڑھے لکھے سمجھتے ہیں اور نہ عوام! آخر صوبہ جاتِ آگرہ واودھ اور بہار میں کیا فرق ہے۔ پھر جب آگرہ واودھ کے

محکمۂ تعلیمات نے اُردو کو تعلیم کا ذریعہ قرار دیا تو بہار کو اس سے پرہیز کیوں ہو؟ تھوڑے سے متعصبوں کی خوش نودی کے لیے اتنا بڑا اندھیر نہ کرنا چاہیے"۔

بہار بندھو کے نام سے ایک ہندی اخبار نکلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے اُردو سے لاگ اور ہندی سے لگاؤ ہے۔ اس نے دربھنگا کے ایک منصف کا مذاق اس لیے اڑایا ہے کہ وہ اپنی عدالت میں صرف اُردو کے استعمال کی اجازت دیتا تھا۔ اخبار مذکور لکھتا ہے:

"اُردو بیگم نے دربھنگا کے مُنصف کی عدالت میں ہندی کُماری پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ مدّعی کو بہار سے نکالنے کے درپے ہے۔ جب بیگم آنسو بہاتی سینہ پیٹتی عدالت میں پیش ہوئیں اور منصف صاحب نے ان کی چشم نرگس کو دیکھا اور میٹھے بول سُنے تو ہوش و حواس کھو بیٹھے اور نیک و بد پر غور کیے بغیر اس پری رُو کو دلاسا دینے لگے"۔ یہ طنز یہیں ختم نہ ہوا بلکہ ایک مسلمان مَن چلے نے اُردو گائڈ میں اس پر گرہ لگائی جیسے علی گڑھ سائنٹی فک گزٹ (۲۷ اگست ۱۸۷۵ء) نے نقل کیا ہے:

"بہار بندھو کے نامہ نگار نے عدالت کی کارروائی کو بیان کرتے ہوئے صداقت سے کام نہیں لیا کیوں کہ سماعت کے وقت میں وہیں موجود تھا۔ استغاثہ ہندی کماری بنام اُردو بیگم پیش تھا۔ یعنی ہندی نے اُردو پر یہ الزام لگایا تھا کہ اسے بہار میں رہنے کی اجازت نہیں دیتی۔

ہندی کی پیروی منشی گوری پرشاد اور اُردو کی پیروی منشی

عاقل خاں کر رہے تھے۔ جرح کرتے ہوئے عاقل خاں نے پوچھا
کہ شریمتی ہندی کیا آپ انگریزوں سے پہلے بہار میں سکونت پزیر
تھیں ؟ ہندی کے وکیل کو نفی کے سوا کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس
پر منصف نے پوچھا کہ اس دعوے کو ثابت کیجیے کہ ہندی کا نفاذ اُردو
کی بہ نسبت صوبے کے لیے زیادہ مفید ہوگا۔ منشی گوری پرشاد نے
ہندی کی طرف داری میں ایک لمبی کتھا سنائی جس کا مفہوم یہ تھا
کہ ہندوؤں کو اُردو پڑھنے اور بولنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اُردو
کی طرف سے جواب دیا گیا کہ یہ دلیل سراسر خام ہے کیوں کہ ایک
تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کی آسانی کو فراموش کیا جائے
اور دوسرے یہ کوئی فرقے وارانہ سوال نہیں کیوں کہ اُردو دونوں
قوموں کی مشترکہ زبان ہے۔ بہار میں صدیوں سے اس کا چلن
ہے اور ہندو مسلمان سبھی اسے استعمال کرتے آئے ہیں۔ پھر
اسے چھوڑ کر ہندی کو کیوں اپنایا جائے جب کہ مسلمان اس سے
بالکل ناواقف ہیں اور ہندو بھی اس سے کم آشنا ہیں۔ ایک
عام فہم زبان پر کسی اجنبی بولی کو ترجیح دینا کج فہمی نہیں تو
کیا ہے۔ ہندوؤں کو اس تبدیلی سے کوئی فائدہ ہونے سے
رہا کیوں کہ سرکاری ملازمتوں کی اکثریت ہندوؤں کے ہاتھ میں
ہے اور وہ سب اُردو جانتے ہیں۔ اگر ہندی کماری کے چھلاوے
میں حکومت آگئی تو زیادہ تر سرکاری عہدے داروں کو استعفا
داخل کرنا ہوگا۔ ابھی پچاس سال پہلے جب سرکاری زبان
فارسی تھی۔ عہدے داروں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی لیکن

جب سے اُردو کو یہ منصب ملا پانسا پلٹ گیا اور سو میں سے نوّے ہندو اور دس مسلمانوں کی اوسط ہو گئی۔ اگر اُردو کی جگہ ہندی کو ملی تو ایک بھی مسلمان ملازم نظر نہ آئے گا اور یہ ایک پوری قوم کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی ہوگی۔ ہندی کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ ہندو کس غرض سے کر رہے ہیں؟ یہ رعایا کی بہبودی کے لیے نہیں بلکہ چند لوگوں کے تعصب کے تقاضے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس ترکیب سے ہندو مذہب کو فروغ ہوگا اور اگر مسلمانوں کی زبان مٹ گئی تو ان کی ملت بھی منتشر ہو جائے گی۔

اس کے جواب میں منشی گوری پرشاد صرف یہ کہہ سکے کہ میرا مقابل بڑا مقرّر ہے۔ اس کی دلیلوں کا جواب میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ غلط ہیں۔ مجھ میں اتنی لیاقت نہیں کہ ان کی تردید کروں۔ لیکن مجھے منصف صاحب کے رحم و کرم کا آسرا ہے۔ ان سے میری درخواست ہے کہ ہندی دیوی کی لاج رکھ لیں۔

منصف نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہا: انصاف کو لاگ لپیٹ سے کوئی واسطہ نہیں۔ رحم و کرم کے لیے مندر جانا چاہیے۔ عاقل خاں نے ثابت کر دیا کہ بہار کے لیے اُردو کا رواج ازبس مفید ہے چناں چہ ہندی کا دعوا مسترد کیا گیا اور اُردو بہ دستور عدالتی زبان کے منصب پر فائز رہے گی۔"

مضمون کو نقل کرتے ہوئے علی گڑھ گزٹ نے اس رویے کی مذمت کی ہے کہ ایسا اہم مسئلہ طنز و مزاح کا ہدف بنایا جائے

۱۔

اس نے ایک دوسرے مسلمان کے مضمون کا حوالہ دیا ہے جس نے اپنے ہم مذہبوں کو تنبیہہ کی ہے کہ ہندو دھرم کو بُرا بھلا نہ کہیں کیوں کہ پھر وہ بھی اسلام پر اعتراض کریں گے اور ساری بحث اپنے موضوع سے ہٹ جائے گی۔ مذہبی رواداری سے سب کو یکساں فائدہ ہوگا۔

اسی سال فروری میں لندن میں ایک جلسہ اس غرض سے ہوا تھا کہ ہندستانی زبانوں بالخصوص اُردو کا رسم الخط بدل کر رومن کر دینے کی تجویز پر غور کرے۔ عرصے سے مشنریوں کی جماعت اور سر چارلس ٹریولین SIR CHARLES TREVALYAN اس خیال کی اشاعت کر رہے ہیں۔ اس مسئلے پر میں اپنی رائے پچھلے مقالوں میں ظاہر کر چکا ہوں۔ جلسے میں ڈاکٹر لائٹنر نے انھی باتوں کو دُہرایا۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے دوست پادری جیمس لونگ بنگلہ زبان پر ایسے لٹو ہوئے کہ بہت سے مستشرقین کی طرح بلا وجہ اُردو کے مخالف بن بیٹھے۔

گزشتہ سال میں نے جن مشاعروں کا ذکر کیا تھا، وہ برابر دھوم دھام سے ہو رہے ہیں اور ان کا انتخاب ایک گل دستے کی شکل میں شائع ہوتا ہے جس کا نام 'رسالہ' رکھا گیا ہے۔

۱۴ مئی سنہ۱۸۶۸ء کی ایک صحبت میں میجر ہول رائڈ نے فیصلہ کیا تھا کہ جو کتابیں انجمن کے آگے پیش ہوں، ان پر تبصرے کی غرض سے اہلِ نظر اصحاب کی ایک کمیٹی بنائی جائے۔ دسمبر میں اس قسم کی کمیٹی بنا دی گئی تھی۔ اب اخبار پنجابی نے لکھا ہے کہ کمیٹی کو فوراً اپنا کام شروع کر دینا چاہیے اور نظم کی کتابوں پر

غور کرتے وقت اُن نکات کو ملحوظ رکھنا چاہیے جو آگرہ اخبار، گوگزٹ (؟) اودھ اخبار، کوہ نور اور پنجابی میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ اب تو انجمن پنجاب کو شاہ زادۂ ویلز کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے۔ اس کے ماہانہ مشاعرہ منعقدہ نومبر ۱۸۷۶ء میں حسبِ دستور کالج کے طلبا اور شہر کے روسا کے علاوہ مشہور شعرا موجود تھے۔ پٹیالہ کے صدرِ اعظم اپنے وزیرِ تعلیم نیز دوسرے حکامِ اعلا کے ساتھ تشریف رکھتے تھے۔ انجمن کے بانی میجر ہول رائڈ بھی جلسے کی رونق بڑھا رہے تھے۔ شعرا میں عطا، حالی، آزاد، حقیر، رفیق اور کشن لال ہما کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے 'انصاف' کے موضوع پر نظمیں سنائیں۔ باہر کی آئی ہوئی کئی نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ یہ مشاعرہ بہت کام یاب رہا اور شاعروں نے خوب خراجِ تحسین حاصل کیا۔ میجر ہول رائڈ جو فارسی و عربی کے سوا اُردو کے بھی بڑے ماہر ہیں، بہ ذاتِ خود نہایت محظوظ ہوئے۔ دو شاعروں نے بے وقت کی راگنی چھیڑنی چاہی مگر انھیں اجازت نہ ملی کیوں کہ انجمن ہجو گوئی یا قصیدہ خوانی کی اجازت نہیں دیتی۔[۱]

میجر ہول رائڈ کے مشورے سے اعلان ہوا کہ اگلے مشاعرے میں "مروت" پر نظمیں پڑھی جائیں گی۔

لاہور میں وقتاً فوقتاً ایک اور مشاعرہ ہوا کرتا ہے جس میں سخن گو اور سخن فہم حضرات کی کم بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی۔ اس کا

---

[۱] اخبارِ انجمنِ پنجاب، ۲۰ نومبر ۱۸۷۶ء

اہتمام کرنے والوں نے طے کیا ہے کہ آیندہ مشاعرے کی جملہ غزلوں ونظموں کا مجموعہ چھاپ دیا کریں۔

جنوری ۱۸۷۵ء میں انجمن کا مشاعرہ حسبِ معمول دھوم دھام سے ہوا۔ ملک کے بعض رئیس اور امرت سر کے امرا اور لاہور کالج کے متعدد طلبا نے اس میں شرکت کی۔ ابتدا باہر سے آئی ہوئی نظموں سے ہوئی۔ بعدازآں ہُما و حقیر کے نوجوان شاگردوں کے آگے شمع آئی جن کی جولانیٔ طبع نے محفل کو گرما دیا۔ اس سلسلے میں اخبار انجمن کے ایک اداریہ میں کہا گیا ہے کہ اگر استادوں کے کمال کا پرتو نئی پود پر پڑا تو اس کے توسط سے شاعری کا اعلا ذوق سارے ملک میں عام ہو جائے گا اور اس کا اثر دور رس ہوگا۔ مشاعرے کے بانیوں کے آگے کلچر کی اصلاح کا جو مقصد ہے، اُس کا ایک پہلو اس طرح پورا ہو جائے گا۔

شمع گردش کرتی ہوئی جب آزاد، عطا، ہما، رفیق، حقیر، سعید جیسے پرانے شاعروں کے آگے آئی تو انھوں نے اپنے منجھے ہوئے پیرایۂ اظہار اور سنورے ہوئے تخیل سے سب کو موہ لیا۔ یہ نظمیں اخبار انجمن میں شائع ہونے والی ہیں۔ مارچ کی مجلسوں کے لیے 'تہذیب' کو موضوعِ مشاعرہ قرار دیا گیا۔ جب سے لے کر اب تک کئی مشاعرے ہو چکے ہیں۔

اخبارِ عالم میرٹھ نے ۱۲ اگست کی اشاعت میں لکھا ہے کہ مشاعروں میں صرف شعرخوانی ہی نہ ہونی چاہیے بلکہ نثر اور صفائیِ زبان کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔ فرانس اور اسپین کی

اکیڈمی Academic کی طرح مبتذل الفاظ و محاوروں کے اخراج کا کام انجمن کو اپنے ذمّے لینا چاہیے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان مشاعروں کے منتظمین کا مقصد رفتہ رفتہ ہندستانی ادب پر مغربیت کی خول چڑھانا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں پر مغربی رنگ گہرا رچا ہوا ہے۔ لیکن ملکی ادب کو اس کے اصلی ماحول سے نکال کر مغربی ادب کا دُم چھلا بنانے کی کوشش ہرگز مستحسن نہیں۔ اس ضمن میں علی گڑھ سائنٹِفک گزٹ[1] کا حسبِ ذیل مضمون دل چسپی سے خالی نہیں:

"ہمیشہ ہمیں اس کی دُھن رہی کہ ہماری شاعری فطرت سے رُوشناس ہو اور اپنی مُراد برآتے دیکھ کر ہمیں انتہائی مسرت ہوتی ہے۔ تا ایں دم ہماری شاعری کا دائرہ محدود تھا۔ اس میں عشقیہ غزلوں، واسوخت قصیدوں، قطعوں اور خیالی مثنویوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ ان اصنافِ سخن کو یک قلم مسترد کر دینا چاہیے بہر حال ان کے بعض پہلو اچھے بھی ہیں۔ شکایت یہ ہے کہ شاعری یہیں تک محدُود کیوں رکھی گئی۔ مناظرِ قدرت و حقائقِ فطرت پر تو کسی کی نظر ہی نہیں گئی۔ ایک سی بحریں اور ایک سے قافیے، لُطف یہ ہے کہ شاعران ضمنی امور میں اس طرح پھنسے ہوئے تھے کہ اسی کو روحِ سخن گردانتے تھے۔ نظمِ معرّا کی طرف دھیان جانا تو دور رہا کسی کو اس کی جرأت بھی نہ ہو سکتی تھی[2]۔ اس حد بندی کی

---

[1] ۱۹ فروری ۱۸۷۵ء

[2] حاشیہ صفحہ ۴۰۵ پر ملاحظہ کیجیے

وجہ سے اُردو شاعری سے دل چسپی اور افادیت دونوں عناصر مفقود ہو گئے تھے۔ لہٰذا یہ امر قابلِ تعریف ہے کہ اہلِ پنجاب کی کوششوں سے ہماری شاعری سے یہ عیوب دور ہو رہے ہیں۔ سالِ گزشتہ کا وہ پہلا مشاعرہ ہماری زبان کی تاریخ میں یادگار رہے گا جب لاہور میں فطری شاعری کی قلم لگائی گئی۔

پنجاب کے لفٹنٹ گورنر اور ناظم محکمۂ تعلیم نے اس تحریک کی جو رہ نمائی کی، وہ ہمارے شکریے کی مستحق ہے۔ قوم کے دور اندیش افراد کو ان کی کوششیں بہت بھائیں۔ پروفیسر محمد حسین آزاد ان مشاعروں کی تنظیم میں ہمیشہ لگے رہتے ہیں۔ ان کی زبان میں سادگی کے ساتھ جو جوش پیدا ہوتا ہے اور اظہار میں جو صفائی ہوتی ہے، وہ ہمیں پسند ہے۔ بہ قولِ "آفتاب پنجاب" ان کی مثنوی 'خواب امن' نے ہر طرف بیداری کی لہر دوڑا دی ہے۔ اسی طرح خواجہ الطاف حسین حالی کی مثنوی 'حب الوطن' اور 'مناظرۂ رحم و انصاف' کو دورِ حاضر کی اخلاقیات کا تذکرہ سمجھنا چاہیے۔ ان کے خلوص کا سکہ سب کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ ان کی تنظیم بہتے ہوئے پانی کی طرح نرل اور رواں ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے ان کا کلام انتخاب ہے۔ اب تک ہمارے شاعروں

حاشیہ صفحہ ۵۳۹

لاطینی یا یونانی کی طرح مسلمانوں کی کسی زبان کی شاعری ماترک اصول پر نہیں بلکہ وزن وقافیے پر قائم ہے۔ اس وجہ سے فرانسیسی کی طرح ان زبانوں میں بھی نظم معرّا کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔ (مؤلف)

کو اس کی توفیق نہ ہوئی تھی کہ فطرت کے مطالعے سے حقیقت کا درس لیتے۔ اگر ہمارے شاعر اب بھی قدرت کے نگارخانے کی طرف جائیں اور ملٹن و شیکسپیر جیسے شاعروں کا مطالعہ کریں اور وہ محض عشق و حسن پر تکیہ نہ کرکے زندگی کے مسائل کی طرف رجوع کریں تو ہمارے ادب کا مستقبل کس قدر شان دار ہو جائے! پھر ایک دن ہماری قوم میں بھی ملٹن اور شیکسپیر کے ہم سر پیدا ہونے لگیں گے۔"

اگرچہ اب دلّی نہ دیس کی راج دھانی ہے اور نہ صوبے میں شہر کی حیثیت سے اسے کوئی خاص مرتبہ حاصل ہے تاہم اُردو زبان کا اب بھی بڑا مرکز ہے۔ اس لحاظ سے لکھنؤ بہرحال اس پر فوقیت رکھتا ہے کیوں کہ گزشتہ صدی کے اواخر میں سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ بہت سے سخن سنج اور اہلِ قلم شاہِ اودھ کی پناہ میں چلے آئے تھے۔ ان کے اجتماع نے لکھنؤ کو ریختہ کا مسکن بنا دیا۔ چناں چہ لکھنؤ والوں کو زعم ہے کہ ان کی زبان دلّی سے زیادہ نکھری ہوئی ہے۔ اودھ اخبار نے جو لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شیرِ قالین کو جنگل کے شیر سے کیا واسطہ۔ دلّی کو جدت میں کمال ہے تو لکھنؤ کو نقل میں۔ لکھنؤ کی بولی دلّی کی اُردوے معلّیٰ کا چربہ ہے میر تقی، سودا اور حسن ان تین شاعروں نے اُردو زبان کو نیا رنگ دیا اور یہ تینوں دلّی سے آئے تھے۔ زمانۂ حال کے اکثر ممتاز لکھنوی شعرا کو دلّی سے تعلق ہے۔ اس کے بعد اودھ اخبار مثالیں

دے دے کر ثابت کرتا ہو کہ لکھنؤ کا محاورہ دلّی کے روزمرہ سے پھیکا ہی۔

خیر لکھنؤ تو دلّی کا رقیب ہو لیکن اور بھی ایسے شہر ہیں جن کے شاعر دلّی کے اُستادوں کے ہم چشم ہیں۔ زکی مرادآبادی، آتش و اختر (ڈھاکہ) احمد (سکندرہ)، اخگر اٹاوی، ارمان کلکتوی، آرزو اکبرآبادی، آزاد حیدرآبادی، افسوس (رتن؟)، عماد فرخ آبادی، امیر گوالیاری، سالک عظیم آبادی وغیرہ مانے ہوے اُستاد ہیں۔ اودھ اخبار نے دلّی کی اُردو کی مثال ایک دریا سے دی ہو جس کا سیلاب پانی کو ہر طرف پھیلا دیتا ہو۔ یہ اثر شہر شہر اور گانو گانو پہنچ گیا ہو جس کی وجہ سے شاعر برساتی کیڑوں کی طرح عام ہوگئے ہیں۔ ان میں سے بہتوں کی طبع زاد ذہانت میں شبہ نہیں۔ چناں چہ اُردو کا کوئی اخبار شعروشاعری سے خالی نہیں اور اس کی ہر اشاعت میں پانچ دس اچھے بند تو نظر آہی جاتے ہیں[۱]۔

۱۸۱۶ء کا ذکر ہو کہ موسیے لانگلے LANGLES کے قابلِ قدر کتب خانے میں ہندستانی کی کتابیں پہلے پہل میرے ہاتھ لگیں۔ ان میں اُردو نثر کی اعلا تصنیف آرایشِ محفل مصنفہ افسوس بھی تھی۔ لانگلے کو مشرق سے جو محبت تھی، زمانے نے اس کی داد نہ دی۔ انقلابِ فرانس کے ہنگامہ پرور دور میں بھی وہ بڑے شوق سے ایشیائی زبانیں پڑھتا پڑھاتا رہا اور انقلابی حکومت کو زندہ مشرقی زبانوں کا مدرسہ قائم کرنے پر

---

[۱] اودھ اخبار ۶، ۷، ۸ اگست اور ۱۰ ستمبر ۱۸۷۵ء

آمادہ کیا۔ اس اسکول کا وہ پہلا ناظم اور فارسی کا پروفیسر تھا۔ اس کا معاون شیزی (CHEZY) تھا جس نے فرانس میں سنسکرت کا شوق پیدا کیا۔ لانگلے کی علمیت مسلم ہی۔ اس پر صرف یہ اعتراض ہوسکتا ہی کہ ناشروں کی خوش نودی کے لیے کبھی کبھی صحت کا دامن چھوڑ دیتا تھا۔ وہ میرا اُستاد تھا۔ اس کی نیز یونی ورسٹی کے دیگر ماہرینِ مشرقیات کی رہنمائی سے مجھے بہت کچھ حاصل ہوا۔

مسٹر ایف۔ ایس گراوز F. S. Growse کی اُردو دشمنی کا رونا میں کئی بار رو چکا ہوں۔ بارے انھیں بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندی لکھنے والوں سے شکایت کریں کہ وہ عام فہم اُردو و فارسی الفاظ کو ترک کر کے دقیق سنسکرت کا استعمال کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہو کہ جسے یہ لوگ ہندی کہتے ہیں وہ اُردو کی ہی مسخ شدہ شکل ہی جس میں اسم وصفت کو سنسکرت کا رُوپ دے دیا جاتا ہی۔ مسٹر گراوز نے یہ بھی لکھا ہی کہ ہندی والے اپنے ملک کی آب و ہوا کا خیال نہیں رکھتے مثلاً کسی کتاب میں گرمی کی صبح کی تعریف لہک لہک کر کی گئی ہی۔ ہندستان جیسے گرم ملک میں یہ بکواس مضحکہ خیز سمجھی جائے گی۔ موصوف کو یہ بھی ناپسند ہی کہ یورپین ناموں کو اُلٹا سیدھا ہندستانی خط میں اس طرح لکھ دیا جاتا ہی کہ اس کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ خود مجھے بھی یہ دقت پیش آتی ہی۔ ایسا یورپین نام جو میرا جانا پہچانا ہی ملکی اخباروں میں چھپ کر بالکل ناآشنا معلوم ہوتا ہی۔ مسٹر گراوز کی یہ شکایت بھی بالکل بجا ہی کہ بسا اوقات یورپین الفاظ کا ترجمہ تعصب کے ساتھ کیا جاتا ہی۔

مثلاً تاریخ انگلستان کے ایک خلاصے میں Protestantism کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ ست دھرم اور Catholicism کا ترجمہ کیا ہے۔ پوپ کا جھوٹا مت!

مَیں نے اپنی کتاب 'ہندستانی ادب کی تاریخ' کے دیباچے میں جن تذکروں کا نام گنایا ہے، ان میں ایک اضافے کی ضرورت ہے۔ میری مراد لکشمی نارابن شفیق اورنگ آبادی کی تصنیف "گلِ رعنا" سے ہے جو ۶-۱۷۶۵ء میں لکھی گئی۔ ملّا فیروز کے کتب خانے میں اس تذکرے کے دو نسخے تھے۔ اس میں ملک کے تمام ہندو مسلمان شاعروں کی فہرست کلام کے نمونوں کے ساتھ دی گئی ہے۔

محمد منظور صاحب جو دیوانِ ولی (مطبوعہ قاضی ابراہیم و نورالدین در ۱۸۷۳ء) کو عجیب و غریب پیرائے میں مرتب کر چکے ہیں اعلان فرماتے ہیں کہ وہ ہندستان کے جملہ شعرا کا تذکرہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دیوانِ ولی کے دیباچے میں انھوں نے اپنی کارگزاری کا خاکہ بھی شامل کیا ہے۔ شاعروں کو انھوں نے پانچ درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان حضرات کی ایسی بہتات ہے کہ اکیلے پنجاب سے ۴۰ کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں چودہ کا شمار استادوں میں کیا جاتا ہے۔ سولہ دوسرے اور ۲ تیسرے درجے کے، باقی پھسڈی ہیں۔ ان میں سے کئی کا ذکر میں نے انجمن لاہور کے مشاعروں کے بیان میں کیا ہے۔

نئی کتابوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ ان میں سے ایک کا نام 'نظم الممالک' ہے جو دراصل ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے حکومتِ پٹیالہ

کی فرمایش پر مولوی اسمٰعیل علی گڑھی نے اسے لکھنؤ سے چھپوایا ہے۔ انجمن عرب سرائے کے رسالے میں الطاف حسین نے اس اہم کتاب پر ایک طویل مضمون قلم بند کیا ہے جسے سائنٹی فک گزٹ نے نقل کیا ہے۔

تاریخ الاولیا کی اشاعت پر پنجابی نے یہ شذرہ تحریر کیا ہے:

"جنھیں ملّتِ اسلامیہ کے اولیا و علمائے کرام سے عقیدت ہے انھیں مژدہ ہو کہ انبیا و اولیا کی مکمل تاریخ زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہی ہے۔ اس کی پہلی جلد جو شائع ہو چکی ہے حضرت آدمؑ سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک کے نبیوں، پیغمبروں اور ولیوں کے حالات کی حامل ہے۔ یہ مبسوط مقدّمے کے علاوہ دو ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں تصوّف کی ۲۱ برکتوں کے علاوہ چاروں مذہبی سلسلوں کے بانیوں کی سیرت تحریر ہے۔ پہلے باب میں نو فصلیں ہیں جن میں پیغمبروں کے سوا آں حضرتؐ، صحابۂ کرام، خلفائے راشدین اور بارہ اماموں کے حالات ہیں۔ دوسرے باب میں قادریہ، چشتیہ، سہروردی اور نقش بندی سلسلوں کی تاریخ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مشہور مفسّر و محدّث، علما و صوفیوں کا بھی ذکر ہے۔

مطبوعہ جلد میں ایک ہزار بزرگوں کی زندگی کے احوال جمع کیے گئے ہیں۔ دوسری جلد میں پانچویں صدی سے ہزارویں صدی ہجری تک کی مخصوص اسلامی شخصیتوں کی تاریخ ہو گی۔ اور آخری جلد میں اُس زمانے سے اس وقت تک کے اولیا و علما کے حالات ہوں گے۔

اس بے مثل تاریخ کو بمبئی کے سید امام الدین احمد گلشن آبادی ترتیب دے رہے ہیں۔

سلہ ۱۳ فروری ۱۸۷۵ء

عربی کتاب احیاء العلوم کا ترجمہ اُردو میں مذاق العارفین کے نام سے چھپا ہے۔

ایک اخبار نے لکھا ہے کہ میرزا فتح محمد بیگ[1] دینِ اسلام پر ایک رسالہ تیار کر رہے ہیں جو اُن لوگوں کے لیے مشعلِ ہدایت کا کام دے گا جو اوہام کی وادیوں میں بھٹک رہے ہیں۔

منشی محمد ذکاء اللہ خاں کی تاریخ ہندستان پر پہلے بھی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب اس کی دوسری جلد شائع ہوئی ہے۔ الطاف حسین دہلوی نے علی گڑھ اخبار[2] میں اس کے متعلق ایک دل چسپ مضمون لکھا ہے:

"پہلی جلد میں ہندو عہد کی داستان تھی، پیشِ نظر کتاب مسلم عہد کے لیے وقف ہے اور تیسرے حصے میں برطانوی دور کی تاریخ ہوگی۔ اب تک اُردو زبان میں ہندستان کی کوئی مکمل تاریخ نہیں لکھی گئی تھی۔ مغربی مؤرخوں کی محنت نے ہندو عہد پر سے تاریکی کا پردہ اٹھا دیا ہے۔ مسلمانوں کے متعلق فارسی میں اور انگریزوں کے بارے میں انگریزی میں بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ مؤلف نے ان سب کا مطالعہ کر کے یہ تاریخ لکھی ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے وہ غیر ضروری چیزیں چھانٹ دی ہیں جو عام طور پر تاریخ و فسانے کی تمیز مٹا دیتی ہیں۔ واقعات کی روشنی میں جو بات کھری نہیں اُتری، اسے سختی سے قلم زد کر دیا ہے۔ مثلاً بازار کی افواہوں، نجومیوں کی کہانیوں اور شاعروں کے قصیدوں کے لیے ان کے

---

[1] ان کا ذکر میرے مقالے بابت ۱۸۷۴ء میں آچکا ہے۔

[2] ۱۸ جون ۱۸۷۵ء

ہاں کوئی جگہ نہیں۔ اسی طرح شادی بیاہ کی رسومات، میلے ٹھیلوں کا حال، شکار کی تفصیل ایسی سب فضول چیزوں کو ترک کر دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ منشی ذکاء اللہ کا طریقۂ کار یکسر مغربی ہے اور اس لحاظ سے وہ ایشیائی مورخوں میں سب سے آگے ہیں۔ ہر دَورِ حکومت کے بیان میں انھوں نے اپنی ذاتی رائے کو الگ رکھ کر انصاف پروری سے کام لیا ہے اور تعصب کو کہیں پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ اندازِ تحریر سادہ اور دل چسپ ہے۔ اس ضخیم جلد کو کہیں سے کھول کر پڑھیے، یہی خوبی نظر آئے گی۔ مؤلف نے کسی مورخ کا اثر قبول نہیں کیا، اپنے ضمیر کو رہ نما بنایا ہے۔ ہندستانی حکم رانوں کے تذکرے میں مغربی نقادوں کی ستایش یا تنقیص کی کوئی پروا نہیں کی۔ علی گڑھ سائنٹی فک سوسائٹی نے الفنسٹن صاحب کی تاریخ کا ترجمہ شائع کیا ہے لیکن منشی ذکاء اللہ کے کارنامے سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ الفنسٹن نے زیادہ تر ملکی مورّخین سے استفادہ کیا ہے اس لیے اُردو میں ترجمہ در ترجمہ کا نقص موجود ہے۔ علاوہ برایں الفنسٹن کی تاریخ نہ تو اتنی مفصل ہے جتنی پیشِ نظر کتاب اور نہ وہ تعصب سے خالی ہے۔ بس ہمیں اس عالم کا احترام کرنا چاہیے جس نے انتہائی عرق ریزی کے بعد ہمارے وطن کی مکمل تاریخ تیار کی اور ایک ایسی کمی پوری کی جو ہمارے ادب کی بے مایگی پر نکتہ چیں تھی۔"

شاہ زادہ نصیر الدین حیدر دہلوی کی تاریخ پنجاب پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی ہے[۱] ساتھ ہی ساتھ انھوں نے تذکرۃ الآفاق کے

---

۱ [illegible] ۲۴

نام سے ایک اور کتاب شروع کر رکھی ہے۔ تاریخِ پنجاب کو فقط واقعات کا بہی کھاتہ نہ سمجھنا چاہیے بلکہ اس میں ہر دور کے اداروں کی تفصیل اور صوبے کا جغرافیہ بھی شامل ہے۔ دوسری کتاب یعنے تذکرۃ الآفاق کو اخبار کی زبان میں جامِ جمشید کہنا چاہیے کیوں کہ اس میں مختلف سلطنتوں اور قوموں کا مجمل بیان ہے۔ ہر شاہی خاندان کا شجرۂ نسب فرداً فرداً دیا گیا ہے۔ یوں کہیے کہ کوئی ڈیڑھ سو کتابوں کا عطر کھینچ کر اس میں رکھ دیا ہے۔

پچھلی مرتبہ میں نے مرآۃ السلاطین نامی کتاب کا ذکر کیا تھا۔ اب یہ دہلی کے نصرت المطابع سے بڑی نفاست کے ساتھ شائع ہوگئی ہے۔ اس میں دنیا کے تمام موجودہ حکم رانوں کی تصویریں ہیں، ہر ایک کی مملکت کی خصوصیات کا ذکر ہے اور ساتھ ساتھ عالم آرا عمارات کے خاکے بھی ہیں جو سید احمد خاں کی مشہور تصنیف 'آثار الصنادید' سے لیے گئے ہیں۔

اجمیر کے ہندو عالم چھوٹن لال عیشؔ نے سرکارِ انگلیشیہ کے قوانین کے اردو ترجمے کی طباعت کا کام اپنے ذمے لیا ہے۔ اس بھاری بھرکم کتاب کا نام 'مخزن القوانین' ہے[1] اور اس کی تالیف مزید ثبوت ہے ہندستانی اردو کی مقبولیت کا۔

رام پور کے بل دیو داس چوبے نے سعدیؔ کے پندنامے کا ترجمہ ہندی میں نیتی پرکاش کے نام سے کیا ہے۔ سعدی کا یہ شاہ کار ہندستان میں کریما کے نام سے مشہور ہے اور اس کا ترجمہ کئی مرتبہ

[1] اخبار انجمنِ پنجاب ۔ ۱۰ ستمبر ۱۸۷۵ء

چھپ چکا ہے۔ نورالابصار کے ایڈیٹر نے تصدیق کی ہے کہ یہ اصل فارسی کا پورا اور صحیح ترجمہ ہے اور زبان بہت صاف اور سادہ ہے۔ کتاب الہ آباد میں چھپی ہے۔ ہر صفحے میں تین کالم ہیں، ایک میں فارسی عبارت ہے اور باقی دونوں میں ترجمہ ہندی و اُردو حروف میں دیا گیا ہے۔ محکمۂ تعلیمات نے اس کتاب کے پانسو نسخے زنانہ مدرسوں میں تقسیم کی غرض سے خریدے ہیں۔

نام ور مصنف منشی جمال الدین لکھنوی نے خاص طور پر عورتوں کے لیے 'آرسی مصحف' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں آبِ کوثر سے دُھلی ہوئی زبان میں شادی بیاہ کی رسمیں بیان کی گئی ہیں۔ باریک سے باریک نکات دیے گئے ہیں حتیٰ کہ وہ شوخ محاورے بھی ہیں جو اس تقریب میں استعمال کیے جاتے ہیں، لیکن گالی گلوج کو یکسر قلم زد کر دیا ہے۔[1] اخبار نے رائے زنی کی ہے کہ اچھا ہوتا اگر مصنف دوسرے ملکوں کے بیاہ کی ریتوں پر بھی روشنی ڈالتا تاکہ ہندستانی عورتوں کو کچھ سبق ملتا اور وہ ان بے ہودہ رواجوں کو ترک کر دیتیں جن کی وجہ سے یہ تقریب بدنام ہے۔ علاوہ بریں یہاں کی عورتوں کو بچے پالنے کا صحیح ڈھنگ آجاتا اور یورپ کی طرح وہ تعلیم کی طرف توجہ کرتیں۔

سیّد احمد دہلوی نے خاص طور پر عورتوں کے لیے 'انشائے ہادی النسا' نامی ایک کتاب لکھی ہے۔ اندازِ تحریر مصنف کے سلامتِ ذوق کا ثبوت ہے اور انھوں نے بیگماتی اُردو کی بہترین مثال

---

[1] اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ اپریل ۱۸۷۰ء

پیش کی ہو۔ دراصل یہ خطوط کا سلسلہ ہو جس کے پیرایے میں عورتوں کو صحت کے ساتھ اظہارِ خیال کا اسلوب بتلایا گیا ہو۔ شروع میں حفظِ مراتب کے لحاظ سے بڑی بوڑھیوں کو تخاطب ہو پھر بہنوں اور سہیلیوں سے گفتگو ہو اور آخر میں مغلانیوں یا نوکرانیوں کے نام فرمان ہیں۔[۱]

راجا شیو پرشاد ستارۂ ہند نے 'اُردو گرامر' کے نام سے اُردو میں اور 'ہندی گرامر' کے نام سے ہندی میں دو کتابیں شائع کی ہیں ہر ایک کی پانچ پانچ ہزار جلدیں چھاپی گئی ہیں۔ دونوں میں اس قدر یکسانی ہو کہ مسٹر جان بیمس John Beames کا یہ قول یاد آجاتا ہو: "جو اُردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں بتلاتا ہو وہ لسانیات سے بالکل بے بہرہ ہو۔"[۲] مسٹر گراوز F. S. Growse نے بھی کہا ہو کہ: "اس مصنوعی تفریق کا باب فوراً بند ہوجانا چاہیے اور بول چال کی زبان کو ہندستانی کہہ کر ملک کی واحد قومی زبان تسلیم کر لینا چاہیے۔" بدنصیبی سے اس کا زیادہ امکان نہیں کم از کم رسم الخط کے معاملے میں تو اتفاقِ رائے کی امید نہیں کیونکہ اُردو داہنے سے بائیں لکھی جاتی ہو اور ہندی بائیں سے داہنے اُردو خط ہندوؤں کو نہیں بھاتا اور مسلمانوں کو دیوناگری پسند نہیں۔ دونوں کے پیرایۂ اظہار میں بھی فرق ہو۔ لیکن دونوں کی گرامر ایک ہو اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، دراصل یہ دونوں

---

[۱] علی گڑھ اخبار ۱۱ جون ۱۸۶۵ء

[۲] Comparative Grammer of the Modern Aryan Languages جلد اوّل صفحہ ۴۴

ایک ہی زبان یعنی ہندستانی کی دو شاخیں ہیں۔ بہر حال ستارۂ ہند کی یہ کاوش مبارک باد کی مستحق ہے۔ ایک دوسری قابلِ ذکر کتاب کا نام "مفید الاطفال" ہے۔ مصنف منشی وزیر سنگھ ہیں اور یہ از سرِ نو دہلی سے اسی سال چھپی ہے۔ اسے مختصر سی انگریزی اُردو لغت سمجھنی چاہیے۔ لطف یہ کہ بحرِ خفیف میں سارا مضمون نظم کیا گیا ہے اور صرف ایسے الفاظ چُنے گئے ہیں جن کی نشست ہو سکے۔ مثلاً:

رحم Mercy (مرسی) ہے اور فضل Grace (گریس)

پہاڑی Hill ہے اور جائے Place (پلیس)

ظاہر ہے کہ مصنف نے بڑی مغز پاشی کے بعد یہ کتاب تیار کی ہوگی۔ دہلی کالج کے پرنسپل نے اس کی بڑی تعریف کی ہے اور انگریزی سیکھنے میں اسکول کے طلبا کو اس سے کافی مدد ملتی ہے۔

صاحب زادہ محمد عبید اللہ خاں خلف نواب محمد وزیر خاں کا سفرنامہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ موصوف والیِ ٹونک کے چچا ہیں۔ پنجابی نے ۱۹ جون کی اشاعت میں اس پر ایک طویل تبصرہ لکھا ہے۔ سفرنامے میں کوئی خاص بات نہیں کیوں کہ یہ پانی پت، بنارس، بریلی، مراد آباد، علی گڑھ اور آگرہ کی سیر کا تذکرہ ہے اور یہ سیر صرف ۲۵ روز میں ختم ہو گئی۔ یہ سچ ہے کہ اس سیر کا واحد مقصد تاریخی مقامات کی دید اور وہاں کے بڑے بڑے لوگوں کی ملاقات تھا۔ صاحب زادے نے سفر کے دوران میں ضرورت مند اداروں کو نوازا، خاص طور پر مدرسۃ العلوم کی مالی مدد کی۔ مسلمانوں کو عام طور پر اس مدرسے سے ہمدردی ہے۔

ایشیا کی ریاستیں اپنی اندھیر نگری کے لیے بہت بدنام ہیں۔

ہندستان کے رجواڑوں کا بھی یہی حال ہے۔ صوبہ جاتِ شمال و مغرب کے ناظمِ تعلیم کی فرمائش پر اس موضوع پر مولوی رحیم بخش دہلوی نے مراۃ الممالک نامی کتاب لکھی ہے۔ اس میں مزاحیہ حکایتوں کے پردے میں ریاستوں کی طوائف الملوکی کی خوب خبر لی گئی ہے۔ رشوت ستانی، بدانتظامی، انصاف کُشی، لوٹ کھسوٹ غرض کہ کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔ بعد ازآں مصنف نے ضروری اصلاحات بھی تجویز کی ہیں اور ان کی وجہ سے کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔[1]

پچھلے سال صوبۂ بمبئی سے ہندستان کی جتنی کتابیں شائع ہوئیں، وہ سب شہر بمبئی میں طبع ہوئی تھیں۔ سوا دو کے جن کا تعلق ہندو اساطیر سے ہے۔ ان میں سے تھوڑا تری مہاتمیہ احمد آباد میں اور قصۂ سری یال پونا میں چھپی ہے۔ آخر الذکر کتاب ایک مسلمان سیّد حیدر سبھاکر کی لکھی ہوئی ہے۔ بقیہ کتابوں کے نام یہ ہیں:

ہری چرتر۔ یعنی ہندی نظم میں بھگوت پران کا اختصار۔ حجم ۶۶ صفحات۔

کبیر پد سنگرہ۔ یعنی کبیر داس کی نظموں کا مجموعہ۔ حجم ۱۵۶ صفحات

سودائے آخرت۔ از شیخ عبدالقادر۔ حجم ۲۰۰ صفحات

زین المجالس۔ پیر دستگیر کی مدح میں نظم۔ حجم ۳۴۸ صفحات

فال نامہ
کشف الاسرار ضمیر } جادو ٹونے کی کتابیں۔ از میر خداداد
طلسماتِ عجائب

---

[1] پنجابی ۳۱ جولائی ۱۸۶۵ء

دبدبۂ سراجِ غیب۔ از میر شاہد علی۔ یہ جوتش کی کتاب ہے۔
مصباح الحیات۔ مذہبی کتاب۔ از میر حیات میسوری
مصباح المجالس۔ سیرتِ نبوی۔ از قاضی غلام علی۔ حجم ۲۹۶ صفحات
اعجازِ احمدی۔ سیرتِ نبوی۔ از غلام اصغر شیدا
قصۂ فغفورِ چین۔

لیلیٰ مجنوں کے دو نئے ایڈیشن۔ ایک خلیفہ محمد کا جو ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے اور دوسرا سید فضل کا جو ۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۸۷۴ء میں بمبئی میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی فہرست میں دیوانِ ولی کا وہ ایڈیشن بھی ہے جس کی نسبت میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اس کا ایک نسخہ مسٹر چیٹفیلڈ نے از راہِ عنایت مجھے بھیجا ہے۔ موصوف صوبۂ بمبئی میں ناظمِ تعلیمات کی خدمت پر فائز ہیں۔

اودھ اخبار نے جن نئی اُردو کتابوں کا نام چھاپا ہے ان میں سے حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں:۔

عجائب القصص۔ اس میں تمام پیغمبروں کے حالات میں سے دل چسپ ترین واقعات کا انتخاب ہے۔

طلسمِ ہند۔ ملک کے سلاطین اور راجگان کا تذکرہ۔

تاویل منام۔ ایک عربی کتاب کا ترجمہ۔ مترجم بشارت علی خاں۔

مہابھارت کے ہندی ترجمے کی طبع ثانی چار جلدوں میں۔ پہلا ایڈیشن کلکتہ میں ۱۸۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔

مدیر پنجابی نے اعلان کیا ہے[1] کہ وہ پروفیسر آزاد کی مثنویوں کا

---

[1] ۲۶ دسمبر ۱۸۷۴ء

انتخاب 'اُستادِ خداداد' کے نام سے نکال رہے ہیں۔

روہیل کھنڈ کی ادبی انجمن کی سرپرستی میں شاستری تاراچند نے 'استری دھرم سنگرہ' نامی کتاب بریلی میں شائع کی ہے۔ اس میں عورتوں سے متعلق قوانین کا انتخاب ہے۔

اس زمانے میں ہندی کی جو سب سے اہم کتاب نکلی وہ بلاشبہ "یجوروید" کا ترجمہ ہے۔ اسے علی گڑھ کے ٹھاکر گوری پرشاد سنگھ نے چھاپا ہے۔ یہ وہی ہیں جو منگل سماچار نامی اخبار ہندی اُردو دونوں زبانوں میں نکالتے ہیں۔

اودھ کے محکمۂ تعلیم کی فرمایش پر حال میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے حسبِ ذیل کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں:-

واقعہ نگارِ انگلستان۔ Collier's British Empire کا ترجمہ از مولوی ابوالحسن۔

عطرِ مجموعہ۔ Urdu Poetical Reader کی شرح۔

گلشنِ فیض۔ راجا بھوج کی کہانی کا اُردو ترجمہ۔ از رام رتن لال

بہارستانِ اشعار۔ رائے کشن کمار مرادآباد کے اُردو کلام کا مجموعہ جس کی اخبارِ عالم نے بڑی تعریف کی ہے۔

بنارس کالج کے پروفیسر لکشمی شنکر مسرا نے سائنٹفک مضامین پر جو مقالے پڑھے تھے، ان کا ترجمہ ہندی میں چھپ گیا ہے۔

ہندستانی میں عیسائی پادریوں نے جو مفید کتابیں اور رسالے تیار کیے ہیں، ان کا ذکر آگے آئے گا۔

مدراس کے مولا بخش ہندستانی کے علاوہ چھو زبانوں پر تامل

تلیگو، کنڑی، ملاباری، گجراتی اور مرہٹی) کے گیت گا سکتے ہیں۔ انھوں نے موسیقی کے چار بنیادی عناصر۔ تال، سُر اور راگ تان ۔۔ پر ایک بصیرت افروز کتاب لکھی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ قدیم موسیقی کے اصولوں سے لوگ آشنا ہوں اور ان کی بے توجہی سے یہ نادرِ فن فنا نہ ہو جائے[1]۔

ڈاکٹر فیلن کی عظیم الشان ہندستانی ڈکشنری کا پہلا حصّہ شائع ہوا ہے۔ اس طرح کے ۴۸ صفحات کے کوئی ۲۵ حصّے ہوں گے۔ اتنے بڑے کام کو اس خیر و خوبی سے انجام دے کر فاضل لغت نگار نے اپنی لگن اور علم پرستی کا ثبوت دیا ہے۔

صوبہ جاتِ شمال و مغرب کی حکومت کے مترجم منشی سدا سکھ نے ایک انگریزی اُردو لغت تیار کی ہے۔ اس میں ہزار سے زیادہ صفحات ہیں اور الہ آباد میں چھپی ہے[2]۔

پہلے کبھی میں نے الہ آباد کے پادری جے۔ ڈی۔ بیٹ J.D. BATE کا نام لیا تھا جو ایک ہندی لغت تیار کر رہے تھے۔ اب بہت بڑی تقطیع کے آٹھ سو صفحوں پر یہ ڈکشنری بنارس سے نکلی ہے اور موصوف نے ازراہِ کرم مجھے اس کا ایک نسخہ بھیجا ہے۔ ہندی کی اشاعت کے ساتھ اس قسم کی لغت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی تھی کیونکہ حکومت کی نوازش سے اس زبان نے خوب بال و پر نکالے ہیں۔ ان میں پچاس ہزار الفاظ یا مشتقات ہیں یعنی ٹامسن صاحب کی لکھی ہوئی

---

[1] پنجابی ۲۶ دسمبر ۱۸۷۴ء

[2] پنجابی ۱۰ جولائی ۱۸۷۵ء

واحد ہندی لغت سے کوئی ۲۵ ہزار زیادہ۔ مسٹر بیٹ بیپٹسٹ مشن سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ امر نہ بھولنا چاہیے کہ یہ مشن ہمیشہ علمی وادبی کام کرتا رہا ہے۔ پہلے تو اس کے کارکن اُردو کی خدمت کرتے رہے لیکن اس وقت تین فاضل پادری قدیم وجدید ہندی ادب کے مختلف شعبوں پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے اتھرنگٹن صاحب Etherington نے ہندی زبان کی گرامر لکھی ہے۔ کیلاگ صاحب Kellogg اب نہایت وسیع پیمانے پر ادبی و بول چال کی ہندی گرامر تیار کر رہے ہیں۔ مسودے کے بعض حصے میری نظر سے گزرے ہیں اور کہہ سکتا ہوں کہ یہ اپنی قسم کی تنہا کتاب ہے۔ بیٹ صاحب کی لغت کا ذکر تو اوپر آہی چکا ہے۔

مسٹر جون بیمس کے گرامر[1] کی دوسری جلد بھی نکل آئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تقابلی لسانیات کے نقطۂ نظر سے یہ ہمارے زمانے کی اہم ترین کتابوں میں سے ہے۔ ہندیات کے شہرۂ آفاق ماہر ڈاکٹر مرے مچل Murray Mitchell کی سند میرے قول کی تصدیق کرتی ہے[2]۔

مسٹر گراؤز نے دو دو سو صفحوں کی دو جلدوں میں متھرا کے ضلع کا حال لکھا ہے۔ متھرا کی اہمیت ہندستان کی تاریخ میں اتنی نہیں جتنی کہ دیومالا میں ہے۔ اس دل چسپ کتاب میں تصویروں اور نقشوں سے

---

[1] Comparative Grammer of the Modern Aryan Languages of India

[2] Indian Antiquary جون ۱۸۷۵ء

علاوہ قدیم سنسکرت وہندی کتابوں کے اقتباس بھی دیے گئے ہیں۔ اتفاق سے ان تین ویدوں کے ایک ہندی خلاصے' ولیم سار' کا نام آگیا ہو جس کے متعلق اب تک کچھ نہیں سُنا گیا تھا۔ ایک ہندو فرقے کے بانی ولبھا چاریہ کے مت سے تعلق رکھنے والی چند نایاب ہندی کتابوں کا بھی ذکر آیا ہو۔ تُلسی داس کی راماین کا جو عمدہ ایڈیشن رام سین نے تیار کیا ہو، اس پر رائے دیتے ہوئے گراوز صاحب نے کہا ہو کہ والمیک کی سنسکرت رامائن اس کا مقابلہ نہیں کرتی۔[1]

(۳)

ہندستان میں اخبار بینی کا شوق روز بہ روز بڑھتا جاتا ہو اور یہی حالت رہی تو کچھ عرصے کے بعد بغیر اخبار پڑھے یورپینوں کی طرح ہندستانیوں کا بھی کھانا ہضم نہ ہوگا۔ اس روزافزوں شوق پر رائے زنی کرتے ہوئے ایک دیسی اخبار شاکی ہو کہ لوگ محض سنسنی خیز خبروں کے شائق ہیں اور سنجیدہ مضامین سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔

ہندستان میں پریس آزاد ہو۔ تاہم حکومت نے حال ہی میں یہ قانون پاس کیا ہو کہ کوئی سرکاری نوکر کسی سیاسی اخبار کا مالک یا ایڈیٹر نہ ہو اور نہ بلا اجازت اس میں مضمون لکھے۔ ہندستانی اخباروں نے اس پابندی کی سخت مخالفت کی ہو کیوں کہ وہ حکومت و رعایا کو باہم شیر و شکر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہو کہ ہر حکومت پر عربی کی یہ مثل صادق آتی ہو کہ اگر دوا بھی کڑوی ہو تو اسے تھوک دو!

---

[1] Calcutta Review اکتوبر ۱۸۷۵ء

ان غیر ضروری پابندیوں کی وجہ سے اخباروں کو بڑا نقصان ہوگا کیوں کہ خبررسانی کا کوئی مستند ذریعہ اب ان کے پاس نہیں۔

لاہور کے کمشنر نے ایک اور گُل کھلایا۔ انھوں نے حکم صادر کیا کہ کسی اخبار کا ایڈیٹر یا نامہ نگار عدالت کے احاطے میں قدم نہ رکھنے پائے۔ اخبار انجمن پنجاب اس فرمان پر سخت برہم ہے۔ لکھتا ہے: "اب تک ہمارا خیال تھا کہ اخباروں کو مراعات دینے سے حکومت کا یہ منشا ہے کہ عوام کو نیک و بد کی خبر ہو سکے اور حکومت و رعایا میں تعلق پیدا ہو سکے لیکن اگر پردہ پوشی کا یہ عالم ہے تو اخبار کیا کر سکتے ہیں؟"

اسی اخبار میں اخبار نویسی پر ۳۰ کالم کا ایک طولانی مضمون دیکھنے میں آیا[1] اور میرٹھ کے اخبارِ عالم نے بھی اسی موضوع پر دل کی بھڑاس نکالی ہے۔[2] پہلے مضمون میں اخباروں کی اہمیت، اُن کے فرائض اور ان کے لیے آزادی کی ضرورت پر بحث کی گئی ہے۔ بعد ازاں اخبارنویسوں کی صلاحیت پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ وہ کس طرح عوام کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ۱۸۶۳ء کے مقالے میں اس قسم کے مضامین کا خاکہ میں دے چکا ہوں لہٰذا انھیں پھر سے دُہرانا بے کار ہے۔[3] ہر دو مضمون میں اخبار و اخبارنویس کا اتنا بلند معیار قائم کیا ہے جو اس وقت تو عنقا ہے البتہ اخبار انجمن کے مقالے کے دوسرے حصّے میں اُردو کے خاص خاص جریدوں

---

[1] اخبار انجمن پنجاب ۱۲ فروری ۱۸۷۵ء

[2] اخبار عالم ۱۱ مارچ ۱۸۷۵ء

[3] علی گڑھ سائنٹفک گزٹ بابت ۱۰ ستمبر ۱۸۷۵ء میں بھی اسی قسم کا مضمون دیکھنے میں آیا۔

پر اظہارِ خیال ہے جو کئی لحاظ سے دل چسپ ہے۔ اس کا خلاصہ دیتے ہوئے میں یہ کہہ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ تبصرہ ضرورت سے زیادہ سخت ہے:

"اودھ اخبار لکھنؤ کا ممتاز جریدہ ہے جس میں خبروں اور مفید مضامین کا اچھا انتخاب ہوتا ہے۔ ایڈیٹر نے شگفتہ طرزِ تحریر پایا ہے اور وہ اپنے فرض سے آگاہ ہے۔ اُسے کئی واقف کار مضمون نگاروں کا تعاون بھی حاصل ہے۔ اخبار یقیناً ممتاز ہے لیکن اس کے ایڈیٹر کو تاریخ یا جغرافیہ وغیرہ سے زیادہ لگاؤ نہیں۔ اور کچھ نہیں تو وہ ان ترجموں کو ہی پڑھ لیتے جو انگریزی سے کیے گئے ہیں تو ان کی معلومات میں اضافہ ہو جاتا۔ بہرحال وہ جو لکھتے ہیں اس میں جدت نہ ہوتے ہوئے بھی سادگی اور تازگی ضرور ہوتی ہے۔

نور الابصار صفِ اوّل کا اخبار ہے۔ اپنے مضامین کی سنجیدگی اور ایڈیٹر کی قابلیت کی وجہ سے اس کا دائرہ وسیع ہے۔ گو کہ ایڈیٹر کبھی کبھی بہکی ہوئی باتیں کرنے لگتا ہے لیکن اس کی حب الوطنی میں ایسا خلوص ہے کہ یہ کڑوی دوا بھی گوارا کرنی پڑتی ہے۔

علی گڑھ کی سائنٹی فک سوسائٹی کا اخبار بھی اہم ہے۔ اس کے ایڈیٹر نے قدیم و جدید خیالات کو اس طرح سمویا ہے کہ ان کے قلم میں بڑا زور ہوتا ہے۔ گو کہ خبروں کا انتخاب اچھا نہیں ہوتا لیکن مضامین عام طور پر خوش ذوقی اور افادیت کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ مناسب ہو کہ ایڈیٹر اپنی زبان کو زیادہ آسان کرے اور مشکل و پیچیدہ ترکیبوں کا استعمال کم کر دے۔

پنجابی کو ایک لائق مدیر کی خدمات کا شرف حاصل ہے۔ اس کی

نیک نیتی مسلّم ہی۔ البتہ اخبار میں کبھی کبھی بے ترتیبی ہوتی ہی اور طرزِ تحریر بھی رُوکھا پھیکا ہوتا ہی۔

کوہِ نور کو زبان کی غلطیوں کی کبھی پروانہ رہی اور اب تو غلط نویسی کا یہ حال ہی کہ جو طالب علم اسے پڑھے گا، اُردو بھول جائے گا۔ قطع نظر اس سے اخبار کے نامہ نگاروں کا دائرہ وسیع ہی اور اس وجہ سے خبروں کا انتخاب بہت اچھا ہوتا ہی۔ اخبار کے مالک منشی ہرسکھ رائے کو اپنے کام کا بڑا تجربہ ہوگیا ہی۔ ان کے مضامین نہایت کارآمد ہوتے ہیں۔ طرزِ بیان کی بات دوسری ہی۔

اخبارِ عالم میرٹھ کی وقعت میں شبہے کی گنجایش نہیں۔ اس کے ایڈیٹر آزاد خیال، وطن دوست اور اخلاص پرور ہیں۔ البتہ خبریں باسی ہوتی ہیں اور زبان بھی زرا پھیکی ہوتی ہی۔

کشف الاخبار۔ اپنی خبروں کے لیے مشہور ہی کیوں کہ اس کے لیے بمبئی میں بڑی سہولتیں موجود ہیں۔ ایڈیٹر کے قلم میں زور بھی ہی گو کہ وہ اکثر اپنا ذکر کیا کرتے ہیں۔

لارینس گزٹ ہماری زبان کے بہترین اخباروں میں سے ہی لیکن اس کی اشاعت محدُود ہی۔

اُردُو گائڈ دوسرے درجے کا اخبار ہی۔

کارنامۂ سخن۔ پُرانی لکیر کا فقیر ہوتے ہوے بھی دل چسپی سے خالی نہیں۔ تعجب ہی کہ ایڈیٹر گو کہ مولوی ہی پھر بھی جابجا املا کی غلطیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مجموعی طور پر اچھا اخبار ہی۔

دبدبۂ سکندری سرکاری اخبار ہی۔ اُدے پور کے ایک مضمون نگار

کی وجہ سے اس کی رونق ہے۔ ایڈیٹر کے مضامین بھی بُرے نہیں ہوتے۔

شعلۂ طور کان پور کو اپنی ترتیب اور طرزِ انشا کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے۔ یہ سب ایڈیٹر کی قابلیت کا ظہور ہے۔ یہ کمی ضرور ہے کہ وہ جدید علوم سے ناواقف ہیں اس لیے ان کا دائرۂ خیال محدود ہے۔

اُردو دلی گزٹ کی اشاعت کم نہیں کیوں کہ اسے حکومت کی سرپرستی ملی ہوئی ہے لیکن اس کے لکھنے کا ڈھنگ بے نمک اور پُھسپھسا ہوتا ہے۔

آفتابِ پنجاب بھی خوب بکتا ہے کیوں کہ یہ انوار الشمس کا جانشین اور کوہِ نور کا دودھ بھائی ہے۔ اپنی رواداری اور خبر رسانی کے لیے مشہور ہے۔

ہندو پرکاش امرت سر کا کوئی پرچہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا اس لیے اس کے متعلق کوئی رائے زنی نہیں کی جاسکتی[۱]۔

اتالیق پنجاب۔ یہ ہم عصر نہ تو قوم و ملک کا ہم درد ہے اور نہ نئے خیالات کا حامی۔ جب تک اس کی کایا پلٹ نہ ہو اس کا شمار اچھے اخباروں میں نہیں ہوسکتا۔

پٹیالہ اخبار اپنی ریاست کا ترجمان ہے۔ اس کے سوا کیا کہا جائے کہ ایڈیٹر کی زبان پر سونے کی مُہر لگی ہوتی ہے؟ یہ نہ ہوتا تو ان کا پرچہ ملک کا بھلا کرتا۔

تہذیب الاخلاق مضمون و بیان کے بلند معیار کی وجہ سے قابلِ ستایش ہے۔ یہ اخبار ہر حیثیت سے خرد افروز ہے۔

۱۔ اخبارِ عالم نے لکھا ہے کہ اس سال جولائی میں یہ اخبار بند ہوگیا

اس مبسوط تبصرے کے بعد اخبار انجمنِ پنجاب لکھتا ہو کہ: اگر اودھ اخبار کی دل چسپی سائنٹی فک گزٹ کی سنجیدگی، نورالابصار کی دردمندی، اخبارِ عالم کی نیک نیتی، پنجابی کی رواداری اور تہذیب الاخلاق کی آزاد خیالی کو یک جا کر دیا جائے تو یہ اخبار نویسی کی معراج ہوگی:

موسیے ساں اِلیر Saint Hilaire نے میرے مقالات پر ریویو کرتے ہوتے بالکل ٹھیک کہا ہو کہ ہندستان میں تہذیبِ جدید کی روزافزوں مقبولیت کا ایک بیّن ثبوت، ہر سال نئے اخباروں کا اجرا ہو اور عجیب بات یہ ہو کہ ہر اخبار کے خریدار نکل آتے ہیں۔ گویا حکومت صوبتی زبانوں کی ہمت افزائی میں لگی ہوئی ہو۔ تاہم اس سال بھی ہندستان کے درجنوں نئے اخبار نکل آئے ہیں۔ ان کی فہرست مندرجۂ ذیل ہو:۔

احسن الاخبار حیدرآباد دکن سے نکلا ہو۔ اسی نام کا ایک اور جریدہ بریلی سے نکلا کرتا ہو۔

اجمیر اخبار اُردو میں نکلنا شروع ہوا ہو۔

اخبار انجمنِ ہند کو لاہور یا لکھنؤ کی انجمنوں سے کوئی تعلق نہیں اور اخبارِ عالم کی رائے تو یہ ہو کہ اس کا ایڈیٹر معمولی صلاحیت کا آدمی ہو اس لیے اس کا اخبار بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

اخباروں کا قبلہ گاہ۔ ستمبر میں لاہور سے مولوی فتح الدین کی ادارت میں نکلنے والا تھا۔ اودھ اخبار اس نام سے سخت خفا ہو کیوں کہ اس سے تعلّی کی بو آتی ہو۔

آتالیقِ ہند اور بہارِ بندھو کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔
پچھلے مقالے میں میں نے جس راج پوتانہ اخبار کا نام لیا تھا اس کا اصلی عنوان چراغِ راجستھان ہی۔ پنجابی[1] کا خیال ہی کہ یہ اخبار اس پچھڑے ہوئے صوبے میں ترقی کے بیج بونے میں مدد دے گا۔ اس کی قیمت بھی صرف ایک آنہ فی پرچہ رکھی گئی ہی تاکہ کسی کو بار نہ ہو۔
افتخار الاخبار دلّی کا دہ روزہ اخبار ہی۔
جگت آشنا۔ اخبار انجمن پنجاب کے ایک مضمون میں اس اخبار کی نسبت ذکر کیا گیا ہی۔
جریدۂ روزگار مدراس سے شاہزادۂ ویلز کی آمد کے موقع پر نکلا ہی اور اس میں ان کے دورے کا حال بالتفصیل چھپا کرے گا۔
کاشی پترکا۔ ہندی کا پندرہ روزہ سیاسی، علمی و ادبی اخبار۔
مظہر العلوم غازی پور سے مسٹر سانڈرس Saunders کی ادارت میں ماہوار نکلا کرتا ہی۔ پنڈت کاشی ناتھ نے لکھا ہی[2] کہ اس اخبار کا اندازِ تحریر اس قدر سلجھا ہوا ہی کہ یقین نہیں آتا کہ کسی ولایتی کے قلم کا جوہر ہی۔ یہ علمی رسالہ پہلے مرادآباد سے نکلتا تھا
محافظِ بنگلور شہر کے 'زمرۂ احباب' کا پندرہ روزہ اخبار ہی۔ ہر نمبر میں اُردو کے چار اور انگریزی کے دو صفحے ہوتے ہیں۔ طباعت دیدہ زیب اور کاغذ عمدہ۔ پنجابی نے اس کے ایک مضمون کی تردید کی ہی جس میں مذہبی رواداری کی مخالفت کی

---

[1] ۱۵ مئی ۱۸۷۵ء

[2] علی گڑھ اخبار ۱۲ مئی ۱۸۷۵ء

کی گئی ہے اور لیا گیا ہے کہ مسلم اخباروں میں صرف اسلام کے نقطۂ نظر کی اشاعت ہونی چاہیے۔ پنجابی کی رائے ہے کہ اس سے اخباروں کی اشاعت محدود ہو جائے گی۔

مرآۃ الہند جس کا ذکر اودھ اخبار ۱۰ اکتوبر ۱۸۷۵ء میں ہے۔

مرقع تہذیب لکھنؤ کی انجمنِ تہذیب کی طرف سے سالِ رواں کے پہلے مہینے سے نکلنے لگا ہے۔ وہ اپنے کو انصاف اور ترقی کا حامی بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہم لمبے چوڑے دعوے نہیں کرتے مگر روشن خیالی کی تلقین میں ضرور پیش پیش ہیں۔

رہبرِ ہند اور ہندستان کی عام رائے کا نمونہ منشی نادر علی شاہ سیفی نے لاہور سے یکم اپریل سے نکالا ہے۔ وہ اپنے کو ملک کا مخلص خادم بتاتے ہیں۔

تاج الاخبار رام پور کا سرکاری گزٹ ہے۔ منشی امیر احمد کے صاحب زادے کی ادارت میں نکلتا ہے۔ اودھ اخبار نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔

خیر خواہِ عالم (دہلی) کا ضمیمہ ضیاء الاسلام کے نام سے اب پندرہ روزہ اخبار کی شکل میں نکلنے لگا ہے۔ اسلام پر عیسائی پادری جو اعتراض کیا کرتے ہیں، اس کی تردید کے لیے یہ رسالہ وقف ہے۔ خیر خواہِ عالم بہ ذاتِ خود سیاسی و ادبی پرچہ ہے۔

بڑودہ سے اب تک کوئی اخبار نہ نکلتا تھا۔ نئے مہاراجا مادھوراؤ نے اب یہ کمی پوری کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

کالیستھ سماچار کچھ عرصے سے بند تھا۔ اب ایک نئے ایڈیٹر

منشی رام کشن پروفیسر کیننگ کالج کی ادارت میں پھر سے نکلا ہی۔ اس کے پُرانے مدیر منشی گوکل پرشاد رسا تھے[۱]

کئی پُرانے اخبار جو ہفتے میں ایک بار چھپا کرتے تھے اب دو دو مرتبہ نکلنے لگے ہیں۔ اُردو زبان کا سب سے مشہور جریدہ اودھ اخبار ہر دوسرے روز نکلنے لگا ہی اور عجب نہیں کہ کچھ عرصے بعد روزنامہ ہی ہو جائے۔

مسٹر مردوک Murdock نے عیسائیوں کے کئی مذہبی پرچوں کا ذکر کیا ہی[۲] ان میں سب سے زیادہ مقبول لدھیانہ کا ہفتے وار نور افشاں ہی جسے دو سال پہلے پادری Wherry نے جاری کیا تھا۔ اسی کی توڑ پر دہلی سے ضیاء الاسلام کا اجرا ہوا ہی۔ بچوں کے لیے خیر خواہ اطفال کے نام سے ماہانہ رسالہ شایع ہو رہا ہی جس کے ہندی ایڈیشن کا نام بال ہتکر ہی۔ لندن مشن کے پادری Budden الموڑہ سے ہندی میگزین نکال رہے ہیں۔ ادھر لکھنؤ سے اُردو اور ہندی دونوں میں "لکھنؤ ٹائمنس" چھپ رہا ہی۔ آتالیق ہند کو آتالیق پنجاب سے کوئی تعلق نہیں ہی۔ پہلا نمبر لاہور سے دسمبر ۱۸۷۰ء میں نکلا تھا۔ اداریے میں کہا گیا ہی کہ اخبار حکومت و رعایا اور ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو مستحکم تر کرنے کے لیے وقف ہوگا۔ ساتھ ساتھ وہ ان بدعنوانیوں کا قلع قمع بھی کرے گا جو ملک کی ترقی میں حائل ہیں۔

---

[۱] اودھ اخبار ۲۲ اگست ۱۸۷۰ء

[۲] Conference on Urdu and Hindi literature P. 103

اخبار انجمنِ پنجاب نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: "ہم عصر 'اتالیقِ ہند' کا تعارف اپنے ناظرین سے کراتے ہوئے ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ہم اس کے ہر نمبر کو غور سے پڑھتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ادارت محنت اور دیانت سے کی جاتی ہے۔ یہ جس اصول پر چل رہا ہے اس پر ہر اخبار کو عمل پیرا ہونا چاہیے۔ یعنی حکومت کو صحیح مشورہ دینا، عوام کی خدمت کرنا اور اپنے کو ان کے احساسات کا ترجمان بنانا۔ اتالیقِ ہند اس راستے پر آزادی اور استحکام سے چل رہا ہے۔ اس کے ایڈیٹر سیفی صاحب کا علم و فضل سب پر روشن ہے اور ان کے قلم سے جو کچھ بھی نکلتا ہے، اُسے سرمۂ بصیرت سمجھنا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے اخبار کا اجرا صوبۂ پنجاب کی خوش قسمتی کا باعث ہوگا اور یہاں اُسے بے قدری کی شکایت نہ ہوگی۔ ملک کے سب جریدوں کو اس کی پیروی کرنی چاہیے۔"

علی گڑھ اخبار رقم طراز ہے: "ہنوز ہم نے اتالیقِ ہند کا ذکر نہ کیا کیوں کہ اس کی بقا کی طرف سے ہمیں کھٹکا تھا۔ مقامِ مسرت ہے کہ اب اس کی کامیابی ثابت ہوگئی اور اس کی خوش ترتیبی کی طرف سے ہمیں کامل اطمینان ہوگیا۔ ایڈیٹر کی آزاد خیالی اور انشا پردازی کی وجہ سے یہ معاصر ایک ممتاز حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ اچھے اچھے اخبار جنھیں اپنی خبر رسانی پر گھمنڈ ہے، اور جو اپنی مقبولیت کے مظاہرے کے لیے ہر سال حجم بڑھاتے جاتے ہیں، اتالیقِ ہند کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ دعا ہے کہ اس نئے باغ میں ایسے شاداب پھل آئیں جو اہلِ وطن کو محظوظ کردیں۔"

ان تعریفوں کے باوجود یہ اخبار مرگِ ناگہانی سے نہ بچ سکا اور پنجابی (۲۱ جولائی ۱۸۷۵ء) نے اس کے بند ہونے کا اعلان کیا ہے۔

مَیں ممنون ہوں کہ احبابِ ہند مجھے اُردو اور ہندی کے بہت سے اخبار بھیجا کرتے ہیں اور مَیں اعتراف کرتا ہوں کہ ان میں مجھے دل چسپی کا کافی سامان مل جاتا ہے۔ اگر خاص مضامین کا خلاصہ بھی کیا جائے تو ایک ضخیم جلد بن جائے۔ پنجابی کے ایک پرچے کو یوں ہی اٹھاکر دیکھا تو اس میں نظم کے عمدہ نمونوں کے علاوہ ادبی مضامین اور نئی کتابوں کے تبصرے دیکھنے میں آئے۔ علاوہ بریں ڈبلن یونی ورسٹی کے پروفیسر سید اولاد علی کا ایک دل چسپ مکتوب بھی تھا جس میں سید احمد خاں سے شکایت تھی کہ وہ خواہ مخواہ انگریزی کے الفاظ کی بھرتی کرتے ہیں جب کہ ان کے ہم معنی الفاظ اُردو یا ہندی میں پہلے سے موجود ہیں۔ اگر کسی چیز کے لیے اُردو میں لفظ نہ ہو تو مجبوری ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک ہندستانی بیوی اپنے شوہر سے کہتی ہے: تمھارے آفس جانے کا ٹائم ہوگیا۔ میری رائے میں 'وقت' اور 'دفتر' کے ہوتے ہوئے 'آفس' اور 'ٹائم' کی ضرورت نہیں۔ مولانا رومیؒ نے ٹھیک کہا ہے کہ: "لفظ چوں وقراست وطائر معنی است"۔

پروفیسر اولاد علی کا خیال ہے کہ ہندستانی اخباروں کا اندازِ تحریر خالص ملکی ہونا چاہیے۔ انگریزی الفاظ کی بھرتی سے ہماری زبان کی بآڑھ ماری جائے گی، ویسے ہی جیسے یورپ کے علمی یا درباری

حلقوں میں فرانسیسی کے چلن نے قومی زبانوں کو ترقی حاصل نہ کرنے دی۔ اب جاکر یورپین زبانوں نے فرانسیسی کے تسلط سے آزادی حاصل کی ہی۔ اسی طرح وہ دن بھی آئے گا جب ہندستانی اپنے خوابِ خرگوش سے بیدار ہوں گے اور اپنی زبانوں کو پھر سے زندہ کریں گے۔ یہ تو فطری امر ہی کہ انگریز اپنی زبان کو ہندستان میں رائج کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن سید احمد خاں اور ان کے پیرووں کو کیا پڑی ہی کہ بلا سمجھے بوجھے اس تحریک میں انگریزوں کا ہاتھ بٹائیں؟ اصل میں تو اہلِ ہند کو قدیم عربوں کی پیروی کرنی چاہیے جنھوں نے اپنی زبان میں یونانی کتابوں کو منتقل کیا اور صرف وہ یونانی الفاظ اپنائے جن کا ترجمہ محال تھا ہمیں کبھی یہ غلطی نہ کرنی چاہیے کہ انگریزی الفاظ تو لے لیں اور ان کے ہم معنی اُردو الفاظ کو تج دیں۔ آخر 'عیسیٰ' کی جگہ 'جیس' 'موسیٰ' کی جگہ 'زز' 'داؤد کی بجائے 'ڈیوڈ' اور 'محمدؐ' کی جگہ 'میہو میٹ' لکھنا کس قدر مضحکہ خیز ہی؟ کسی احمق نے تو 'الہ آباد' کے بدلے 'ایلاہاباڈ' لکھنا شروع کر دیا ہو۔ علمی اصطلاحات کے معاملے میں شاید مجبوری ہو لیکن وہاں بھی عربی و سنسکرت کے بہت سے علمی الفاظ مل سکتے ہیں۔ علاوہ بریں ہم اصطلاحات وضع کر سکتے ہیں اور یہ انگریزی کے استعمال سے بہرحال بہتر ہوگا۔ انگریزی نے بھی تو لاطینی و یونانی کی اصطلاحات مستعار لی ہیں پھر کسی ایسی زبان کے آگے ہاتھ کیوں پھیلایا جائے جو خود دوسری زبانوں کی محتاج ہو۔ جہاں تک ناموں کا تعلق ہو۔

ان میں بھی تبدیلی واجب نہیں۔ انگریزوں کی طرح 'دلی' کو 'ڈلہی'
یا 'اودھ' کو 'آوڈ' کہنا کہاں کی عقل مندی ہی۔کسی گدھے نے
تو سراج الدولہ کے بدلے 'سورج دولہ' لکھ مارا ہو۔

اگر ولایتی الفاظ کے استعمال سے مقصد انگریزی زبان کی
ترویج ہو تو اس اینچ پینچ سے کیا حاصل، سیدھے سیدھے انگریزی
کی تعلیم دیجیے۔ اگر مُراد یہ ہو کہ لوگ علمی زبان سے واقف ہوں تو
یہ طریقہ قطعًا غلط ہی۔کسی ہندستانی سے پوچھ دیکھیے کہ وہ
'کریسپانڈنیس' Correspondence سمجھتا ہو یا 'خط وکتابت'
'آرٹکل' Article سمجھتا ہو یا 'مضمون'۔ کیا یہ ضروری ہو کہ جدید
علوم سے آشنا ہونے کے لیے ہم اپنی زبان بھول جائیں انگریزی
لفظ کیمسٹری Chemistry 'کیمیا' سے نکلا ہو تو پھر ہم اس
عام فہم لفظ کو تج کر غیر مانوس انگریزی کو کیوں چلن دیں"

دست خط کے معاملے میں یوربین طریقے کی نقل بھی فضول
ہی۔ نام کے اجزا کے پہلے حروف کو گھسیٹ کر لکھ دینے سے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

(۴)

اخبار ہندو پرکاش تعلیم کے قدیم وجدید طریقوں کا مقابلہ
ان الفاظ میں کرتا ہی:[۱] "پرانے زمانے کی مشکلات اور اس
دور کی آسانیوں میں زمین وآسمان کا فرق ہی۔ پہلے کتابیں قلمی
ہوتی تھیں جن کی قیمت ہر ایک ادا کرسکتا تھا، اب چھاپے خانوں

[۱] ۲۴ فروری ۱۸۵۰ء

نے یہ مشکل آسان کردی ہو۔ پُرانے استادوں کا تاریخ وجغرافیے کا علم محدود ہوتا تھا، اب ڈکشنری وغیرہ نے ہماری معلومات کا دائرہ وسیع کر دیا ہو۔ انگریزی ہمارے لیے عربی یا سنسکرت سے کم مشکل نہیں۔ لیکن اب اسے چند سال میں سیکھ سکتے ہیں جب کہ جاے کہ پہلے سنسکرت سیکھتے سیکھتے ساری عمر بیت جاتی تھی۔"

اودھ اخبار[۵] نے راے دی ہو کہ نایاب قلمی کتابوں کو چھاپے خانے کی وساطت سے منظرِ عام پر لانا چاہیے۔ ہندو مسلمانوں کو عالموں کی ایک کمیٹی بنانی چاہیے جو قلمی کتابوں کا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ ان میں سے کون کون سی طباعت اور اشاعت کے قابل ہیں۔ اخبار نے مسلمانوں کو ترغیب دی ہو کہ وہ اس ضمن میں پیش قدمی کریں۔ برادرانِ وطن خود بہ خود ان کے ساتھ لگ جائیں گے۔

گزشتہ ۲۴ مارچ کو دہلی میں وائس راے لارڈ نارتھ بروک کی صدارت میں طلبا کو انعام دینے کی رسم ادا کی گئی۔ شروع میں ناظمِ تعلیمات میجر ہول رائڈ نے اپنی تقریر میں صوبے کی تعلیم و ترقی پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں وائس راے بہادر نے انعامات تقسیم کیے۔ خواجہ حالی کو ان کی ممتاز تصنیف 'مجلس النسا' کے صلے میں چار سو روپے کا انعام عطا ہوا۔ زنانہ اسکول کی طالبات کو بڑے لاٹ کی لڑکی نے انعامات بانٹے۔

بریلی کالج کے پرنسپل نے ۱۸۷۴ء کی رپوٹ میں لکھا ہو کہ مسلمان اپنے بچوں کو خوشی خوشی مدرسے بھیجنے لگے ہیں جس

۵۔ ۱۷ ستمبر ۱۸۷۵ء

جلسے میں یہ رپوٹ پڑھی گئی اس میں صوبے کے ناظمِ تعلیمات بھی موجود تھے۔ انھوں نے تصدیق کی کہ صوبے کی درس گاہوں میں بریلی کالج کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ فارغ التحصیل طلبا کو انھوں نے مشورہ دیا کہ علم سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رکھیں اور ان میں سے کئی کے نام گنائے جو اپنی قابلیت کی وجہ سے بڑے بڑے عُہدوں پر مامور ہیں[۱]

پنجابی نے لکھا ہے کہ[۲] سرکاری درس گاہوں میں تین باتوں کا ہونا لازمی ہے: (۱) علم وادب کی تعلیم (۲) زبانوں کا درس (۳) طلبا کے جسم اور دماغ کی تربیت۔ جہاں تک جدید علوم وادبی مضامین کا تعلق ہے، ہم صوبۂ پنجاب کے مداح ہیں اور اس کی کوششیں بروئے کار آرہی ہیں۔ زبانوں کے درس پر بھی پورا پورا زور دیا جارہا ہے اور ان میں سے کئی کے پڑھانے کا انتظام کالجوں میں کیا گیا ہے۔ پھر بھی ایک ایسی خامی نظر آتی ہے جس کا ازالہ فوراً ہونا چاہیے۔ ہمارا اشارہ تلفظ کی طرف ہے جس پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ الفاظ کے صحیح معنے جاننے سے ہی کام نہیں چلتا بلکہ ان کا صحیح تلفظ بھی آنا چاہیے۔ یہ نہ ہو تو بولتے وقت مطلب خبط ہو جائے گا اور غلط بولنے والے کا مضحکہ ہوگا۔ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے اس چیز کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے آیندہ اُن طلبا کو انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے جو تلفظ کی صحت کا خاص خیال رکھیں گے۔

---

[۱] پنجابی یکم مئی ۱۸۷۵ء

[۲] ۱۳ فروری ۱۸۷۵ء

اسکولوں میں لازمی طور پر جسمانی ورزش کا انتظام ہونا چاہیے۔ اس چیز کو پڑھنے سے کم اہم نہ سمجھنا چاہیے۔ لیکن پنجاب میں استاد یا طالب علم کوئی اس پر دھیان نہیں دیتا۔ اُستاد سوچتے ہیں کہ یہ تضیعِ اوقات ہے۔ طلبا عام طور پر ذہین ہوتے ہیں لیکن جسمانی کمزوری کی وجہ سے زیادہ عرصہ تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے۔ اسی وجہ سے دوسرے ملکوں کے طلبا جو چیزیں آسانی سے سیکھ لیتے ہیں ان کے سیکھنے میں انھیں سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ ہم بچپن سے جسمانی قوت کو پنپنے نہیں دیتے اس لیے وہ رفتہ رفتہ مُرجھاکر رہ جاتی ہے۔ اسی لیے طلبا اکثر صحت کو خراب کر کے اسکولوں میں نام پیدا کرتے ہیں۔ ہم محکمۂ تعلیمات سے درخواست کرتے ہیں کہ طلبا کی جسمانی تندرستی کی طرف سے بے توجہی نہ برتے کیوں کہ اگر تعلیم حاصل کرنے میں صحت برباد ہو جائے تو ایسی تعلیم سے کیا فائدہ ؟"

سائنس اور آرٹ کی تعلیم کے متعلق علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ لکھتا ہے کہ[1] "محکمۂ تعلیم کی توجہ سے پنجاب کو جہالت سے نجات ملتی جاتی ہے۔ پڑھے لکھوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے تاہم ہر جگہ ایک سی تعلیم مفید نہیں ہو سکتی۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ موقع و محل کے لحاظ سے انسان کی ضرورت بدلتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم عامہ کا یکساں معیار کسی کو نہیں بھاتا اور اسی لیے لوگ سرکاری درس گاہوں کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ ان

---

[1] ۱۲ جنوری ۱۸۸۰ء

میں تہذیب و تربیت پر کوئی دھیان نہیں دیا جاتا۔ اگر بچّوں نے اسی طرح پڑھ لیا جس طرح جانور چر لیتے ہیں تو کیا ہوا؟ آدمیوں کو توتوں کی طرح رٹانے سے کچھ نہ ہوگا۔ جب تک معلّم طلبا کے ذہن کی تربیت اور ان کے آداب کی اصلاح نہ کریں گے ہماری نئی پود کوئی خاص ترقی نہ کرے گی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ محکمۂ تعلیم دیہاتوں میں کاشت کاری اور دست کاری کی تعلیم کا انتظام کرے۔ پڑھ لکھ کر اس قابل بھی تو ہونا چاہیے کہ روٹی کمائی جا سکے۔ عوام کو ایسی تعلیم کی ضرورت نہیں جو لڑکوں کو محنت سے نفرت کرنا سکھائے۔ کسان اپنے بچّوں کو اسی لیے اسکول نہیں بھیجتے کہ وہ پڑھ لکھ کر کھیتی کرنا اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ لطف یہ کہ جس ہندستانی کو کچھ شُدبُد آگیا وہ سرکاری ملازمت مانگنے لگتا ہے۔ گویا تعلیم صرف اس لیے حاصل کی جاتی ہے کہ نوکری مل سکے۔ جب تک طریقۂ تعلیم میں اصلاح نہ ہو یہی ذہنیت باقی رہے گی۔

ترقی یافتہ ملکوں میں ہر قسم کی درس گاہیں ہوتی ہیں۔ ابتدائی تعلیم ختم کر کے طالب علم اپنی طبیعت کے مطابق فوجی، دست کاری، طبّی یا کاشت کاری کے اسکول میں داخل ہو سکتا ہے۔ کاش ہمارا محکمۂ تعلیم بھی اسی طریقے پر عمل کر سکے تو کتنا اچھا ہو۔ نئی درس گاہیں کھولتے وقت اگر اس قسم کے افادی مدرسے بھی بن جائیں تو طلبہ کو اپنے مستقبل کے بنانے میں زیادہ دقّت نہ پیش آئے۔"

اس اخبار نویس کی خواہش کی تکمیل بھی ہوتی

کہ لاہور میں 'صنعتی آرٹ کا اسکول' Mayo Industrial Art School قائم ہو گیا[۱]۔ صوبۂ پنجاب کی حکومت مختلف شہروں میں اس قسم کے صنعتی مدرسے کھولنا چاہتی ہے۔ نصاب اس تجویز کے مطابق ہوگا جو پرتاپ چندر گھوش نے لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں پیش کی تھی[۲]۔ اُدھر بہار کی ادبی مجلس نے اپنے سرپرست سر رچرڈ ٹمپل Sir Richard Temple کے مشورے سے سائنس کی تعلیم کے لیے تجویز تیار کی ہے اور صنعتی مدرسے کھولنے کا ارادہ کیا ہے۔

حیدرآباد دکن میں جاگیرداروں اور امرا کے لڑکوں کے لیے کالج قائم کرنے کا سارا انتظام ہو چکا ہے۔ صرف طلبا کی کافی تعداد کا انتظار ہے۔ تیس سال سے کم عمر کے طالبِ علم داخل کیے جائیں گے اور تین سال کا نصاب ہوگا۔ فارسی اور عربی کے علاوہ حساب اور ہندستان کی تاریخ و جغرافیہ بھی پڑھایا جائے گا۔ کالج میں سرکاری ملازم بھی داخل ہو سکیں گے اور جو امتیاز کے ساتھ امتحان پاس کریں گے، انھیں ترقی ملے گی[۳]۔

بڑودہ میں جو کالج کھُلنے والا ہے، اس کا نام شاہزادۂ ویلز سے منسوب ہوگا۔ اس کے پرنسپل کے عہدے کے لیے ایک تجربے کار ہندستانی عالم کا انتخاب کیا گیا ہے۔

گزشتہ ۲۸ جنوری کو لندن میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن

---

[۱] Indian Mail ۲۵ اکتوبر ۱۸۷۵ء

[۲] ایضاً ۷ جون ۱۸۷۵ء

[۳] پنجابی ۳۱ جولائی ۱۸۷۵ء

East India Association کا ایک جلسہ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ہوا کہ اہلِ ہند کو ان کی تعلیم کا انتظام سونپ دینا کس حد تک مناسب ہوگا۔ مشہور ماہرِ مشرقیات اور پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر ایسٹ وک Eastwick نے جلسے کی صدارت کی۔ ڈاکٹر لائٹنر Leitner نے شکایت کی کہ حکومت نے نہ تو انتظامی اور نہ تعلیمی معاملات میں اہلِ ملک کا تعاون حاصل کرنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ یہ تعاون صرف مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے خصوصاً تعلیمی امور میں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ ہندستانیوں کو پنچایتوں کا اتنا تجربہ ہے کہ جب کبھی ان سے انتظامی معاملات میں مشورہ کیا گیا وہ بہت مفید ثابت ہوا۔ سر الیگزینڈر ارسبتھ نو تھ اور مسٹر گرفن Griffin سکریٹری حکومتِ پنجاب نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

مسٹر گرانٹ ڈف Grant Duff ہندستان کی سیاحت کے لیے آئے ہیں۔ اس سے ملک کا بھلا ہوگا کیوں کہ اس ممتاز عہدے دار کو ہندستان کا اتنا تجربہ ہے کہ وہ انتظام کی بہتری کے لیے بہت کچھ کر سکتا ہے۔ مسٹر ڈف ان اصلاحات کی تجویز اپنے سفرنامے[۱] میں شامل کریں گے جس کے کچھ حصے کن ٹمپریری ریویو Contemporary Review میں شائع ہو چکے ہیں۔[۲]

سید احمد خاں کے مجوزہ کالج کا سنگِ بنیاد رکھا جا چکا ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پنجابی لکھتا ہے:[۳] "یہ سوچنا جہالت کی

---

[۱] Notes on an Indian Journey
[۲] جون ۱۸۷۵ء

انتہا ہی کہ ہندستان میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ حقیقت یہ ہی کہ یہ اسلام کے اصولوں کا کرشمہ تھا کہ بنگال کے تین کروڑ اور مالا بار کے لاکھوں آدمی اپنی خوشی سے مسلمان ہو گئے۔ یہ دیکھ کر انگریز قیاس کرتے ہیں کہ اسی طرح کچھ سال میں شاید عیسائیوں کی تعداد بھی بڑھ جائے۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ پادریوں کی دَوڑ دھوپ کے باوجود لوگ ان کے مذہب سے کوئی دل چسپی نہیں دکھلاتے۔ اب وہ اُس دن کے خوش آیند خواب دیکھ رہے ہیں جب عوام کی مت پھرے گی اور وہ ان کے فرقے میں شامل ہو جائیں گے۔ یہ بھی عجیب ماجرا ہی کہ بھولا بھٹکا مسلمان عیسائی ہو گیا دہ سال دو سال بعد توبہ کرکے اپنے اجداد کے راستے پر لوٹ آتا ہی لیکن جو عیسائی ایک بار مسلمان ہو گیا وہ دوبارہ اپنا مذہب نہیں بدلتا۔ یہ عیسائی مادّی اسباب کی بنا پر اسلام کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ اسی لیے ان کا ایمان راسخ ہوتا ہی۔ یہ سچ ہی کہ کچھ ایسے گرے ہوئے انگریز اور مسلمان بھی ہیں جو محض دُنیوی اغراض کے لیے تبدیلِ مذہب پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انگریزوں کے وسائل ہندستانیوں سے بہرحال زیادہ ہیں لیکن جو اعلا خاندان انگریز مسلمان ہوتے ہیں وہ یقیناً اسلام کے اصولوں سے متاثر ہوتے ہیں۔

اسلام کی خوبیوں کا اعتراف غیر مذاہب کے اکثر انصاف پرور عالموں نے کیا ہی جن میں انگریز بھی شامل ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی بعض کتابوں کا ترجمہ ہماری زبان میں ہو چکا ہی۔ ان کے پڑھنے

سے معلوم ہوتا ہو کہ اسلام میں ایسی کشش ہو کہ عیسائی بھی اس کی طرف رُجوع ہو رہے ہیں اور ان میں سے جو حقیقت کے جویا ہیں، ہماری منزل کو پہنچ ہی جاتے ہیں۔

مگر یہ مضمون لکھتے وقت ہم مسلمانوں کی خستہ حالی سے بے خبر نہیں ہیں۔ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی نظر میں وہ آج خوار ہیں۔ اسلام کی خوبیوں کو اپنانے سے عیسائی بھی نہیں چوکتے لیکن مسلمانوں کی آنکھوں پر ایسے پردے پڑے ہیں کہ وہ اس نعمتِ خداداد سے کُفران برت رہے ہیں۔ وہ اپنے باپ دادا کی بنائی ہوئی لکیر کو تو پیٹیں گے لیکن نبی کریمؐ کی سنّت سے گریز کریں گے۔ اگر کسی بدعت کے ترک کا سوال آئے تو یہ سب سے پہلے واویلا مچاتے ہیں۔ بے حرکتی کو یہ لوگ استغنا سمجھتے ہیں اور ان کی کاہلی کا یہ عالم ہو کہ خواہ فاقہ کریں لیکن اپنی اولاد کو کوئی باعزّت ہنر نہ سیکھنے دیں گے۔ افسوس کہ اچھے اچھے شریف محنت اور مزدوری کو بُری بات کہتے اور گداگری کو اس پر ترجیح دیتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی اتفاق سے امیر ہوا تو وہ عیش وآرام میں مست ہوگا، وہ بھلا کام کیوں کرنے لگا۔ دوسروں کی ترقی پر انھیں رشک نہیں اور نہ اپنے تنزّل پر ندامت ہو۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے اجداد اپنے حوصلے کی وجہ سے دنیا میں نام دار تھے اور جن کے علم وفضل کا ہر طرف سکّہ چلتا تھا۔ ان کی اولاد آج اسلام کے نام پر کلنک کا ٹیکا لگا رہی ہو۔

آج مسلمانوں کی جہالت کا یہ حال ہو کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو بھی بھول گئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ زمانے کی آواز پر لبیک کہتے اور دنیا کی پیشوائی کرتے۔ شکر ہو کہ ہمارے بعض اکابر اپنی قوم کو صحیح راستے پر لے جانے کی سعی کر رہے ہیں۔ یہ ہماری ترقی کی ابتدا ہو۔ لیکن کیسے افسوس کا مقام ہو کہ ابھی سے ان کے خلاف پارٹی بندی شروع ہو گئی ہو۔ کیا اچھا ہو کہ سب مسلمان متفق ہوکر ان سے تعاون کریں"

۱۱ فروری کو الہ آباد میں اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کی انتظامیہ کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ کالج کی عمارت کے لیے حکومت نے وافر زمین عطا کی ہو۔ جلسے میں اعلان ہوا کہ عمارت کے لیے اب تک کچھ کم دو لاکھ روپے جمع ہو چکے ہیں۔ یہ رقم صرف مسلمانوں کی دی ہوئی نہیں ہو۔ مہاراجا پٹیالہ نے دس ہزار روپے اور لارڈ اسٹینلی Staneley نے سو پونڈ دیے ہیں۔ جلسے میں سید احمد خاں نے ایک پُرجوش تقریر میں بتایا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے اس کالج کا قیام کیوں ضروری ہو۔ یہی بات سید محمود اور مولوی فریدالدین نے بھی کہی۔ ان تقریروں سے متاثر ہوکر ایک مسلمان رئیس نے ایک گانو کی آمدنی کالج کے لیے وقف کر دی اور اسی وقت حاضرین نے چندے میں چار ہزار روپے دیے[1]

اسی یکم جون سے کالج سے منسلک ایک ابتدائی اسکول

---

[1] علی گڑھ اخبار ۱۲ فروری ۱۸۷۵ء

علی گڑھ میں کھل گیا ہو جس کی نگرانی مولوی سمیع اللہ خاں کے سپرد کی گئی ہو۔ فیس برائے نام ہو اور نادار طلبا کو مفت تعلیم دی جائے گی۔ اسکول میں اُردو فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی بھی پڑھائی جاتے گی۔ سُنّی اور شیعہ طلبا کی مذہبی تعلیم کا علاحدہ علاحدہ انتظام کیا گیا ہو۔ انتظامیہ کمیٹی کو مسلمانوں تک ہی محدود نہیں رکھا گیا ہو بلکہ ہندو عیسائی یا یہودی بھی اس کے رُکن ہو سکتے ہیں۔ اس کالج کا نظام سرکاری درس گاہوں سے مختلف ہوگا۔ کالج میں طلبا اور پروفیسروں کی رہایش کا انتظام ہوگا۔ وقت آنے پر تیس مقتدر طلبا کا انتخاب کیا جاتے گا جو کالج کے رفقا Feilows کی حیثیت سے رہیں گے۔ اسکولوں میں بھی زیادہ سے زیادہ طلبا کو رہایش کے لیے مجبور کیا جاتے گا تاکہ وہ تربیت اور ضابطے سے بہرہ مند ہو سکیں[۱]۔

۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو ملکہ وکٹوریہ کی سال گرہ کے موقع پر ایک مقتدر مجمع کے آگے علی گڑھ کالج کی رسمِ افتتاحیہ ادا کی گئی۔ علی گڑھ اخبار کی ۲۷ و ۲۰ مئی کی اشاعت میں اس جلسے کی تفصیل شایع ہوئی ہو۔ اس کی صدارت علی گڑھ کے ڈپٹی کلکٹر مولوی محمد کریم نے کی۔ بعد ازآں سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری مولوی سمیع اللہ خاں نے کالج کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ ایک صاحب ہندستان کے مسلمانوں کی مصیبتوں کا ذکر کرتے کرتے رونے لگے۔ لیکن آنسو ضبط کر کے انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ

---

[۱] علی گڑھ اخبار ۳۰ اگست ۱۸۷۵ء

مصیبت کے دن بھی ٹل جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ آج مسلمان انگریزوں کے خادم ہیں لیکن کبھی نہ کبھی وہ رُوحانی و مادّی دونوں اعتبار سے ترقّی حاصل کریں گے۔

ایک اخبار نے لکھا ہو کہ کالج کے افتتاح کی خبر سے ملک کے مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ جائے گی۔ ان کا فرض ہو کہ اسے کام یاب بنانے کے لیے ہر امکانی قربانی کریں۔ اس موقع پر خواجہ حاؔلی نے 'مبارک باد' کے عنوان سے ایک نظم پڑھی جس کا ردیف قافیہ "آج ہی" تھا۔ یہ نظم بے حد پسند کی گئی۔ یہاں ۱۱ اشعار کا فرانسیسی ترجمہ درج ہو[1]

پنجاب کے ۳۲ اضلاع میں سے صرف گرداس پور میں پٹواریوں کے لیے ایک خاص مدرسہ ہو۔ ایک درجے میں آبائی، دوسرے میں ملازم اور تیسرے میں امیدوار پٹواری رکھے جاتے ہیں۔ اس وقت ان کی جملہ تعداد ساٹھ ہو۔ ممکن ہو کہ ہر ضلع میں اسی قسم کے مدرسے قائم ہو جائیں[1]

سنبل پور (صوبۂ متوسط) میں سُنّی مسلمانوں کا ایک مدرسہ ہے جسے ایک استاد کی ضرورت ہو جو اُردو و فارسی کے علاوہ عربی بھی پڑھا سکے[2]

پچھلے سال اودھ میں ۱۳۲۶ درس گاہیں تھیں جن میں ۶۵... طلبا تھے۔ گویا ایک سال میں ۲۶ درس گاہوں اور ۳۰۲۵ طلبا...

---

[1] اخبار انجمنِ پنجاب ۵ فروری ۱۸۷۵ء

[2] اودھ اخبار ۲۲ اگست ۱۸۷۵ء

اضافہ ہوگیا۔

بنگال میں دس کالج اور ہائی اسکول ایسے ہیں جو سرکاری ہیں۔ پانچ کالج امدادی ہیں اور تین کو کوئی مدد نہیں ملتی[1]

سر سالار جنگ کو تعلیمِ نسواں سے بڑی ہم دردی ہے چناں چہ کلکتے کے سفر میں انھوں نے فیمیل نارمل اسکول آف انڈین ریفارم ایسوسی ایشن Female Normal School of Indian Reform Association کو پانسو روپے کا عطیہ دیا۔

بمبئی کے الگزنڈرا نیٹو گرلز انگلش انسٹی ٹیوشن Alexandra Natives Girls English Institution کی سالِ گزشتہ کی رپوٹ میری نظر سے گزری۔ اسے مانک جی کرسٹ جی نامی پارسی نے قائم کیا ہے۔ رپوٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ادارہ اپنے مقصد میں پوری طرح کام یاب ہے۔

ٹراونکور میں تعلیمِ نسواں کا بڑا زور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندستان کے کسی دوسرے علاقے کی عورتوں میں تعلیم کا اتنا چرچا نہیں ہے۔ زنانہ مشن نے عیسائی اور ہندو لڑکیوں کے لیے الگ الگ اسکول کھول رکھے ہیں۔

مدراس میں مسلمان لڑکیوں کا مدرسہ لیڈی ہربرٹ کی سرپرستی میں برابر ترقی کر رہا ہے۔ یہ شریف خاتون کچھ عرصے کے لیے انگلستان گئی ہیں اور جاتے جاتے انھوں نے اپنے مدرسے کو دس ہزار روپے کی رقم عطا کی ہے[2]

---

[1] علی گڑھ اخبار یکم جنوری ۱۸۷۵ء

[2] Indian Mail ۲۳ اگست ۱۸۷۴ء

سے نکل آیا۔ اپنے سائنس اور ہنر کی وجہ سے انگریز دنیا میں انتخاب ہیں۔ ان کی مدد سے ہم بھی بام ترقی پر چڑھیں گے اور ایک روز پھر اپنے پُرانے منصب کو حاصل کریں گے۔ ہماری زندگی کے باغ میں امید کا بیج لگ چکا ہے اور رحمت کی بارش اس میں ترقی کے پھول لائے گی۔ پھر ہماری جہالت اور غربت کے کانٹے بے نشان ہو جائیں گے۔ ہر طرف اسکولوں اور کالجوں کی گھما گھمی ہوگی، ہر طرف کارخانوں کی چرخ چوں کی صدا آئے گی، ہر طرف جدید علوم کی ترقی کے لیے انجمنیں بنیں گی اور ہر دل میں ترقی کی آرزو ہوگی۔ علم کی روشنی شہروں میں ہی نہیں بلکہ گاؤں میں بھی پہنچے تو کام بنے۔ اسی غرض سے ہمارے چھوٹے سے شہر میں یہ سوسائٹی قائم ہوئی ہے۔

آج اس چھوٹی سی بستی میں علم کی روشنی جگمگا رہی ہے لیکن کل کی بات ہے کہ یہاں اُردو فارسی کے ایک ٹوٹے پھوٹے مدرسے کے سوا کچھ نہ تھا۔ لاہور کے پُرانے کمشنر کی سرپرستی میں ہم نے سال بھر پہلے یہاں ایک اسکول بنایا جس میں اپنی زبانوں کے علاوہ انگریزی، جغرافیہ، حساب وغیرہ کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ اس کے بعد ہم نے یہ انجمن بنائی اور اس کے آگے یہ مقاصد رکھے: (۱) ایک چھاپے خانے کا قیام (۲) ایک علمی رسالے کا اجرا جس کے کئی نمبر نکل بھی چکے ہیں۔ (۳) پبلک کے لیے ایک کتب خانے کی تنظیم (۴) ایک کارخانے کی تنظیم جس میں دری اور ریشم کی چادر وغیرہ بنائی جاتے اس میں صرف مرد نوکر رکھے جاتے ہیں۔ ایک

اور کارخانہ سلائی، گل کاری وغیرہ کے لیے ہے جس میں صرف عورتیں نوکر ہیں۔ ان کارخانوں کے سامان کی بکری کے لیے اتوار کو خاص طور پر بازار لگتا ہے۔

اس وقت ہماری انجمن کے تین سو ممبر ہیں جن میں ۱۱ یوربین بھی ہیں۔ اگر ہر بستی کے چند افراد علم و ادب کی خدمت پر آمادہ ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کچھ عرصے میں ہم اہلِ مغرب سے بازی نہ لے جائیں۔"

ہندستانیوں کے سوچ بچار اور رہنے سہنے کے طریقوں میں تیزی سے جو تبدیلی ہو رہی ہے اس کی ایک وجہ اگر انگریزوں کی حکومت ہے تو دوسری وجہ حالات کو بدلنے کی خواہش بھی ہے۔ مثلاً دُور دراز اجمیر کو ہی لیجیے۔ کئی سال سے نئے خیالات کی اثر آفرینی وہاں نظر آ رہی ہے۔ مقامی انجمن رفاہِ عام کا کام ہی یہ ہے کہ دقیانوسی رسوم کی بیخ کنی کرے[1] پچھلے دسہرے کے موقع پر انجمن نے ایک صنعتی نمایش منعقد کی تھی[2]

اجمیر میں ایک خالص اسلامی انجمن بھی بنائی گئی ہے جو "اس اسلامی شہر کو دوبارہ خوش حال بنانے کی کوشش کرے گی مسلمانوں میں علم کی روشنی پھیلانے کے لیے وہ مدرسۃ العلوم کا قیام بھی ضروری سمجھتی ہے۔"

ہوشیار پور (پنجاب) میں بھی مسلمانوں نے ایک انجمن بنائی ہے۔

---

[1] پنجابی ۲۱ نومبر ۱۸۷۴ء

[2] علی گڑھ اخبار، ۲۷ اگست ۱۸۷۵ء

پنجابی[1] کا بیان ہے کہ اس کے پہلے اجلاس میں مولوی میرزا فتح محمد بیگ نے ایک زوردار تقریر کی۔ یہ مولوی صاحب مناظرے کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہ طے پایا کہ اس کا کوئی انگریزی نام نہ رکھا جائے بلکہ اسے صاف صاف 'انجمنِ اسلامیہ' کہا جائے۔ اس کے عہدے داروں کے انتخاب کے بعد فیصلہ ہوا کہ انجمن کا کم سے کم ایک جلسہ ہر مہینے ہوا کرے۔

اسی قسم کی انجمنیں کپورتھلہ، جالندھر اور سیالکوٹ میں بھی بن چکی ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیر اور حدیثوں کی طباعت کا انتظام کریں۔ اخباروں کے ذریعے معلوم ہوا کہ بنگلور اور کان پور میں مسلمانوں کے دو اصلاحی ادارے 'انجمنِ تہذیب' کے نام سے ظہور میں آئے ہیں۔ کان پور کی انجمن میں بہت سے بااثر رئیس بھی شریک ہیں۔ اس کا مقصد مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے اور انھیں قبیح رسموں سے دُور رکھنے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ حکومت سے کہہ کر ان کے حقوق کا تحفظ کرے۔

اس قسم کے اداروں میں لاہور کی انجمنِ اسلامیہ کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اس نے شاہی مسجد کی مرمّت کا کام حکومت کے تعاون سے شروع کیا تھا لیکن روپے کی کمی کی وجہ سے یہ کام ادھورا رہ گیا۔ یہ عظیم الشان عمارت سلطنتِ مغلیہ کی یادگار اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کی قائم کردہ ہے۔ اب یہ شکستہ حالت میں ہے۔ پنجابی[2] نے رائے دی ہے کہ علی گڑھ کالج کی طرح اس کے لیے

---

[1] پنجابی ۹ جنوری ۱۸۶۹ء [2] پنجابی ۱۹ جون ۱۸۶۹ء

بھی پبلک سے چندہ وصول کیا جائے اور یہ کام انجمن کے کرنے کا ہے۔ یہ مسلمانوں کی قومی یادگار ہے اور اسے کس مپرسی کی حالت میں نہ چھوڑے رکھنا چاہیے۔

اخباروں میں دھرم سبھا، سناتن دھرم سماج اور برہمو سماج کا چرچا رہتا ہے۔ اس کے قائد بابو کیشور چندر سین کا نام بھی اکثر آتا ہے۔ پنجابی[1] بابو صاحب کے وجود کو اس زمانے میں غنیمت سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ خدمت اور قابلیت کے سبب سے ان کا نام ملک کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

دسمبر ۱۸۷۴ء میں اِندوٗر کے تعلیم یافتہ طبقے کے آگے تقریر کرتے ہوئے بابو کیشو چندر سین نے ثابت کیا کہ حکومت اپنی رعایا کو شاہراہِ ترقی پر لے جانا چاہتی ہے۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ ہمارے نوجوان پڑھ لکھ کر عیسائی ہو جائیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ مغرب کی اندھی تقلید سے بچیں اور اپنی تہذیب کی خوبیوں کو نہ بھولیں۔ بابو صاحب نے کہا کہ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ ہم یورپین لباس پہنیں اور شراب کا استعمال کریں۔ ایسی باتوں سے تعلیم یافتہ لوگ عوام کی ہمدردی اور عزت کھو دیں گے اور ان کی رہبری کا فرض ادا نہ کر سکیں گے۔

ایک دوسرے موقع پر انھوں نے "الہام" کے موضوع پر عالمانہ تقریر کی جس کا اُردو ترجمہ سردار دیال سنگھ نے شایع کیا ہے۔

۲۳ جنوری ۱۸۷۵ء کو کلکتہ میں 'برہمو سماج' کی سال گرہ

---

[1] پنجابی ۱۹ دسمبر ۱۸۷۴ء

منائی گئی۔ اس مت کے ماننے والوں کا جلوس بھجن گاتا، جھنڈیاں ہلاتا، سڑکوں کا طواف کرتا رہا۔ دوسرے روز بابو کیشو چندر سین نے دو ہزار آدمیوں کے مجمے کو سماج کے اصول سمجھائے۔

لکھنؤ میں دھرم سبھا کے جلسے ماہ بہ ماہ ہوا کرتے ہیں جن میں تعلقہ داروں کے ساتھ پنڈتوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ پنڈت وید، گیتا اور پرانوں کے نکات سمجھایا کرتے ہیں[1]۔

انگریزی اخباروں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ (Moncure D. Conway) کی کتاب (Sacred Anthology) کا تیسرا ایڈیشن شایع ہو گیا ہے۔ اس کتاب کو تحفۃً برہمو سماج کے معتمد کو بھیجا گیا ہے۔ اس کتاب میں ان اصولوں کو بیان کیا گیا ہے جن پر انگلستان اور امریکہ کے موحدوں کا ایمان ہے۔ اس کتاب کو خوب قبولِ عام نصیب ہوا۔

پچھلے سال وزیرآباد کے ہندوؤں نے دھرم پرکاش کے نام سے ایک سوسائٹی بنائی تھی۔ یہ اپنے ہم مذہبوں میں سماجی اصلاح کی کوشش کرے گی۔ خاص طور پر اُس تیوہار کو بند کرانے کی کوشش کرے گی جس کا نام 'لوہری' ہے اور جسے سارے پنجاب کے ہندو جاڑوں میں پوس کے مہینے میں منایا کرتے ہیں۔ اس تیوہار میں پہلے تو آتش بازی چھوڑی جاتی ہے پھر دان پُن ہوتا ہے اور پھر دیوالی کی رسوم کی طرح برہمنوں کو گھی اور مٹھائیاں تقسیم کی جاتی ہیں۔ لڑکیاں راہ چلتوں کو چھیڑ کر ان سے پیسے مانگتی ہیں اور انھیں "چاند سورج" کہتی ہیں۔

---

[1] اودھ اخبار یکم اکتوبر ۱۸۷۵ء

لکھنؤ میں ایک سوسائٹی قائم ہو رہی ہے جس میں ہندستانی اور یورپین باہم مل کر سیاسی و علمی مسئلوں پر تبادلۂ خیالات کیا کریں گے۔ اس قسم کے کلب کلکتہ، علی گڑھ اور لاہور میں پہلے سے موجود ہیں[1]۔

لندن میں نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کی جو شاخ ہے اس کی ۱۸۷۴ء کی رپوٹ مس میننگ نے مجھے بھیجی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادارہ وقتاً فوقتاً لندن کے ہندستانیوں اور ان کی ترقی کے خواہاں انگریزوں کے مشترک جلسے کیا کرتا ہے۔ وہاں ہندستانیوں کو ایسے انگریزوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے جو انھیں مدد پہنچا سکتے ہیں اور ساتھ ساتھ دلچسپ مضامین پر تقریریں بھی ہوا کرتی ہیں۔ انگریزوں کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ہندستانیوں کے خیالات سے آگاہ ہوتے ہیں اور ان کی زبانی یہ معلوم کرتے ہیں کہ ان کا ملک کیا محسوس کرتا ہے۔ تقریروں کے بعد جو بحث ہوتی ہے اس میں سب فرقوں کے افراد حصّہ لیتے ہیں۔ نوروزجی فریدوں جی نامی پارسی نے ایک مجلس میں اپنے فرقے کی حالت پر تقریر کی اور پھر یہ بھی بتایا کہ ہندستان میں یورپین اہلِ ملک سے کس قسم کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ایک مسلمان نے پردے کی برائیوں کا تذکرہ کیا۔ ایک ہندو نے اپنے مقالے میں بتایا کہ ہندستان میں سماجی اصلاح کے لیے کیا اقدام کرنا چاہیے۔

اس ایسوسی ایشن کا ماہنامہ شہر برسٹل Bristol میں مس کارپنیٹر کی ادارت میں شایع ہوتا ہے۔ یہ نیک دل خاتون حال ہی

---

[1] Indian Mail ۵ فروری ۱۸۷۵ء

میں دوبارہ انگلستان گئی تھیں اور انھوں نے ان ہندستانی طلبا کے لیے ایک مفید رسالہ شایع کیا ہے جو تعلیم کی غرض سے انگلستان جانا چاہتے ہیں۔ اس میں مختلف تعلیمی اداروں کی تفصیل اور ان میں داخلے کے قواعد درج ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ معلومات مفید بھی ہیں اور ضروری بھی۔ پھر اس میں ان قواعد کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے جو سول سروس، فیڈریکل سروس، بیرسٹری اور انجنیری کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان آنا چاہتے ہیں۔

(۶)

ہندستان کی حالیہ مردم شماری میں مختلف فرقوں کے ماننے والوں کی یہ تعداد دی گئی ہے:-

ہندو	۱۲,۳۵,۰۲,۳۱۱
سکھ	۱۲,۵۰,۰۰۰
بودھ اور جین	۲۶,۲۹,۲۱۲
قدیم باشندے اور لامذہب لوگ	۱۵,۲۳۸,۲۰۰
مسلمان	۴,۰۸۶ ۶۰۳۴
پارسی	۷۰,۰۰۰
یورپین اور اینگلو انڈین	۳,۲۲,۹۳۱
ہندستانی عیسائی	۲,۲۴,۱۶۱

ان اعدادوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندستان میں عیسائی مٹھی بھر سے زیادہ نہیں ہیں۔ دعا کرنی چاہیے کہ ان کی تعداد دن دونی رات چوگنی ہوتی جائے۔

کمپنی کی حکومت عرصے تک عیسائی پادریوں کو ہندستان نہ آنے دیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہندو کبھی اپنے مذہب کو نہ چھوڑیں گے اور انھیں چھیڑنا اچھا نہیں۔ لیکن برطانوی حکومت نے یہ پالیسی بدل دی ہو۔ گو کہ وہ مذہبی معاملات میں غیر جانب دار ہو لیکن عیسائی پادریوں کو تبلیغ کی پوری آزادی ہو۔ مذہب کے نام پر اب مجرم نہیں کیے جا سکتے۔ جو لوگ عیسائی بن جاتے ہیں حکومت ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہو اور ان پر زیادتی ہونے کی اجازت نہیں دیتی۔

ہندستان، برما اور سیلون میں پروٹسٹنٹ فرقے کے جو مشن کام کر رہے ہیں، ان کی تعداد ۳۵ ہو۔ ان میں سے نو امریکہ کے، چھ جرمنی کے اور باقی انگلستان کے ہیں۔ مقامی اداروں کا ذکر نہیں ہو۔ ان میں سب ملا کر ۶۰۰ مشنری کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں کی افسوس ناک باہمی رقابت ان کے اثر کو کم کرتی ہو جس کی وجہ سے ان کی کوششوں پر پانی پھر جاتا ہو۔ یہ غنیمت ہو کہ ہر مشن ایک علاحدہ علاقے میں کام کرتا ہو جس کی وجہ سے ان کا تضاد اُجاگر نہیں ہونے پاتا۔ بڑے شہروں میں مختلف مشن یک جا ہوتے ہیں اور جب وہ ایک خدا کی عبادت کرتے اور ایک کتاب کا حوالہ ایک ہی طریقے سے دیتے ہیں تو اہلِ ملک ان کے اختلاف کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہونا بھی یہی چاہیے کہ پہلے انھیں عیسائی مذہب کی طرف راغب کیا جائے اور فرقہ پرستی کی باتیں نہ کی جائیں۔

مَیں نے یہاں کیتھولک مشنریوں کا ذکر نہیں کیا جو ساری

دنیا میں تبلیغ کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ سننے میں آیا ہو کہ ہندستان میں ان کی تگ ودو کا واحد مقصد یہ ہو کہ جو ہندستانی پروٹسٹنٹ عیسائی ہو گئے ہیں انھیں کیتھولک بنایا جائے[1]۔

اوپر میں نے جن پروٹسٹنٹ مشنوں کا ذکر کیا ہو، انھوں نے سالِ گزشتہ میں پانچ ہزار آدمیوں کو عیسائی بنایا جن میں سے زیادہ تر چھوٹا ناگ پور کے رہنے والے ہیں۔ اُدھر روسی پادری خوشی سے بغلیں بجا رہے ہیں کہ انھوں نے تبّت کے ایک لاما کو عیسائی بنا ڈالا[2]۔

ہمارے پادری صرف مبلغ اور معلّم ہی نہیں ہیں۔ ہندستانی زبانوں میں انھوں نے بڑی دست رس حاصل کی ہو اور صرف مدرسوں کے لیے ہی نہیں بلکہ عوام کے لیے بھی ہندستانی کے علاوہ مختلف صوبائی زبانوں میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اس لیے اہلِ ملک ان سے محبت کرتے ہیں کیوں کہ جو غیر ملکی ان کی زبان اور ادب سے دل چسپی رکھتے ہیں، وہ ان کی عزّت کرتے ہیں۔ اس وقت ۴۵ چھاپے خانوں کا انتظام ان کے ہاتھ میں ہو جن سے پچھلے دس سال میں تین ہزار چار سو مختلف کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ پہلے کی طرح اب یہ مفت نہیں بانٹی جاتیں بلکہ بیچی جاتی ہیں۔ اس سے ان کی عام دل چسپی ثابت ہوتی ہو۔

یہ عجیب بات ہو کہ اونچی ذات کے ہندوؤں کی طرح بہت سے

---

[1] Quarterly Review اپریل ۱۸۷۵ء

[2] Times ۸ ستمبر ۱۸۷۵ء

انگریز ان ہندستانیوں کو حقیر سمجھتے ہیں جو اپنا مذہب بدل لیتے ہیں، صرف اس وجہ سے کہ یہ لوگ نیچی ذات کے ہوتے ہیں۔

عیسائی مشن جن اسکولوں کا انتظام کرتے ہیں ان کے متعلق اخبار پنجابی[۱] لکھتا ہے: " ان اسکولوں کے مدرّس ہندستانی بچّوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو زحمت برداشت کرتے ہیں اس کے لیے ہمیں ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ ان سے جو طلبا نکلتے ہیں وہ اپنی عمدہ تعلیم کی وجہ سے اچھے عُہدوں کو پہنچتے ہیں اور عام طور پر عزّت کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ بہت سے ہندستانی ان اداروں کے اعلا معیار کی قدر نہیں کرتے اور ان میں اپنے بچّوں کو بھیجنا بُرا سمجھتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کی اولاد کسی غیر مذہب سے آشنا ہو۔ ان اسکولوں کا خاص مقصد عیسائی مذہب کی تعلیم ہے اس میں شک نہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ پادری اپنے مذہب کی تبلیغ بند کر دیں لیکن اس کے لیے بازار یا گرجا گھر کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ مناسب نہیں کہ ہندو اور مسلمان بچّوں کو عیسائی مت کی کتابیں پڑھنے پر مجبور کیا جائے۔

سیالکوٹ میں ایسے دو اسکول تھے جن میں سے ایک امریکن اور دوسرا اسکاٹ تھا۔ اب 'پنجابی' میں اعلان ہوا ہے[۲] کہ ان دونوں کو ملا کر ایک کر دیا جائے گا۔ اس کی وجہ اخبار کی رائے میں یہ ہے کہ پہلے بہت سے ہندو اور مسلمان مدرّس اس امید پر

---

[۱] ۲۷ مارچ ۱۸۶۵ء [۲] پنجابی ۱۷ جون ۱۸۶۵ء

رکھ لیے گئے تھے کہ وہ خود بھی عیسائی ہو جائیں گے اور اپنے طلبا کو بھی مُرید کرلیں گے۔ لیکن جب یہ امید بر نہ آئی تو ان سب کو برطرف کر دیا گیا۔ آگے چل کر یہ اخبار لکھتا ہے کہ وہ پادری جو رحم وکرم کے علَم بردار بنتے ہیں خود اس کے ترجمان نہیں کیوں کہ یہ مدرّس برسوں کی محنت کے بعد اب اپنی روزی سے محروم کیے جا رہے ہیں۔ اس کا قیاس ہے کہ نئے اسکول میں صرف عیسائی مدرّس رکھے جائیں گے تاکہ بے کھٹکے عیسائیت کی تبلیغ ہو سکے۔ آخر میں وہ ہندو مسلمانوں کو رائے دیتا ہے کہ حکومت سے ایک غیر مذہبی اسکول بنانے کا مطالبہ کریں۔

امرت سر کے برطانوی مشن کی سولھویں رپوٹ پادری کلارک نے ازراہِ عنایت مجھے بھیجی ہے۔ آخر میں عماد الدین نے اس کا خلاصہ اُردو میں کیا ہے۔ اس رپوٹ میں کئی باتیں دل چسپ ہیں جن کا تھوڑا سا ذکر کیا جائے گا۔

مشن میں سات پادری ہیں جن میں سے دو ہندستانی ہیں۔ ایک تو عماد الدین اور دوسرے داؤد سنگھ جنھوں نے مرقس اور متی کی انجیل کا ترجمہ پنجابی نظم میں کیا ہے۔ لڑکوں کے علاوہ چار معتبر اشخاص حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائے۔ ان میں ایک سکھ زمیں دار بھی ہے جو بارہ سال سے حقیقت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ ایک عورت بھی عیسائی ہو گئی۔ اس کا شوہر عرصے سے راہِ حق پر ڈٹا ہوا تھا باوجود ےکہ برادری والوں نے اس کا جینا اجیرن کر دیا تھا۔ اب اس کی بیوی بھی اس

کے راستے پر آگئی۔

لاہور کے ایک بوڑھے فقیر نے بھی بیعت کرلی اور اپنی خانقاہ مشن کو دے دی کہ اس میں اسکول بنالے۔

امرت سر کے گرجا گھر میں برابر اُردو میں نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر عیسائیوں کے علاوہ ہندو مسلمانوں کا بھی مجمع ہوتا ہے جو تماشا دیکھنے کی نیت سے آجاتے ہیں۔

اس سال مہاراجا کشمیر نے سری نگر کے بازاروں میں تبلیغ کی ممانعت نہیں کی اور پادریوں کے وعظ سننے کے لیے بھیڑ لگ گئی۔ پادریوں کی خواہش ہے کہ اپنے استعمال کے لیے ریاست میں ایک عمارت کھڑی کرلیں۔ لیکن انگریزوں کو کشمیر میں مکان خریدنے یا بنانے کی اجازت نہیں ہے اور گو کہ مہاراجا انگریزوں کا محکوم ہے لیکن اس کی عمل داری میں تبلیغ کی آزادی نہیں۔ مہاراجا پر ہندو دھرم کا ایسا غلو ہے کہ جیب خاص سے ہندستان کے کئی مندروں کا صرفہ ادا کرتے ہیں، مذہبی کتابوں کی اشاعت کا انتظام کرتے ہیں اور ہندوؤں کے اسکول کھلواتے ہیں۔ مولوی نورالدین کو محض اس لیے انھوں نے ریاست سے نکال دیا کہ وہ عیسائی ہوگئے تھے۔

نارنول میں پچھلے سال پادریوں نے اپنی جان پر کھیل کر چار مسلمانوں اور ایک ہندو کو عیسائی بنایا۔ اس سے دو سال پہلے مسلمانوں کے ایک جتھے نے مشن کے مکان پر حملہ کرکے دو لڑکوں کو چھین لیا تھا جو عیسائی ہونے والے تھے۔ پھر بھی

ان لڑکوں کا حوصلہ پست نہ ہوا۔ برادری کے مظالم کے باوجود ان کا ارادہ نہ بدلا اور آخر اب جاکر ان کی مراد برآئی۔ اسی بستی میں ایک کلیسا کی تعمیر ہوتی ہے جس کا نقشہ پادری کلارک کی رپوٹ میں شامل ہے۔ اس کے فرش پر ڈیڑھ سو آدمی آسانی سے بیٹھ سکتے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے الگ الگ بیٹھنے کا انتظام ہے۔ دیواروں پر اُردو اور ہندی حروف میں انجیل کی آیات لکھی ہوئی ہیں۔

انھی پادری کلارک کی نوازش سے مجھے بائبل سوسائٹی، پنجاب کی اشاعتِ مذہبی کتب سوسائٹی کی ساتویں رپوٹ دست یاب ہوتی۔ رپوٹ کے دونوں حصّے نو عیسائی سید علی شاہ کے لاہوری چھاپہ خانے میں طبع ہوئے ہیں۔ میں یہاں انجیل کے نسخوں کی تعداد نہیں گنانا چاہتا اور نہ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ کتنی زبانوں میں چھاپے گئے بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس قسم کی اشاعت کتنی کارگر ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ چباکے ایک فقیر کے ہاتھ انجیل کا ایک نسخہ لگا۔ اسے پڑھ کر وہ اتنا متاثر ہوا کہ فوراً مشنری کے پاس پہنچا اور اپنے شکوک کا اظہار کیا۔ اطمینان ہوتے ہی وہ عیسائی ہوگیا۔ ایک مسلمان فقیر اور اس کے آٹھ چیلوں پر بھی انجیل کے مطالعے کا یہی اثر ہوا۔ اور بھی بہت سے لوگ اسی طریقے سے عیسائی ہوئے۔ ان سب کا متفقہ بیان ہے کہ انجیل کی اشاعت بہت مفید ہو سکتی ہے۔ عیسائی اولیا کی زندگی کے حالات بہت سے ہندو مسلمان شوق سے پڑھا کرتے ہیں۔ مذہبی کتب کی بکری کا کام ملکی عیسائی مبلغوں کے سپرد کیا گیا ہے جو خریداروں کو ان کی اہمیت بھی سمجھاتے جاتے ہیں۔

مذہبی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں اوپر میں نے جس رپورٹ کا ذکر کیا ہے، وہ ادبی اعتبار سے زیادہ دل چسپ ہے۔ کیوں کہ اس کے مطالعے سے کئی نئی اُردو اور ہندی کتابوں کا پتا چلتا ہے۔ یوں ہندستانی عیسائیوں کی جدید مطبوعات کی مکمل فہرست Conference on Urdu Hindi Christian Literature میں مندرج ہے۔

دہلی کے ایک مطبع کے مالک مہدی حسن نے لدھیانہ کے عیسائی اخبار نورافشاں میں اعلان کیا ہے کہ حسب ذیل کتابوں کا جواب لکھنے والوں کو دو دو سو روپے کا انعام دیا جائے گا۔ یہ کتابیں مسلمانوں کی طرف سے عیسائیت کی تردید میں لکھی گئی ہیں:

(۱) رقیمۃ الوداد جواب ہے نیاز نامہ مصنفہ پادری عمادالدین کا

(۲) لحن داؤدی جواب ہے نغمۂ طنبوری مصنفہ رام چندر کا

(۳) استقلال جواب ہے دجال مسیح مصنفہ صفدر علی کا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا جوش و خروش ٹھنڈا نہیں پڑا اور وہ پادریوں کو ترکی بہ ترکی جواب دے رہے ہیں۔ اُدھر ان کے اپنے گھر میں اختلاف کی آگ سُلگ رہی ہے۔ حال ہی میں وہابیوں کے مشہور مخالف مولوی محمد عمر رام پوری نے وہابی عالم مولوی شکراللہ کو ایک مناظرے میں شکست دی۔ اس کامیابی پر اخبار پنجابی نے انھیں "شمشیرِ آب دار بر گردنِ وہابیہ اشرار" کا بھاری بھرکم خطاب دیا ہے[۱]

اس سال بھی مسلمانوں نے کئی عیسائیوں کو مُرتد کر لیا۔ ان

---

[۱] ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء

میں سے تین جہازی مدراس کی ایک مسجد میں مسلمان ہوئے۔ کیپٹن کر Kerr نامی انگریز نے بمبئی میں اسلام پر لبیک کہا اور اپنے ایک دوست کو لکھا کہ میں آج تک اتنا خوش نہ تھا، اب پانچ وقت کی نماز کے بعد دن رات میں سات مرتبہ کھانا مل جاتا ہے۔

اس سلسلے میں بنگلور اگزامینر Bangalore Examiner لکھتا ہے: "کسی کو یقین نہ آئے گا کہ یورپین ہندستانی اگر مسلمان ہو جاتے اور اپنی ملت کو بدنام کرتے ہیں لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے۔" بعدازاں یہ اخبار چار انگریزوں کے نام گناتا ہے جو بنگلور میں اسلام پر ایمان لے آئے ہیں۔ یہ پالا وہابیوں نے مارا جو کٹر توحید پرست ہیں۔ انھیں مسلمان کرنے کے لیے حیدرآباد سے ایک مولوی بنگلور آیا اور اس وقت تک انتظار کرتا رہا جب تک اُن کے لیے انگرکھے اور پاجامے نہ مل گئے اور وہ اس سج دھج سے مسجد میں داخل ہوتے۔ ان میں سے ایک انگریزی فوج میں کپتان ہے اور دوسرا سپاہی۔ دونوں نے عبداللہ کا نام انتخاب کیا۔ ان کی عمر ۴۴ سال کے لگ بھگ ہو گی آئرلینڈ کے ایک جواں سال جہازی O Neil کو عبداللطیف نام ملا۔ چوتھے کی عمر بھی ۲۵ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اور وہ عبدالسلام کہلایا۔ ان نو مسلموں کا ولولہ ملاحظہ ہو کہ مسجد سے نکلتے ہی ایک لڑکے کا سر مونڈ کر اسے زبردستی مسلمان بنانے کی

لہ Indian Mail ۲۴ مئی ۱۸۶۰ء

سلہ بہ حوالہ اخبار عالم میرٹھ ۱۰ فروری ۱۸۶۰ء

کوشش کرنے لگے اور تبلیغ اسلام کے لیے چندہ بھی وصول کیا۔ اسی زمانے میں ایک نومسلم انگریز فقیر کا بھیس پہنے شادی کی نیت سے بنگلور آیا۔ یہ چار یار اس کے ساتھ میسور چل کھڑے ہوئے۔ اخبار کا بیان ہو کہ انھوں نے اعلان کیا: "ہمیں اپنے پرانے ملک اور پرانے مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ اب ہم اسلام کے فدائی ہیں۔"

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہو کہ نارمن Norman نامی پادری جو عیسائیت کی تبلیغ کے لیے قسطنطنیہ بھیجا گیا تھا مسلمان ہوگیا اور اب امریکہ جاکر اسلام کی اشاعت کر رہا ہو۔ پچھلے مقالوں میں ہم مسلمانوں کی جس عالم گیر بیداری کا ذکر کر چکا ہوں، اس سے ہندی مسلمان مستثنا نہیں ہیں۔ اخباروں کا بیان ہو کہ سلطانِ ترکی دنیا بھر کے مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی دُھن میں ہیں اور وہ چین کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنا سفیر پیکن میں تعینات کر رہے ہیں۔

راج پوتانہ کے مشنریوں کی رپوٹ سے معلوم ہوتا ہو کہ انھوں نے اجمیر، نصیر آباد، آشاپورہ اور ٹاڈگڑھ میں یتیموں کے اسکول کھول رکھے ہیں تاکہ وہ پڑھ لکھ کر دیہاتوں میں تعلیم پھیلا سکیں۔ ان میں سے کئی مشن کے چھاپے خانوں یا گرجا گھروں میں ملازم ہوگئے ہیں۔ ان میں سے کئی کو علمِ طب بھی سکھایا جاتا ہو کیوں کہ دواخانوں کی نگرانی بھی مشنریوں کے ذمّے ہو۔ ان میں سے تنہا بیاور کے اسپتال میں ۱۸۶۷ء میں بارہ سو بیماروں کا علاج ہوا۔ بیمار اچھے ہوکر پادریوں کی بات پر کان دیتے

ہیں اور اکثر عیسائی بھی ہو جاتے ہیں۔

راج پوتانہ میں پادریوں نے بہت سے اسکول کھول رکھے ہیں لیکن ان کی مذہبی تعلیم نے پچھلے سال کوئی اثر نہ دکھایا۔ صرف ۱۴ افراد عیسائی بنے۔

نامور عیسائی کارکن جان مردوک John Murdoek کا ذکرِ خیر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ انھوں نے ایک رسالے میں بتایا ہے کہ ہندستان میں عیسائیوں کو ایسا ادب پیدا کرنا چاہیے جو اہلِ ملک کے لیے کشش رکھتا ہو۔ اس غرض سے انھوں نے الہ آباد میں ایک کانفرنس بھی کی تھی۔ مسٹر مردوک نے کہا ہے کہ سنہ ۶۹ء سے اب تک اُردو میں ۱۴۴ اور ہندی میں ۲۲۰ عام دل چسپی کی کتابیں اور رسالے چھپ چکے ہیں۔ انھوں نے ان کتابوں کی فہرست بھی پیش کی جو عنقریب شایع ہونے والی ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ ہندو، مسلمان اور عیسائیوں کے لیے الگ الگ کتابیں تصنیف کی جائیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پادریوں کو رومن رسم الخط سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے کیوں کہ یہ مسلمانوں کو ناپسند ہے۔ باتصویر کتابیں بہت مقبول ہوں گی اور امرت سر کے پادری بیرنگ Baring کی یہ رائے صحیح ہے کہ عمدہ قسم کا ادب عام دل چسپی کا باعث ہوگا۔[۱]

بمبئی کے پادری ڈگلس DOUGLAS نے اپنے صوبے میں

---

[۱] Proposed Conference on Urdu and Hindi Literature at Bombay 1874

عیسائیت کی اشاعت کے متعلق ایک اہم خطبہ پڑھا۔ فرمایا کہ تمام عیسائی فرقوں کو باہم مل جل کر تبلیغ کا کام کرنا چاہتے ہیں اور ہندستانیوں کو عیسائیت کی تلقین کرتے وقت آپس کے جھگڑوں کا نام بھی نہ لینا چاہیے۔

کلکتہ کے پادری نے اس سال مشرقی بنگال اور آسام کا دؤرہ کیا۔ مذہبی چندے کے لیے لاٹری کی جدّت کی انھوں نے سخت مذمّت کی اور کہا کہ کارِ خیر میں ایسی بدعت سے برکت نہیں ہو سکتی۔

یہ ظاہر ہی ہی کہ پادریوں کو عوام کی مخالفت کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی خدمت انجام دینی پڑتی ہی۔

انبالہ میں سکھوں کی ایک پلٹن میں صرف اس وجہ سے بغاوت ہوتے ہوتے رہ گئی کہ ایک سپاہی کا لڑکا فوجی اسکول کے اثر سے عیسائی ہو گیا۔ اس پلٹن کے کئی سپاہی برسوں پہلے بہ رضا و رغبت عیسائی ہو گئے تھے اور ان کی تعلیم کے لیے پادریوں نے ایک اسکول کھول دیا تھا۔ وہ لڑکا اسی اسکول میں آیا کرتا تھا۔ اس کے عیسائی ہو جانے سے ایسی ہڑبونگ مچی کہ کرنل کو اسکول بند کر دینا پڑا اور سپاہیوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی ممانعت کر دینی پڑی۔

پال گھاٹ کے جرمن پادری DIER. نے اس سے بھی زیادہ ہول ناک حادثے کی اطلاع دی ہی۔ مسلمانوں کے ایک گروہ نے مشن کی ایک عمارت کو جلا ڈالا اور نو عیسائیوں کو بری طرح پیٹا۔ اگر کوچین کا انگریز ریزیڈنٹ ان میں سے ایک کنبے کو پناہ نہ دیتا تو لوگ اس کی جان لے کر چھوڑتے۔

ہندوؤں کے کٹرپن کا بھی یہی حال ہے گو کہ اس کی شدت کبھی کبھی ظاہر ہوتی ہے۔ سکندر پور میں کالونائی ہندو رہا کرتا تھا جو پوجاپاٹ کا بڑا پابند تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ مرگیا اور ایک جوان بیوی اور شیرخوار بچے چھوڑ گیا۔ بیوہ پر اس سانحے کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور دن رات اپنے شوہر کا ماتم کرنے لگی۔ ایک دن سناٹا پاکر اس نے لکڑیوں کا انبار جمع کیا، چتا بنائی اور آگ لگا کر بچے کے ساتھ اس پر لیٹ گئی۔ جب تک لوگوں کو خبر ہو اور وہ پولیس کو اطلاع دیں یہ دونوں بدنصیب جل کر خاک سیا ہو گئے۔ بستی کے لوگوں نے صاف انکار کر دیا کہ ہمیں بیوہ کے ارادے کی مطلق خبر نہ تھی۔

کئی سال پہلے میں نے ایک مسلمان مضمون نگار کے حوالے سے ہندوؤں کی ایک قبیح رسم "انتر جلی" کا ذکر کیا تھا۔ حکومت کی آنکھ بچاکر اب بھی یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اب مرنے والے کو عینِ حیات تو گنگا میں نہیں پھینکتے لیکن بیمار کی حالت نازک ہوتے ہی اس کی خبرگیری بند کر دی جاتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ دم نکلتے ہی اُسے گنگا میں ڈبو دیا جائے تاکہ اس کی روح کو نجات حاصل ہو۔ انگریزی کے اخباروں میں اس قسم کے د واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ گزشتہ ۱۲ مئی کو کلکتہ کے بازاروں سے ایک ارتھی نکلی جس میں ایک مفروضہ لاش تھی لیکن ارتھی کا سر ڈھنکا نہ تھا اور لوگوں نے دیکھا کہ آنکھوں کو دھوپ سے بچانے کے لیے مُردے کا ہاتھ اوپر اُٹھ جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر مُردے کے لو

نے سر پر چھتری کا سایہ کر دیا۔ ندی کنارے پہنچ کر ارتھی زمین پر رکھ دی گئی۔ وہاں مردے کو پیاس لگی اور اُسے دودھ پلایا گیا۔ اُسے لوہے سے داغا گیا کہ جان جلد نکل جائے۔ لیکن جب دو روز تک یہ سخت جان نہ مرا تو اُسے دوبارہ گھر پہنچا دیا گیا اور وہاں اُسے پانی میں اتنی ڈبکیاں دی گئیں کہ اُسے مرتے ہی بنی۔

حال ہی میں الہ آباد میں ایک بڑھیا گنگا کے کنارے جاں کنی کی حالت میں پہنچائی گئی۔ اس کی جان جلدی نہ نکلتی تھی اس لیے اس کی لڑکیوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ کچھ کہتی تھیں کہ اسے جلا دیا جائے، باقی کی رائے تھی کہ لکڑی کیوں ضائع کی جائے اسے دفن کر دیا جائے۔ اس بحثا بحثی کے دوران میں وہ دُکھیاری بڑھیا چپ چاپ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ آخر میں لڑکیوں نے طے کیا کہ اسے ریل میں بٹھا کر گھر واپس لے چلیں لیکن ریل والوں نے ادھ مری بڑھیا کو سواری کی اجازت نہ دی۔ لڑکیوں نے سوچا کہ چلو اس کا پارسل بنا دیں، پھر کسی کو خبر نہ ہوگی اور یہ دوسرے سامان کے ساتھ ریل پر لد جائے گی۔ چناں چہ انھوں نے یہی کیا!!!

مقالے کے آخر میں حسبِ دستور میں ہندستانی عالموں، ادیبوں اور مشرقیات کے اُن ماہروں کا ماتم کروں گا جو ہمیں پچھلے سال داغِ مفارقت دے گئے۔ لیکن سب سے پہلے میں اپنے ایک ذاتی غم کے ذکر کی اجازت چاہتا ہوں۔ میری رفیقۂ حیات ۲۸ سال تک میرے گلزارِ زندگی کو سرسبز رکھنے کے بعد حال ہی میں ایّامِ خزاں کا

مقابلہ کرنے کے لیے مجھے تنہا چھوڑ گئی۔ اتنے بڑے سانحے کے سامنے میں صبر اور خاموشی کی قوت کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔

شاعرِ بے ہمتا میر ببر علی انیس اسّی سال کی عمر میں دسمبر ۱۸۷۴ء میں لکھنؤ میں اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔ مثنوی سحرالبیان کے نام ور مصنف میر حسن کے وہ پوتے تھے۔ بہت سے ہندستانی انیس کو اُردو زبان کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ 'پنجابی' ان کے انتقالِ پُر ملال پر لکھتا ہے:[1] "افسوس کہ شعر و ادب کا سورج ڈوب گیا، اُردو کے باغ کا بلبلِ ہزار داستاں آج ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ انیس جو لکھنؤ کے سرتاج اور ہندستان کے سب سے بڑے شاعر تھے آٹھ روز کی علالت کے بعد ۱۰ ستمبر کو ہم سے بچھڑ گئے۔ وہ جگہ جو خالی کر گئے وہ کبھی پُر نہ ہوگی۔"

پنجابی کے کئی پرچوں میں اس سانحے پر کئی نوحے اور متعدد تاریخیں شایع ہوئی ہیں۔

'مرقعِ تاریخ' (۱۵ جنوری ۱۸۷۵ء) اس واقعۂ جاں کاہ کے متعلق لکھتا ہے: "لکھنؤ میں دو شاعر رہتے تھے۔ سب انھیں آسمانِ شاعری کا آفتاب و مہتاب سمجھتے تھے۔ ایک کا نام انیس اور دوسرے کا دبیر ہے۔ افسوس کہ اب یہ چاند کبھی نہ جگمگائے گا اور اس کے غم میں سورج کی تاب بھی پھیکی پڑ جائے گی۔

انیس و دبیر کو مرثیے کے میدان میں وہی رتبہ حاصل ہے جو آتش و ناسخ کو غزل کی صنف میں۔ اگر انیس کو آتش سے تعلق ہے تو دبیر ناسخ سے متاثر ہے۔ آتش اپنی فصاحت، سادگی اور خیال کی

---

[1] ۱۹ دسمبر ۱۸۷۴ء

گہرائی کے اعتبار سے بے مثل ہیں۔ ناسخ کی زبان پیچیدہ اور غیر مانوس تھی لیکن ان کے تخیل میں جدت تھی۔

انیس نے مرثیے میں آتش کا اور دبیر نے ناسخ کا راستہ پکڑا۔ شہادتِ حسینؓ تاریخِ اسلام کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہی اور اس کے واقعات کو نظم کرنے میں دونوں شاعروں نے فن کا پورا پورا کمال دکھایا ہی۔ قدرت نے ہر فن کار کو ایک خاص شخصیت دی ہی اور اس کا رنگ اس کے کارناموں پر چھایا ہوتا ہی۔ یہی وجہ ہی کہ 'انیسیہ' اور 'دبیریہ' اسکول کی اپنی خصوصیتیں ہیں اور وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔

انیس کے انتقال کے وقت دبیر زندہ تھے۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ بھی رحلت فرما گئے۔ میں نے اپنی کتاب "ہندوی و ہندستانی ادب کی تاریخ" میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہی: "میرزا سلامت علی دبیر مشہور مرثیہ گو ہیں اور اپنے کمالِ فن کی وجہ سے سارے ملک میں مشہور ہیں۔ ان کے استاد میر مظفر حسین ضمیر تھے اور دبیر لائق استاد کے لائق شاگرد ہیں۔ میرے پاس ان کے چار مرثیوں کی نقل موجود ہی۔"

دبیر کے انتقال کی خبر 'پنجابی' نے ان الفاظ میں چھاپی ہی:[1] "افسوس، صد ہزار افسوس کہ گلشنِ معنی اُجڑ گیا، آسمانِ سخن کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ مرثیہ گوئی کا فن آج ختم ہوگیا۔ بعد ازیں

---

[1] ۱۳ مارچ ۱۸۷۵ء۔ دو روز بعد کے پرچے میں دبیر کی موت پر ایک نوحہ فارسی میں اور ایک قطعہ عربی میں شایع ہوا ہی۔

کے شاعر میرزا دبیر کو میر انیس کے بعد دنیا کا رہنا پسند نہ آیا اور اسی غم میں گھل گھل کر وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔

یہ حادثۂ جاں کاہ جس نے لکھنؤ میں صفِ ماتم بچھادی ہو اسی مارچ کی ایک رات کو برپا ہوا۔ شہر کے علما و امرا، خواص و عوام جوق درجوق دبیر مرحوم کے مکان میں جمع ہوتے اور سارے شہر میں شیون و ماتم کا دل دوز سماں دیکھنے میں آیا۔ ہم میں اس سے زیادہ کہنے کی سکت نہیں کہ "اقلیم سخن کے بادشاہ کو اللہ تعالیٰ جوارِ رحمت میں جگہ دے"۔

۲۰ مارچ کے پرچے میں 'پنجابی' اسی سانحے کے متعلق لکھتا ہو: "میرزا دبیر مرثیہ گوئی کے فن میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور ان کے تقوے کا یہ حال تھا کہ ساری رات عبادت میں گزار دیتے تھے۔ سخاوت میں اپنے وقت کے حاتم تھے۔ کم عمری میں ذل گیرؔ کی تلقین پر سلام کہنے لگے تھے لیکن ان کا جوہر مرثیے کی صنف میں آکر کھلا۔

نصیر الدین حیدر سے لے کر واجد علی شاہ تک تمام شاہانِ اودھ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ پچھلے سال دبیر جب کلکتہ گئے تو سابق شاہِ اودھ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ واجد علی شاہ نے ان سے برابری کا سلوک کیا اور خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ واجد علی شاہ نے ان کے خیر مقدم میں ایک شعر بھی کہا جس کا مطلب یہ ہو کہ "مجھے چمپا کی مہک سے دبیر کے کلام کی مہک زیادہ پسند ہو"۔ رخصت کے وقت انھوں نے دبیر کو پانچ سو روپے کی پیش کش دی اور اس سال بھی اتنی ہی رقم بھیجی۔

کچھ عرصہ پہلے عظیم آباد میں مرحوم نے ایسے جوش و خروش سے مرثیہ خوانی کی کہ محفل میں تہلکہ مچ گیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد اختلاج قلب کی شکایت شروع ہو گئی۔ اسی وقت وہ لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ جہاں چند روز کی علالت کے بعد محرم کے دنوں میں انتقال فرمایا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔ جنازے کے ساتھ ہزاروں امیر و غریب مسلمانوں کا ہجوم تھا۔ دبیر کے صاحب زادہ میرزا محمد اوج نے اس موقع پر چند رُباعیاں کہیں اور جب وہ مجمع کے آگے پڑھی گئیں تو ہر طرف سے آہ و بکا کی صدا بلند ہوئی۔ اوج کے کلام کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ اپنے والد کا نام روشن کریں گے اور شاعری کی دنیا میں شہرت حاصل کریں گے۔

دبیر کی شہرت ہندستان سے نکل کر ایران و عراق تک پہنچ گئی تھی

اس سانحے کے بعد اوج جب حیدرآباد دکن گئے تو سرسالار جنگ نے انھیں مالا مال کر دیا اور ایک منصب بھی پیش کیا لیکن اوج کو لکھنؤ چھوڑنا منظور نہ تھا۔ وطن واپس آکر وہ شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں[1]۔

سال کے آغاز میں صرف ۴۹ سال کی عمر میں مشہور ماہر شرق اِل ٹوڈس پرچارڈ Iltudus Pitchard ڈیرا دون میں اس جہانِ فانی کو خیرباد کہہ گئے۔ فوج کی نوکری چھوڑ کر وہ وکالت کرنے لگے تھے۔ بعد ازاں دلّی گزٹ کی ادارت ان کے

---

[1] اودھ اخبار ۲ اگست ۱۸۷۵ء

سپرد ہوتی اور اس میں انھوں نے جو دل چسپ مضامین لکھے ان کا مجموعہ Sketches of life in upper India کے نام سے دو جلدوں میں شایع ہو چکا ہے۔ لیکن ان کا اصل کارنامہ The first ten years of administration under the crown ہے ہندستانی زبان سیکھنے کے لیے ان کی ابتدائی کتابیں بہت عام فہم ہیں۔ علاوہ براین انھوں نے "رومن لا" کے ہندستانی ترجمے میں بھی ہاتھ بٹایا۔ چند سال جب وہ لندن جاکر رہے تو ہندستان کی طرف سے کئی موثر تقریریں کیں۔

مدراس کے گورنر لارڈ ہربرٹ کا ۲۷ اپریل کو انتقال ہو گیا۔ تین سال سے وہ اس صوبے کے حاکم تھے اور ان کا دورِ حکومت امن و خوش حالی کی وجہ سے یادگار رہے گا۔ ایک زمانے میں وہ ترکی کے شاہی بینک کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں رہتے تھے اور وہاں مسلمانوں سے انھیں جو الفت ہوگئی وہ آخر دم تک باقی رہی۔ عجیب بات ہے کہ انگریز عام طور پر ہندوؤں کی طرف داری کرتے ہیں اور انھیں فائدہ پہنچانے کی غرض سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں نہیں چوکتے[1] مسلمان یہ سمجھتے اور اس کی بجا طور پر شکایت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس لارڈ ہربرٹ نے ہمیشہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا اور ان کے ساتھ انصاف کیا۔ مدراس میں انھوں نے

---

[1] حیرت ہے کہ انگریزوں کو یہ نہیں سمجھائی دیتا کہ ہمیشہ کی طرح ابھی بھی برہمن ملک کے اصلی حاکم ہیں۔ مسلمانوں کے زمانے میں وہ اسی ذوق و شوق سے فارسی پڑھتے تھے جس طرح اب انگریزی پڑھتے ہیں۔ مؤلف

حقوق کا تحفظ کیا اور ان کے ساتھ انصاف کیا۔ مدراس میں انھوں نے مسلمان طلبا کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان کی بیگم نے مسلمان طالبات کے لیے جو مدرسہ کھولا تھا، مسلم عوام اس کے فوائد کو اب سمجھتے جاتے ہیں اور اسی لیے انھوں نے مرحومہ کی تصویر مدرسۂ اعظم میں لگائی ہے۔ لارڈ ہربرٹ کا نام زندہ رکھنے کے لیے مدراس کی نئی بندرگاہ کو "ہربرٹ ہاربر" کا نام دیا جانے والا ہے۔

پریزیڈنسی کالج کی سال گرہ کے موقع پر مرحوم نے 'تعلیم' کے موضوع پر جو تقریر کی تھی وہ خلوصِ جذبات کی وجہ سے سارے ملک میں مشہور ہوئی اور سب نے اس کی داد دی۔

لارڈ ہربرٹ کے جنازے کے ساتھ ایسا جمِ غفیر تھا کہ اس کے بار سے لکڑی کا ایک پُل ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ کوئی ایک سو آدمی ندی میں گر پڑے۔ فوجی افسروں نے جان پر کھیل کر ان میں سے بہتوں کو بچا لیا صرف تھوڑے سے دریا بُرد ہوئے۔

لارڈ ہربرٹ کا منصب ڈیوک آف بکنگھم کو دیا گیا ہے۔ موصوف اس سے پہلے قابلیت کے ساتھ وزیرِ نوآبادی کی خدمت انجام دے چکے ہیں۔ ان کا تقرر ثابت کرتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ ہندستان کی عمل داری کو کتنی اہمیت دیتی ہے جس کا قدیم ترین انگریزی صوبہ مدراس ہے۔

۲۷ اپریل کو لندن میں ۹۰ سال کی عمر میں جنرل جان برگس John Briggs کا انتقال ہو گیا۔ اس صدی کے پہلے برس میں وہ مدراس کی فوج میں بھرتی ہوئے اور بڑھتے بڑھتے جنرل کے عہدے کو پہنچے۔ مرہٹوں کے خلاف جو لڑائیاں ہوئیں ان میں

وہ شامل تھے اور بھونسلا شاہی کے خاتمے کے بعد ناگ پور میں کمشنر ہوئے۔ پنشن لینے کے بعد وہ کئی سال پیرس میں رہے اور اس زمانے میں میری ان کی دوستی ہوئی۔ یوں تو انھوں نے ہندستان کے متعلق بہت کچھ لکھا لیکن ان کی شہرت کا مدار تاریخِ فرشتہ اور سیر المتاخرین کے ترجموں پر ہے۔

پیرس میں ۱۰ مئی کو نامور ماہرِ مشرقیات ایف۔جی۔ایچ ہاف F. G. Eichhoff اس دنیا سے سدھارے۔ انھیں قدیم سنسکرت شاعری سے عشق تھا۔ اس کے کئی شاہکاروں کے تراجم انھوں نے فرانسیسی اور لاطینی میں کیے۔ ان کا اصل کارنامہ "یورپ اور ہندستان کی زبانوں میں مشابہت" نامی کتاب ہے جس کا ترجمہ جرمن میں بھی ہوا ہے۔ میں یہاں شمالی و مشرقی یورپ کی زبانوں کے متعلق ان کے رسالوں کا ذکر نہیں کرتا جن کی وجہ سے وہ علمی دنیا میں مشہور ہیں۔ اپنے انکسار کی وجہ سے وہ منظرِ عام پر نہیں آئے اور انھیں وہ شہرت نہ ملی جو اُن کا حق تھا۔

۲۶ مئی کو احاطۂ بمبئی کے ایک شہر چٹ کلا Chitkala میں برار کے ناظمِ تعلیم ڈاکٹر سنکلیر کا ۳۵ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ ڈبلن یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل تھے اور طالبِ علمی کے زمانے میں یونانی زبان، ریاضی اور موسیقی میں خاص امتیاز حاصل کیا تھا۔ ۱۸۵۳ء میں وہ بمبئی کے الفنسٹن کالج میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور تقریباً دس سال تک اس خدمت پر فائز رہے۔ اس دوران میں وہ بمبئی یونی ورسٹی کے

لائبریرین بھی تھے۔ وہ اپنی اس خدمت سے اس وقت علاحدہ ہوئے جب کہ انھیں برار کا ناظمِ تعلیمات بنایا گیا۔ انھوں نے برار میں سررشتۂ تعلیم کی تنظیم بڑی تن دہی کے ساتھ کی۔ چھ سال کی مدت میں انھوں نے اپنے محکمے کی ایسی تنظیم کی کہ سکولوں کی تعداد ۳۳ سے بڑھ کر پان سو ہو گئی۔ سنسکرت فلسفے کا انھوں نے عمیق مطالعہ کیا تھا اور اس پر چند ابتدائی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ برار کے علاقے میں ان کی رحلت کا بڑا غم منایا گیا اور شہر اکولہ میں ایک تعزیتی جلسہ بھی ہوا جس میں ان کی یادگار منانے کے لیے چندہ جمع کیا گیا۔ پیرس میں اسی ۲ر دسمبر کو میرے دوست A Sedillot ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ انھوں نے مشرقی علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور عربوں کے علمِ نجوم وعلم الحساب پر ان کی کتابوں کو مستند سمجھا جاتا ہی۔ انتقال کے وقت وہ "عربوں کی تاریخ" کے نئے ایڈیشن کو ترتیب دے رہے تھے۔ افسوس کہ مرگِ ناگہانی نے یہ کام پورا نہ ہونے دیا۔

ضمیمہ

اس مقالے کے شروع میں مَیں نے 'دیوانِ ولی' کے ایک ایڈیشن کا ذکر کیا ہی جو حال ہی میں بمبئی سے شایع ہوا ہی۔ میرا قیاس ہی کہ مرتّب کے پیشِ نظر وہ نسخہ نہ تھا جو مَیں نے پیرس میں ۱۸۳۳ء میں شایع کیا اور جو دیوانِ ولی کا پہلا مطبوعہ ایڈیشن

ہے۔ بمبئی کے نسخے کے دیباچے میں کہا گیا ہے کہ "دیوان کا کوئی قلمی نسخہ کتابت کی غلطیوں سے خالی نہیں۔ لیکن اسے دو چار مختلف نسخوں کے مقابلے کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور حسب ضرورت متن کی تصحیح بھی کی گئی ہے یعنی تبدیلیاں کر دی گئی ہیں جو ظاہر ہے کہ نہایت آسان دیوان کو مرتب کرنے والوں کو نام نہاد اصلاح کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ان کا خیال تھا کہ ولی کے دیوان میں بعض متروک الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ترتیب دینے والوں کو اصلاح دیتے وقت یاد نہ رہا کہ ولی نے دکنی اُردو میں شاعری کی اور اس زبان کے محاورے شمال کی موجودہ زبان میں لامحالہ ناپید ہوں گے۔ ولی کے کلام کی خصوصیت یہی اجنبی زبان ہے اور لسانی اعتبار سے تو اس کی بڑی اہمیت ہے۔ علاوہ برایں مرتب نے بابائے ریختہ شاہ ولی اللہ دکنی اور ولی الدین احمد آبادی میں کوئی تمیز نہیں کی۔

دیوانِ ولی کو ترتیب دیتے وقت میرے پاس چھ مختلف نسخے تھے جن میں سے کئی اچھی حالت میں تھے اور میں نے ان کے چربے بھی اپنی کتاب میں دیے ہیں۔ بعد ازاں میں نے چار مختلف نسخے حاصل کیے جن میں سے ایک لال قلعے کے شاہی کتب خانے کا ہے اور اس پر محمد شاہ رنگیلے کی مُہر ہے۔ یہ نسخہ بہت اچھی حالت میں ہے۔ ان نئے نسخوں کے مطالعے سے بھی تصدیق ہوئی کہ میں نے جو متن طبع کیا، وہ صحیح ہے۔ میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ میرا ایڈیشن صحیح ہے کیوں کہ میں نے اس

نئے ایڈیشن کی طرح متن کو بدلنے کی کوشش نہیں کی اور ہر مصرعے کی بحر اور وزن کو جانچ لیا۔ ساتھ ساتھ میں نے دکنی کے ہر محاورے اور ہر ترکیب کو جوں کا توں رہنے دیا اور اس کا تعین آسان تھا کیوں کہ اس زمانے میں دکنی کے قواعد بندھے بندھائے تھے اور ہر اچھی گرامر میں دیے ہوتے ہیں۔

بمبئی کے ایڈیشن میں میرے طریقے کے برعکس ولی کو نیا لباس پہنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے کلام کو کاٹ چھانٹ کر مسخ کر دیا ہے۔ یہی نہیں کہ جدید صرف و نحو کا نشتر چلایا گیا ہے بلکہ دکنی الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ ایسے فارسی الفاظ رکھ دیے گئے ہیں جو شمالی ہند میں رائج ہیں۔ ایک بھی ایسی غزل نہیں جس کے بال و پر نہ نوچے گئے ہوں اور ہر غزل میں اشعار کی ترتیب بھی بدل دی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ دیوان کا ایک حصہ خارج کر دیا گیا ہے کیوں کہ میرے ایڈیشن میں ۴۵۳ غزلیں ہیں اور اس میں صرف ۳۷۳ یعنی اسّی غزلیں نکال دی گئی ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں جو میرے نسخوں میں موجود نہیں۔

اپنے اعتراض کے ثبوت میں نیچے میں چند مثالیں دیتا ہوں پہلے ہی شعر سے تصرف شروع ہوگیا ہے۔ ولی کہتا ہے:۔

کیتا ہوں تیرے ناوں کا میں ورد زبان کا

لیکن بمبئی کے ایڈیشن میں لکھا ہے:۔

رکھتا ہوں تیرے نام کو میں وردِ زبان کا

ذیل میں چند خالص دکنی الفاظ اور ان کی بدلی ہوئی شکلوں

کی فہرست ہے:

اصل	تصرف
کوں	کو
پو	پر
سوں	سے
منیں	میں
نکو	نہ
مجھ	میرے
توں	تو
تجھ	تیرے
وو	وہ
یو	یہ
اُن	اون
مُکھ یا مُنھ	رُخ
سجن	صنم
پاس یا کن	طرف
نگر	ملک
میٹھا	شیریں
نین	نگاہ یا نگار
چمن	گلزار
نیہہ	عشق

اسے مشتِ نمونہ خروارے سمجھیے۔

افعال کے ساتھ بھی یہی زبردستی برتی گئی ہو۔ پڑیا یا دیکھیا جیسے خالص دکنی شکل کو بدل کر دیکھا یا پڑا کر دیا ہو۔ سُنیا ہوں کی بجائے سُنا ہو کر دیا ہو۔ 'آن' سے مرتب کو ایسی چڑ ہو کہ ایک پوری غزل صرف اس لیے چھانٹ دی کہ یہ اس کی ردیف تھی۔ اسی طرح جگہ جگہ "ہووے گا" کی بجائے "ہوگا" بنا دیا ہو۔

کہیں کہیں بے خیالی یں چھاپے کی غلطی رہ گئی ہو مثلاً 'یہاں' اور 'نہیں' کی بجائے 'یاں' اور 'نیں'۔

دلی کا مصرعہ ہو:

تیرا لب دیکھ رضواں یاد آوے

لیکن بمبئی کے نسخے یں لکھا ہو:

تیرا لب دیکھ حیواں یاد آوے

کھڑا ہو راستی کے دم میں ایک پگ پوجیون جوگی

کی بجائے:

کھڑا ہو راستے کے دم میں آک اک یہ جوں جوگی

مجھ صدق طرف تو ہی ای اہلِ حیا دیکھ (ولی)

اس صاد صداقت کی طرف اہلِ حیا دیکھ (نسخۂ بمبئی)

ای غنچہ نہ فخر کر کہ یو دل — ہو بندِ پیا کی بکتری کا

ای غنچہ نہ فخر کر کہ یو دل — تکمہ ہو پیا کی بکتری کا (نسخۂ بمبئی)

جہاں کی فکر سوں آزاد کر مجھ — اپس کی یاد سوں آباد کر مجھ

جہاں کے عشق سے آزاد کر دے — اپس کی یاد سے آباد کر دے (نسخۂ بمبئی)

کہیں کہیں تو محض جدت کے شوق میں اصل کو مسخ کر دیا گیا ہی۔ مثلاً:

جلیا ہوں شمع نمط اُس کے مکھ کے شعلے سوں

اسے بدل کر یوں کر دیا گیا ہی:

گھلا ہوں شمع نمط اس نگہ کے پرتو سے (نسخہ بمبئی)

کہاں تک لکھا جائے۔ پیشِ نظر ایڈیشن کو میرے نسخے سے ملاکر دیکھیے اس قسم کی غلطیاں ہر سطر میں نظر آئیں گی۔

ہندستانی زبان اور ادب ۱۸۷۶ء میں

(۱)

گو کہ ملکۂ انگلستان نے سرکاری طور پر 'قیصرِ ہند' کا لقب اختیار کر لیا ہو لیکن ان کی قوم کو یہ خطاب ناپسند ہو۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ اس قسم کے القاب نیپولین کی مطلق العنانی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یوں تو اہلِ ہند نے ۱۸۵۷ء کے بعد جب ان کے ملک کی عنانِ حکومت براہِ راست فرماں روائے برطانیہ کے ہاتھ آگئی اُسے بلا تکلف قیصرِ ہند کہنا شروع کر دیا تھا۔ بہرکیف انگریزوں کی خوشنودی کے لیے اس پُر جلال خطاب سے پہلے 'ملکہ' کا لقب آئے گا اور یہ اس ترتیب کے برعکس ہو جو نیپولینِ اوّل نے اختیار کی تھی۔

اس نئے منصب کا اعلان بڑے تزک و احتشام سے سالِ آئندہ کی یکم جنوری کو وائس رائے کی موجودگی میں شاہ جہان آباد کے دربار میں ہوگا۔ یہ وائس رائے لارڈ لٹن ہیں جو پیرس میں برطانوی سفیر رہ چکے ہیں۔ وہ مشہور ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ پرتگال میں برطانوی ایلچی کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ حکومت نے انھیں ہندستان کا گورنر جنرل نامزد کیا۔

انگریزی جریدوں کی طرح ہندستانی اخباروں نے بھی شاہی لقب کی اس تبدیلی پر آزادانہ رائے زنی کی ہے لیکن ان کی دلچسپی کا مرکز یہ ہے کہ ہندستانی رئیسوں کے منصب پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ چناں چہ اودھ اخبار لکھتا ہے کہ[1] "ملکہ کو شہنشاہ کا نام دینے کے بعد یہ لازمی ہے کہ سربرآوردہ والیانِ ملک مثلاً نظامِ دکن کو بادشاہ کہا جائے اور اسی نسبت سے دوسرے راجاؤں اور نوابوں کے خطاب بدل دیے جائیں۔"

ملکہ کے قیصرِ ہند بن جانے کے بعد امیرِ کابل اپنے کو بادشاہ کہلانے کے فکر میں ہیں[2]۔ اس امر میں انھوں نے شاہی جرگے سے مشورہ بھی کیا اور اس نے امیر کی خواہش پر صاد کیا۔ کہا جاتا ہے کہ برما کا راجا اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کرنا چاہتا ہے کیوں کہ اسے زارِ روس، قیصرِ جرمنی اور ملکہ انگلستان سے گھٹیا ہونا منظور نہیں[3]۔

صرف ہندستان ہی نہیں بلکہ برطانیہ، فرانس اور فی الواقع ساری دنیا کے اخباروں نے شہزادۂ ویلز کے سفرِ ہند کا حال بالتفصیل شایع کیا ہے لہٰذا میں اُسے دُہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ البتہ چند خاص واقعات کا ذکر نامناسب نہیں۔ کلکتہ یونی ورسٹی کے ایک اجلاس میں شہزادے کو ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ امرت سر میں انھوں نے عیسائی مشن کے ناظم مسٹر بیرنگ کے ساتھ

---

[1] یکم مارچ ۱۸۷۶ء

[2] علی گڑھ اخبار ۱۶ مئی ۱۸۷۶ء

[3] علی گڑھ اخبار ۱۳ جون ۱۸۷۶ء

مشہور نو عیسائی مُناظر عماد الدین کو شرفِ باریابی بخشا۔ کہنے کی بات ہو کہ شہزادے کی تفریح کا جو انتظام کیا گیا، اس سے کئی دین دار انگریز ناخوش ہیں۔ مثلاً ہندو مندروں میں ان کے لیے جو سامانِ نظارہ مہیا کیا گیا یا سیلون میں گوتم بدھ کے دانتوں کی زیارت۔ ان سے بھی زیادہ ہاتھیوں اور گینڈوں کی لڑائی اور بیسواؤں کے شہوت خیز ناچ۔[1] ڈاکٹر ڈف نے جو کسی زمانے میں ہندستان میں مشنری کا کام کر چکے ہیں، ایڈن برا کے ایک جلسے میں اس کے خلاف احتجاج بھی کیا ہو۔

لیکن شہزادے کو صرف بازی گری اور ناچ ہی کے تماشے نہیں دکھلائے گئے۔ مدراس میں اُنھیں 'نل دمن' کا ناٹک دکھلایا گیا اور بمبئی میں ایک پارسی کلب نے 'حاتم طائی' کا ناٹک دکھلاکر اُنھیں محظوظ کیا۔

شہزادے کے احترام کا اس سے بڑا نظارہ کیا ہو سکتا تھا کہ پردہ نشین خواتین گاڑیوں اور پالکیوں پر سوار کلکتہ کی سڑکوں کو رونق بخش رہی تھیں۔ بلکہ ایک بابو[2] تو انھیں بہ نفسِ نفیس اپنے زنان خانے میں لے گیا۔ یہ ایک ایسی جدّت تھی کہ ہر طرف سنسنی پھیل گئی۔ کسی بگڑے دل نے "جگانند اور راج کماد" کے عنوان سے ایک طنزیہ ڈراما لکھ مارا جسے دکھلانے کا انتظام نیشنل تھیٹر میں کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس میں بابو جگانند، اس کے خاندان، شہزادہ ویلز اور یورپین

---

[1] Indian Mail ۲۹ نومبر ۱۸۷۵ء

[2] امرت بازار پتر کا نے اس بابو جگانند کی بڑی خبر لی ہو لیکن اودھ اخبار نے اس کی حمایت میں مضمون لکھا ہو۔

خواتین — ایک سِرے سے سبھی کو لتاڑا تھا۔[1] وہ تو خیر ہوئی کہ پولیس نے یہ ناٹک نہ ہونے دیا۔

لاہور میں ولی عہد نے مغلیہ گھرانے کے ۱۲۰ افراد[2] کے علاوہ افغان شہزادوں اور گرونانک وگرو گووند سنگھ کے وارثوں سے ملاقات کی۔ گو کہ والیانِ ملک کو سختی سے منع کر دیا گیا تھا کہ نذر نہ پیش کریں، تاہم ان میں سے کئی اپنے کو اس قدیم رسم کی پابندی سے باز نہ رکھ سکے۔ ولی عہد کا نذر کو چھو دینا ہی ان کے اطمینان کے لیے کافی تھا۔

جب ولی عہد کشمیر گئے تو وہاں کے مہاراجا نے قید خانوں کے دروازے کھول دیے تاکہ قیدی شاہی مہمان کے لیے دُعا کریں۔

سفر کے دوران میں ولی عہد جن لوگوں سے ملے، ان میں سیّد عبداللہ بھی تھے جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ سیّد صاحب

---

[1] Indian Mail ۲۵ مارچ اور یکم اپریل ۱۸۷۶ء

[2] ان کے متعلق پنجابی یکم اپریل سالِ حال کی اشاعت میں لکھتا ہے: "دہلی میں بھی قدیم شاہی گھرانے کی طرف سے شہزادۂ ویلز کی خدمت میں پنشن کی درخواست گزرانی گئی تھی۔ کمشنر کی وساطت سے انھوں نے درخواست کی رسید بھیج دی لیکن حیرت ہے کہ اب تک اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ سب جانتے ہیں کہ دہلی کے شہزادے بڑے ناز ونعمت کے پالے ہوئے ہیں لیکن اب مرورِ ایّام نے انھیں دانے دانے کا محتاج کر دیا ہے۔ کہنے کو تو وہ صاحبِ عالم کہلاتے ہیں لیکن ان کی گرہ میں نانِ شبینہ کے لیے دام تک نہیں ہیں۔ فرض تو یہی کہتا ہے کہ یہ ہمدردی کے مستحق ہیں، ان سے پرخاش بے جا ہے اور اس کی بجائے ان سے رحم وانصاف کا برتاؤ کرنا چاہیے۔"

عرصۂ دراز تک انگلستان میں رہ چکے ہیں اور وہاں ملکہ کے حضور میں کئی مرتبہ پیش ہوئے تھے۔ کسی موقعہ پر شہزادۂ ویلز نے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ چناں چہ ولی عہد نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ بعد میں جب ان کی بابت گورنر بنگال سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ بہار میں انسپکٹر مدارس ہیں۔

دلی گزٹ کے حوالے سے اودھ اخبار نے لکھا ہے[۱]:

کلکتہ کے قیام کے زمانے میں شہزادے نے شاہِ اودھ واجد علی شاہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے جواب میں شاہِ اودھ نے کہلا بھیجا کہ اگر آپ مجھے بادشاہ سمجھتے ہیں تو یہ میرا مرتبہ نہیں کہ آپ کے گھر آؤں۔ لیکن آپ کی نظر میں اگر میں ایک غریب الوطن فقیر ہوں تو پھر میرا منھ کہاں کہ آپ کے روبہ رو آسکوں۔ کہتے ہیں کہ شہزادہ اس جواب سے اتنا متاثر ہوا کہ خود واجد علی شاہ سے ملنے گیا۔ دورانِ گفتگو میں اس نے وعدہ کیا کہ ان کی سفارش ملکہ سے کرے گا۔ چلتے وقت شاہ نے ہیرے موتی سے جڑی ہوئی ایک جریب نذر کی۔ اس ملاقات سے لوگوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ شاید اودھ کا تخت واجد علی شاہ کو واپس مل جائے گا۔ اودھ اخبار لکھتا ہے: "اس قسم کی افواہ بے بنیاد ہے اور اس پر اعتبار نہ کرنا چاہیے"۔ بہرحال اس کے بعد حکومت نے شاہِ اودھ کے بڑے لڑکے کو پندرہ روز کے لیے لکھنؤ جانے کی اجازت دی۔ اسٹیشن پر شہر کے رؤسا ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ لکھنؤ میں وہ اپنی پھوپھی کے گھر ٹھیرے[۲]۔

---

[۱] ۱۸ فروری ۱۸۷۶ء [۲] Indian Mail ۲۸ اگست ۱۸۷۶ء

اس سفر میں شہزادے کو جو بیش قیمت تحفے تحائف ملے ان میں سے ایک خاص طور پر قابلِ ذکر ہی۔ یہ راجا روی ورما کی بنائی ہوئی تصویر ہی جس میں ایک ہندستانی لڑکی بین بجا رہی ہی۔ بہت سے نایاب تحفوں کے ساتھ مہارا جا ٹرادنکور نے یہ تصویر بھی شہزادے کو دی تھی۔ اس کا شمار ہندستانی آرٹ کے شاہ کاروں میں ہوتا ہی اور مدراس کے فنونِ لطیفہ کی نمایش میں اس پر انعام ملا تھا[۱]۔ دو سال بعد پیرس میں جو نمایش ہوگی اس میں شہزادۂ ویلز نے ہندستانی صنعت کے ان سب نادر نمونوں کو بھیجنے کا وعدہ کیا ہی۔ اس لیے ہم بھی انھیں ایک نظر دیکھ سکیں گے۔

اکثر ہندستانی اخباروں نے اس شاہی سفر کو جی بھر کر سراہا ہی۔ لیکن بعض مخالفوں نے جن میں بمبئی کا راست گفتار بھی شامل ہی، لکھا ہی کہ رئیس شاکی ہیں کہ ان سے ان کے شایانِ شان سلوک نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں اودھ اخبار نے "کیا ہندستانی رعایا انگریزی حکومت سے خوش ہی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہی۔ میں اسے جستہ جستہ نقل کرتا ہوں تاکہ ہندستانی اخبار حکومت کی جس پیرایے میں مخالفت کرتے ہیں، اس کا علم آپ کو ہو جائے: "اس سوال کا جواب زبانِ حال سے ہوگا یعنی ہماری حالت سے ہمارے دل کا حال معلوم کر لیجیے۔ ہر چیز کا ظاہر بھی ہوتا ہی اور باطن بھی، ہماری ظاہری حالت کا اندازہ حکومت درباروں میں لگاتی ہی جہاں ہم سے پوچھا جاتا ہی کہ کیا تم مطمئن ہو۔ جواب میں ہاں کہتے

---

[۱] علی گڑھ اخبار ۱۱ فروری ۱۸۷۶ء

کے سوا کیا چارہ ہے۔ لیکن دل کا حال اللہ بہتر جانتا ہے۔ اس سے تو یہی آواز نکلتی ہے کہ ہم اس حکومت سے مطمئن نہیں کیوں کہ اسے ہماری بہت سی ضروریات کا خیال نہیں۔ یہ حکومت نہیں جانتی کہ ہم ایشیائیوں کو کس طرح عافیت مل سکتی ہے۔ حکومت کو ہماری خوش حالی کا فکر ہونا چاہیے۔ آدمی کا دل تبھی سیر ہوتا ہے جب اس کی خواہش پوری ہو۔ شہزادۂ ویلز کو ہی لیجیے جو ایک بہت بڑی سلطنت کے چشم و چراغ ہیں۔ وہ مطمئن ہیں کیوں کہ ان کے اشارۂ چشم پر سب کچھ حاضر ہے۔ ان کی خاطر میں ہندستان نے ہُن کی بارش کر دی اس لیے وہ جتنے بھی محظوظ ہوں، کم ہے۔ لیکن ہندستانیوں کی اس مہمان نوازی کو اُن کے قلبی اطمینان پر محمول کرنا غلط ہوگا۔ شہزادے کو خوبیوں کا سرچشمہ کہہ لیجیے لیکن اس سے ہندستانیوں کو کیا۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ حکومت کو ہمارے کروڑوں اہلِ وطن کی بہبودی کا کوئی خیال نہیں جب لوگ بھوکے مر رہے ہوں تو انھیں اطمینان کس بات کا ہونے لگا؟ زبان سے وہ کچھ بھی کہیں لیکن زرا ان کے دل سے پوچھو۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی روایت کے مطابق ہندستانی قناعت کر لیں اور ہر حال میں توکّل کا وِرد کرنے لگیں۔ لیکن اطمینان انھیں ہرگز نہیں —— کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم غیر ملکیوں کے تابع ہیں؟ صرف یہی بات نہیں۔ عیسائی ہوں یا کوئی اور ہندستانیوں کو تو اپنے پیٹ سے مطلب ہے۔ ان پر تو وہ مثل صادق آتی ہے کہ پیٹ بھر دو خواہ بعد میں جوتے مار لو۔

ہندستانیوں پر صدہا سال سے پردیسی حکومت کرتے آئے ہیں۔

لیکن ان کے زمانے میں یہ فاقہ کشی نہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ پُرانے
اپنے خزانے رعایا میں نہ بانٹ دیتے تھے لیکن رعایا میں یہ کنگا
نہ تھی کیوں کہ ملک کا رُپیہ ملک میں ہی رہتا تھا۔ بادشاہ کے بڑ
درباری کروڑوں رُپے کماتے اور خرچ کر دیتے تھے۔ لیکن اب تو
مال سمندر پار چلا جاتا ہے۔ جب تک حکومت یہ تہیہ نہ کرلے کہ ہن
کی دولت باہر نہ جائے گی تب تک امن قائم نہ ہو گا۔

اگر کوئی ایشیائی فراخ دلی کی مثال مانگے تو ایک نہیں سَ
ہیں۔ جب والیانِ ملک سفر کو نکلتے ہیں، خندہ پیشانی سے لاکھ
رعایا میں تقسیم کر دیتے ہیں جب وہ شہزادے کو دیکھنے کلکتہ گئے تو سڑ
رُپے لٹائے گئے۔ لیکن انگریزوں کے ہاں شاہی خیرات کا ذکر ہی کیا۔ یہ ہے اب
سخاوت جسے اہلِ ہند ہمیشہ سے دیکھتے آئے ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ شہ
نے دس بیس کروڑ تو خرچ کیے ہوتے کہ رعایا کو بھی ان کی آمد کا احساس ہوتا۔
بھی کہتے کہ ہاں کوئی بادشاہ آیا تھا۔ لیکن ان کے رُخِ زیبا
دیدار کے علاوہ غریب ہندستانیوں کے پلّے کچھ نہ پڑا۔ اسی
ان بے چاروں کے چہرے شاد لیکن دل اُداس .....

یہ سچ ہے کہ موجودہ حکومت نے تعلیم کی اشاعت میں بڑ
فیاضی سے کام لیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس اقدام سے ہما
غربت میں اضافہ ہی ہوا۔ یہ لاکھوں طالبِ علم آخر کس ترکیب
روٹیاں کمائیں گے؟ کاش حکومت اس اہم مسئلے پر بھی توجہ ک
تعلیم کی اس افراتفری سے دھوکا ہونے لگتا ہے کہ شاید خوش
کوئی چشمہ پھوٹ پڑے گا۔ لیکن یہ بدنصیب ہندستانی کریں کیا

حکومت کو علم سے محبت ہے اس کے باوجود عالم رفتہ رفتہ عنقا ہوتے جاتے ہیں کیوں کہ ان کے لیے روٹی کی کوئی سبیل نہیں۔ کیا آپ اسے سرپرستی کہیے گا کہ کوئی ناشر ہزاروں رُپے کے خرچ سے کسی کتاب کی دو تین ہزار کاپیاں شایع کرے اور حکومت اس میں سے دو چار خرید لے۔ یہی حال اخباروں کا ہے۔ اسی کو اونٹ کے منھ میں زیرہ کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندستان کا کوئی چھاپے خانہ یا اخبار متموّل نہیں۔

غرض کہ ہم لوگوں کا بس اللہ بیلی ہے۔ اگر حکومت کو صرف رئیسوں کا پاس ہے اور یہ خیال ہے کہ کچھ نہ کرنے میں ملک کی بہتری ہے تو لاریب قیصرِ ہند کے خطاب اور ولی عہد کے سفر سے ہر طرف خوش حالی عام اور حکومتِ برطانیہ کی بنیاد زیادہ مستحکم ہو جائے گی۔"

کرسمس کی تقریب میں شہزادۂ ویلز کلکتہ میں تشریف رکھتے تھے۔ کلیسا میں ان کی موجودگی میں بڑے پادری نے اپنے خطبے میں کہا کہ جب کسی عیسائی کو کافروں کے ساتھ رہنا پڑے تو اسے اپنے آپ کو مذہبی مبلّغ سمجھنا چاہیے اور اس معاملے میں عیسیٰؑ کی پیروی کرنی چاہیے۔

جنوری نمبر میں اودھ اخبار نے سالِ نو کی تقریب پر پانچ تاریخیں شایع کی ہیں۔ شہزادے کی تشریف آوری کے موقع پر بھی شاعروں نے تاریخیں کہیں اور سارے ملک میں "شہزادۂ ویلز شہنشاہِ عالم" کا غلغلہ بلند ہوا۔ ان کی شان میں جو قصائد و قطعات وغیرہ کہے گئے ہیں، ان کا مجموعہ شایع کرنے کی تجویز ہے۔ مختلف اقوام کے

کم ازکم ڈیڑھ سو شعرا نے تو ضرور طبع آزمائی کی ہے جن میں سے آٹھ کو اودھ اخبار نے خاص طور پر سراہا ہے۔ ان میں سے چار نظمیں انگریزی کی ہیں اور باقی ایک ایک ہندستانی، سنسکرت، بنگالی اور تلنگو کی۔ ہندستانی کا قصیدہ حیدر علی کا لکھا ہوا ہے اور ان حضرات نے مدح سرائی میں مبالغے کی انتہا کر دی۔ ان کے لیے ولی عہد بہادر افلاطون سے زیادہ عاقل اور ارسطو سے زیادہ فاضل ہیں۔ ان کا دل سمندر سے زیادہ وسیع ہے اور ان کے قدموں کی خاک آسمان کی خبر لاتی اور ابر رحمت بن کر برستی ہے!

اس شان دار سفر کے بعد کئی معزز ہندستانیوں کو یورپ جانے کا شوق ہوا۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر سر سالار جنگ وزیر اعظم مملکتِ نظام ہیں۔ انگلستان آتے جاتے ہوئے وہ چند روز کے لیے پیرس میں بھی رکے تھے۔ وہ اپنی معاملہ فہمی اور بردباری کے لیے مشہور ہیں اور انھوں نے انگریزوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ یہ انھی کا اثر تھا کہ نظام نے برار کا زرخیز صوبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا۔ حیدر آباد ریاست نے انتظام کو درست کرنے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے زمانے میں حیدر آباد میں بد امنی کا بڑا اندیشہ تھا۔ باغیوں نے ریزیڈنسی پر حملہ کر دیا تھا اور انگریزوں کا طرف دار سمجھ کر سر سالار جنگ کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ انھوں نے بڑے تدبر سے اس ہنگامے کو فرو کیا۔ ریاست میں امن قائم کرنے کے بعد انھوں نے انگریزوں کی جو فوجی مدد

۵؎ یہ صحیح نہیں (ایڈیٹر)

کی اسی کی وجہ سے متوسط ہند میں غدر کی آگ زیادہ نہ بھڑک سکی۔ اپنی خدمات کے صلے میں انھیں G.C.S.I. اور 'سر' کے خطابات ملے۔ ریاست کا کچھ دبا ہوا علاقہ واپس ملا اور بہت سا قرض معاف ہو گیا۔ ۱۸۶۹ء میں نظام کے انتقال کے بعد ان کے وارث کی کم عمری کے زمانے میں جو کونسل بنی، سر سالار جنگ اس کے روحِ رواں ہیں اور ملک کا انتظام انھی کے سپرد ہے۔

ملکۂ معظمہ نے اپنے محل میں ان کا استقبال کیا اور انھوں نے اظہارِ اطاعت کے طور پر نذر گزرانی۔ باوجود یہ کہ وہ شیعہ مسلمان ہیں انھوں نے پاپائے اعظم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ چناں چہ رُوم میں مقدس پوپ نے انھیں شرفِ باریابی بخشا اور عیسائیوں کے حق میں ان کے حُسنِ سلوک کی تعریف کی۔ سر سالار جنگ کی رواداری ضرب المثل ہے اور وہ پارسیوں تک سے کمالِ مہربانی سے پیش آتے ہیں گو کہ ساری ریاست میں ان کی تعداد صرف تین سو ہے۔ بڑے بڑے عہدے ان کے تفویض کیے گئے ہیں۔[1]

اپنے سفر کے دوران میں شہزادۂ ویلز پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی ہوگی کہ ہندستان میں جو زبان سب سے زیادہ عام ہے، وہ ہندستانی ہی ہے۔[2] یہی بات پروفیسر Monier Williams مونیر ولیمس نے کہی ہے جو ہندستان سے واپسی کے بعد ایک خط میں مجھے لکھتے ہیں: ہندستان

---

[1] علی گڑھ اخبار ۴ ستمبر ۱۸۶۶ء

[2] ہندستانی صرف ایشیا اور افریقہ کی بندرگاہوں ہی میں نہیں بلکہ امریکہ کے صوبہ کیلی فورنیا تک میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو Cold Well Galigm s Messenger ۲۰ اگست ۱۸۶۶ء

کا سفر کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ہندستانی کی اہمیت روز بہ روز بڑھتی جاتی ہے۔ میں تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ وہ اس حد تک قومی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ اسے جانے بغیر کوئی عوام کی بات نہیں سمجھ سکتا؛ پادری (Caldwell) کالڈویل نے لکھا ہے[۱] کہ اگر ملک میں صرف ہندستانی کا ہی استعمال ہونے لگے تو مشنریوں کو بڑی آسانی ہوگی۔ لیکن بدقسمتی سے فی الحال اس کا امکان نہیں انگریزی، سنسکرت اور فارسی کے علاوہ درجنوں صوبہ جاتی زبانوں کا چلن ہے۔ تاہم ہندستانی کم و بیش ہر جگہ سمجھی جاتی ہے اور شمالی و متوسط علاقوں کی تو وہ مادری زبان ہے۔ یہاں تقریباً دس کروڑ انسان آباد ہیں۔ غیر ممالک میں انجیل کی اشاعت کرنے والی سوسائٹی[۲] نے اپنی پچھلی رپوٹ میں ہندستان کا ایک لسانی نقشہ درج کیا ہے۔ اس میں بھی اس امر کی تصدیق ہے کہ ملک کے اکثر حصّوں میں ہندی یا اُردو کا رواج ہے۔ اور بہ قول پادری کالڈویل گو کہ ہندی اُردو کا اختلاف بڑھتا جاتا ہے لیکن دونوں میں برائے نام فرق ہے۔ اُردو وہ ہندی ہے جس میں فارسی و عربی کے الفاظ کی بہتات ہے۔

اب انجمن عرب سرائے (دہلی) کے سکریٹری لالہ فقیر چند کا ایک مضمون ہندستانی زبان پر ملاحظہ ہو جو کہ 'پنجابی' (بابت الملح

---

[۱] Languages of India صفحہ ۴

یہ عجیب بات ہے کہ پادریوں نے کافی اصلاح کے بعد جو رومن رسم الخط رائج کیا ہے ملک والے نہ اسے جانتے ہیں اور نہ اس کی قدر کرتے ہیں۔

[۲] Society for the propagation of Gospel in Foreign

سالِ رواں) میں چھپا ہی: "اکثر انگریزوں کی رائے ہو کہ ہندستانی صحیح طور پر اپنی زبان نہیں جانتے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس کی خوبیوں کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ ان کے عالم عربی، فارسی یا انگریزی کے مطالعے میں اپنی صلاحیت صَرف کرتے ہیں۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ دوسری زبانوں کا مطالعہ سودمند ہی یا بے سود۔ ہم تو صرف اتنا کہیں گے کہ ہماری زبان دنیا کی سب سے مہذب زبان ہی۔ اور یہ شکایت بالکل بجا ہو کہ ہم اس کی اہمیت سے بے خبر اور اس کی خوبیوں سے ناآشنا ہیں۔ یہ رویّہ قابلِ ملامت ہی کیوں کہ ہر انسان پر اس کی زبان کا حق ہی۔ یہی وجہ ہو کہ ہماری انجمنِ لسانیات کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہی اور ہماری مطبوعات میں صحتِ زبان کا بڑا خیال کیا جاتا ہی۔ دوسری انجمنیں اپنی اپنی ڈگر پر چلیں لیکن ہم زبان کی خدمت کے لیے وقف ہیں....."

میں نے پچھلے مقالے میں بیان کیا تھا کہ بہار کی عدالتوں اور دفتروں پر ہندی کے حملے کو اُردو نے روکنے کی پوری کوشش کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہو کہ پانسہ پلٹ گیا اور بازی ہندی کے ہاتھ رہی۔ بہار ہیرلڈ کے جس مضمون کا حوالہ علی گڑھ اخبار (۱۲ نومبر ۱۸۸۰ء) نے دیا ہی، اس سے تو یہی بات نکلتی ہی۔ معلوم ہوتا ہی کہ سر کیمپبل کے اشارے پر حکومتِ بنگال نے ہائی کورٹ کو ہدایت کی ہو کہ عدالتوں میں ہندی کی سرپرستی کرنی چاہیے۔ یہ بھی کہا ہی کہ ہندی میں لکھی ہوئی درخواستوں کو منظور کرنا چاہیے اور صرف عام بول چال کی زبان کا استعمال ہونا چاہیے۔ ہائی کورٹ نے اس

ہدایت پر عمل بھی شروع کر دیا ہے۔ اس کے متعلق اودھ اخبار[1] نے "بہار میں ناگری کی ترویج کا حادثۂ عظیم" کے عنوان سے یہ مضمون لکھا ہے: "حکومتِ بنگال مُصر ہے کہ ہندی کو بہار کی عدالتی زبان قرار دیا جائے۔ اس حکم سے عُہدے دار اور عوام دونوں سخت بددل ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ سب کو ناراض کر کے ناگری رسم الخط اور ہندی بولی کی ہمت افزائی کیوں کی جا رہی ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ رعایا کی مرضی کو مسترد کر کے حکومت زبردستی یہ بدعت ان پر مسلط کر رہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ حکومت یہ رویّہ اختیار کرے کہ عدالت ہماری ہے اور رجسٹر بھی ہمارے ہیں پھر ہماری مرضی کہ کوئی بھی خط استعمال کریں۔ عام چلن سے ہمیں کوئی سروکار نہیں"

ہندستانی تہذیب اور اردو زبان کے مخالف اس سے بھی زیادہ جبر کر رہے ہیں۔ صوبۂ اودھ میں تین سو سال سے اُردو بولی اور لکھی جاتی ہے۔ اب وہاں کے کمشنر کو خدا جانے کیا سوجھی کہ ہندی کے ایک دیہاتی شکل 'کیتھی' کو رائج کرنے کی ٹھان لی ہے[2]۔ جب یہ سب اندھیر ہو رہے ہوں تو سرکاری ملازموں اور سماج کے مختلف طبقوں کی بددلی فطری امر ہے۔

میں گورنر جنرل اور وزیرِ ہند کی توجہ اس بے انصافی کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ یہ غنیمت ہے کہ حیدرآباد نے اُردو کی پشت پناہی سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ وہاں کی حکومت نے اودھ اخبار

---

[1] ۱۹ جنوری ۱۸۷۶ء

[2] علی گڑھ اخبار ۱۸ اگست ۱۸۷۶ء

کے توسط سے اشتہار دیا ہو کہ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت ہو اور انھیں معقول معاوضہ دیا جائے گا۔

مصنفوں اور شاعروں میں ہندی اُردو کا باہمی تنازع نہیں ہوتا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ راجا شو پرشاد نے ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں کتابیں لکھی ہیں۔ جن لوگوں نے دونوں زبانوں کی خدمت کی ہو ان کے حالات میں اپنی کتاب "ہندستانی ادب کی تاریخ" میں درج کر چکا ہوں۔ ان میں پالن پور کے نواب زادہ آغا محمد سکندر خاں کا نام نہیں آیا جن کی صفات پر اودھ اخبار (۲۸ جنوری ۱۸۷۶ء) نے روشنی ڈالی ہو۔ ان کی ابتدائی تعلیم ہندی میں ہوئی اور اس زبان میں انھوں نے چوپائی اور دوہے لکھے۔ پھر موسیقی اور مصوری کا شوق ہوا اور ان فنوں میں انھوں نے بڑا کمال حاصل کیا۔ بعدازآں اُردو و فارسی کی طرف رجوع ہوئے اور بلاتکلف اُردو میں شعر کہنے لگے۔ غرض کہ ان کی طبیعت ہر مضمون میں حاضر ہو۔ حتیٰ کہ تاریخ و طب سے بھی خاص شغف ہو۔

مغرب کی تقلید محض طرزِ انشا تک ہی محدود نہیں بلکہ تحریر میں بھی اس کا اثر دیکھا جاتا ہو۔ اودھ اخبار کا بیان ہو:[۱] اُردو کی بعض کتابوں اور اخباروں میں رومن رسم الخط کے اوقاف کا استعمال ہونے لگا ہو۔ اب کاتب کا قصور ہو یا ناظر کی جہالت اور یا مضمون نگار کی کم فہمی — ان علامات کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہیں آتا اور لوگ انھیں کیڑے مکوڑے کہتے ہیں۔ اس

[۱] ۱۴ نومبر ۱۸۷۵ء

میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ علامات صاف لکھی ہوئی ہوں اور ان کا مفہوم آسانی سے سمجھ لیا جائے تو اس سے فائدہ ہوگا۔ لیکن جب تک ان اجنبی علامات کو باقاعدگی اور صفائی سے لکھنا اور سمجھنا نہ آجائے مطلب کے خبط ہونے کا خطرہ ہے اور فائدے کی بجائے سراسر اُلٹا نقصان ہے۔"

دہلی اور لکھنؤ کے شاعروں میں جو رقابت چلی آتی ہے اس کے متعلق اودھ اخبار نے لکھا ہے کہ:[۱] "بہت سے بے خبر نقّاد پوچھا کرتے ہیں کہ کیا دہلی میں شعر و ادب کا اب بھی چرچا ہے۔ ان کی نظر میں وہاں اب کوئی نامور ادیب یا شاعر نہیں رہا۔ یہ معترض طعنہ زن ہیں کہ وہ اُردوئے معلا کیا ہوئی۔ ہماری رائے میں یہ نکتہ چینی بالکل بے جا ہے.... ماننے کی بات ہے کہ زمانۂ حال کے بہت سے عالم اور شاعر مثلاً غالب، ذوق، ظفر، صہبائی، مفتی صدر الدین اس محفل سے سدھار گئے۔ جو رہ گئے ان کے ساتھ دنیا نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا........ ہم یہ بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ لکھنؤ کو جن لوگوں پر ناز تھا ان میں سے اکثر حال ہی میں ہم سے بچھڑ گئے۔ دہلی کی خفتہ روح از سر نو بیدار ہوئی ہے اور اس شہر کی ادبی مجلس میں وہی پُرانی سج دھج نظر آتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کیوں کہ بہت سے حضرات اس شہر کی تباہی سے قیاس کرتے ہیں کہ اس کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب دہلی کے ہاتھ میں ملک کی واگ ڈور تھی اور اس کے دم سے سارے

---

[۱] ۲۵ نومبر ۱۸۷۸ء

ہندستان میں تہذیب وترقّی کی مشعل روشن تھی۔ دہلی اُردو زبان کی ٹکسال تھی اور شاعری کے فن میں اس کا پایہ سب سے بلند تھا۔ نثر کو لیجیے تو اس وقت دہلی میں ایسے ایسے مصنف ہیں جن کی شہرت ملک بھر میں ہے۔ ان میں سے کچھ کے نام سُنیے: میرزا غالب کے عزیز خواجہ امن مترجم بوستانِ خیال، علی گڑھ کالج کے بانی سیّد احمد خاں مصنف آثار الصنادید، مولوی نظیر احمد مصنف توبتہ النصوح، مرأۃ العروس، بنات النعش۔ منشی محمد ذکاء اللہ مصنف تاریخِ ہند۔ پروفیسر محمد حسین آزاد پروفیسر عربی ومصنف تصانیف متعددہ، مولوی محمد مظہر اللہ صاحب مظہر المضامین، نواب ضیاء الدین احمد خاں مصنف مسلّم الثبوت اور نواب علاء الدین احمد، مولوی ضیاء الدین اور پروفیسر رام چند، مولوی نصرت علی۔ یہ فہرست نامکمل ہے کیوں کہ دہلی کی ہر گلی بڑے بڑے عالموں سے بھری پڑی ہے۔ میں ڈاکٹر محمود خاں، ڈاکٹر محمد سلیم خاں، منشی محمد فخر الدین، مولوی الطاف حسین، میرزا قربان علی بیگ اور مولوی نجف علی مؤلف شرح مقامات حریری جیسے مستند عالموں کو فراموش نہیں کر سکتا جن میں سے ہر ایک نے زبان کو ترقّی دینے میں بڑا کام کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے طِب، ادب یا شاعری کے شعبے میں سیکڑوں آدمیوں کو متاثر کیا ہے۔ لہٰذا یہ تعصب کس قدر افسوس ناک ہے کہ ہماری ادبی مجلسوں میں دہلی کے مرتبے کو کم کر کے دکھلانے کی دانستہ کوشش کی جاتی ہے۔ دہلی کی جن تصانیف کی اشاعت تمام ملک میں ہو رہی ہے انھیں قابلِ التفات نہیں سمجھا جاتا اور اس کے صدہا

شاعروں میں سے بہ مشکل دو چار گھٹیا شخصیتوں کا نام لیا ہے"۔

مشرقی ادب کی بدعتوں میں 'سرقہ' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مورخ اور شاعر بلا تکلف دوسروں کی چیزوں کو بے ڈکار لیے ہضم کر جاتے ہیں۔ سرقہ کے متعلق قواعد بھی منضبط کیے گئے ہیں۔ کھلی ہوئی ادبی چوری ممنوع ہے لیکن پردے پردے میں ہاتھ صاف کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ چناں چہ ایسی غزلیں بھی ہیں جنھیں دو شاعر اپنے نام سے منسوب کرتے ہیں اور حقیقت کا فیصلہ محال ہے۔ اس قسم کی ایک مثال اودھ اخبار سے نقل ہے جس کے مضمون کا عنوان ہے[1]:

"چہ دلاور است دزدے کہ بہ کف چراغ دارد"!

منشی طفیل احمد غافل نے کندن لال گوہر بدایونی پر الزام لگایا ہے کہ ان کا کلام آخر الذکر صاحب نے اپنے نام سے چھاپ ڈالا۔ حضرت غافل کے ہاتھ یہ مسروقہ دیوان لگ گیا اور انھوں نے بدایوں کی عدالت میں گوہر صاحب پر نالش ٹھونک دی۔ شاعروں میں اس معاملے کا بڑا چرچا ہوا لیکن فیصلہ آسان نہ تھا۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ کلام غافل کا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی گم نام شاعر بڑے بڑے استادوں کا کلام چرا کر سستی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ستم ظریفی تو یہ کہ کسی کا قصیدہ چرا کر کوئی مفروضہ شاعر امیروں سے انعام وصول کر لیتا ہے اور اصلی شاعر بے چارا منھ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

محرم ہندستان میں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور اسی زمانے میں نئے مرثیے سننے میں آتے ہیں۔ اودھ اخبار اس تیوہار کا

---

[1] ۲۲ نومبر ۱۸۷۵ء

بیان ان الفاظ میں کرتا ہی: "چہلم کا چل چلاؤ ہی۔ شام کے وقت نواب ممتاز الدولہ کا تعزیہ نہایت تزک و احتشام سے کربلا پہنچا۔ لوگوں کی وہ بھیڑ تھی کہ تل رکھنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ ہر طرف قمقمے روشن تھے اور رات پر دن کا دھوکا ہوتا تھا۔ ہاتھی پر ایک شاندار تعزیہ رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ گھڑ سواروں اور پولیس والوں کا مجمع تھا۔ ان کے بعد دُلدُل کا جلوس تھا جس کے ساتھ سوز خواں اور نواب صاحب کے اعزا و اقربا تھے۔ عیش باغ سے لے کر کربلا تک پالکیوں اور سواریوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ماتم کرنے والوں کے ساتھ تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ ایسا نظارہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہی"۔

اس موقع پر جو مرثیے پڑھے گئے وہ زیادہ تر دبیر مرحوم کے تھے۔ ان کا سارا کلام دو حصّوں میں شایع ہو چکا ہی۔ یہ اعلان کرتے ہوئے اودھ اخبار لکھتا ہی: "اس معجزِ سخن کی ستایش کس سے ہو سکتی ہی۔ میرزا دبیر تخیّل کے بادشاہ اور طرز کے نبی تھے۔ ان کا ہر مرثیہ اُردو شاعری کا شاہ کار ہی۔ قیامت تک ایسا شاعر پیدا نہ ہوگا اور زمانہ اس کا نام حیرت و احترام سے لیا کرے گا۔ جس طرح سحبان عربوں کو ہمیشہ کے لیے اپنی گرم گفتاری کا گرویدہ بنا گیا اسی طرح میرزا دبیر کی جادو بیانی اُردو میں یادگار رہے گی اور ہندستان کو خصوصاً لکھنؤ کو انھیں حیاتِ نو دینے پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ کون ایسا سنگ دل ہی جو اُن کے مرثیے کو پڑھ کر آنسو نہ بہائے۔ اگر عربوں کو امرا القیس اور متنبی پر ناز ہی تو ہمارے دبیر اور انیس ان سے ہیٹے نہیں۔

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ دبیر کے صاحب زادے میرزا اوج نے ان کے سب مرثیوں کو دو جلدوں میں چھاپ دیا ہے۔

شاعری میں مسلمانوں کا ذوق عشق و تصوف کی طرف جاتا ہے۔ اس قسم کے کلام کا ایک نیا نمونہ "دردِ دل" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ مصنف محمد عبدالرشید درد ہیں۔

اس مرتبہ بھی مجھے ایک نئے تذکرے کا نام لینا ہے جو لکھنؤ سے پچھلے سال شایع ہوا ہے۔ میری مُراد سخن الشعرا سے ہے جو مولوی عبدالغفور نساخ کی سوانح عمری ہے۔ اس مقالے کے ضمیمے میں بالتفصیل اس کا جائزہ لیا جائے گا۔ علمی حلقوں میں نساخ کی بڑی شہرت ہے اور اور ان کی کئی کتابیں نکل چکی ہیں۔ لکھنؤ سے حال ہی میں ان کا دیوان "اشعارِ نساخ" اور ایک نظم "شاہدِ عشرت" یہ دونوں کتابیں شایع ہوتی ہیں۔

ہندیات کے مشہور عالم مسٹر گراوز Growse تلسی داس کی رامائن کا مکمل ترجمہ کر رہے ہیں اور امید ہے کہ یہ اس سال کے آخر تک ختم ہو جائے گا۔ اس اعلان کے بعد اودھ اخبار لکھتا ہے کہ "یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔ ہندستان کا بچہ بچہ تلسی داس کا نام جانتا ہے اور ہر ہندو ان کے کلام کو شوق سے پڑھتا ہے۔ علاوہ بریں اسکولوں میں بھی رامائن کے منتخب حصے پڑھائے جاتے ہیں۔ تلسی داس کے دوہوں کی زبان پُرانی ہوگئی ہے اس لیے غیر ملکی اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اب اس ترجمے کی مدد سے وہ اس شاعر کے کمال کی داد دے سکیں گے"۔ گزشتہ جولائی کے

Indian Antiquary (انڈین انٹی کیوری) میں مسٹر گراؤز نے اس مشہور نظم کے متعلق ایک دل چسپ روایت شایع کی ہے اور اپنے ترجمے کا ایک حِصّہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں چھاپا ہے۔

یہ نہ بھولنا چاہیے کہ تلسی داس کی راماین والمیک کی رامائن سے بالکل الگ ہے، اس کی نقل یا ترجمہ نہیں ہے۔ مضمون ایک ہونے کے باوجود ان دونوں کی حیثیت قطعاً مختلف ہے۔

صوبۂ بمبئی کے ناظمِ تعلیم نے ازراہِ کرم مجھے "کبیر پد سنگرہ" کا ایک نسخہ بھیجا ہے۔ مَیں نے اپنی "تاریخِ ادبِ ہند" میں کبیر کی تصانیف کی جو فہرست دی ہے، اس میں یہ شامل نہیں ہے۔ اس کے مرتب بابا کشن داس ہیں۔ کتاب پر "پہلا حصّہ" لکھا ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرا حصّہ بھی زیرِ ترتیب ہے۔ اس میں ۲۲۳ پد اور ۲۴۴ دوہے ہیں جن میں سے کئی میں بیت عرب کے انداز پر دس دس بند ہیں۔ پدوں کو سولہ راگوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں کبیر کے مختصر حالات مرتب کے دیباچے میں درج ہیں۔

ہندستان لوٹنے کے بعد ڈاکٹر Leitner لائٹنر نے گرو تیغ بہادر اور گرو گوبند سنگھ کے "حالاتِ سفر" نامی کتاب کا ترجمہ انگریزی میں شایع کیا ہے۔ اصل کتاب بعدور کے رئیس سردار عطر سنگھ نے گرمکھی میں لکھی تھی۔ یہ سفر تو خاک بھی دل چسپ نہیں البتہ سکھ مذہب کے اصولوں پر ان سے تھوڑی سی روشنی پڑتی ہے۔ مسلمانوں سے سکھوں کو جو نفرت ہے وہ ان کی فطرت میں داخل ہے کیوں کہ وہ طبعاً جنگ جو ہیں اور ان کی خو میں بے رحمی کا پہلو ہے۔ "ست شری اکال" کے وِرد کو یہ لوگ

گنگا اشنان کی طرح متبرک تصور کرتے ہیں۔

مواعظِ حیدریہ کے نام سے مولوی غلام حیدر خاں نے کانپور سے ایک کتاب شایع کی ہے۔ ان کا طرزِ تحریر سادہ اور صاف ہے اور اس میں جو اصول بیان کیے ہیں وہ مذہب و ملّت کی قید سے آزاد ہیں اور سب کے لیے یکساں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر ۔۔ ۔۔ بُہلر کو کشمیر میں ہندی کے شاعر چند بردائی کی رزمیہ نظم "پرتھوی راج راسو" کا ایک قلمی نسخہ دست یاب ہوا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ نسخہ اُن لوگوں کو مستعار دیا جائے گا جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی نگرانی میں Bibliotheca Indica سیریز میں اس نادر کتاب کو چھاپنا چاہتے ہیں۔ ان کے علاوہ لندن میں دو نسخے اور ہیں جو حسبِ ضرورت، مقابلے کے لیے مل سکتے ہیں۔ ہندیات سے دل چسپی رکھنے والوں کی خواہش ہے کہ ایشیاٹک سوسائٹی جلد اس کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچائے اور اس کے تاریخی و لسانی پہلو پر ضروری معلومات فراہم کرے۔ اُدھر سکھوں کے "آدی گرنتھ" کے ترجمے کا کام Dr. Trump ڈاکٹر ٹرمپ نے اپنے ذمّے لیا ہے۔ اس کے آٹھ سو صفحات (مع مقدمہ) طبع ہو چکے ہیں

مسٹر Beames بمیس ایک پُرانے ہندی بھاٹ کو منظرِ عام پر لائے ہیں جس کے متعلق اب تک کم از کم یورپین تو کچھ نہ جانتے تھے۔ یہ سنہ ۱۶۵۰ء کے لگ بھگ نورپور میں رہتا تھا اور اس کے کلام کا مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۱۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ سب گیت راجہ جگت سنگھ کی تعریف میں ہیں اور ان سے اس زمانے کے حالات

پر روشنی پڑتی ہی۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہی کہ جگت سنگھ نے شاہ جہاں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔ مسٹر بمیس نے اصل گیتوں کا کچھ حصّہ ترجمہ شرح کے ساتھ شایع کیا ہی[1]۔

بمبئی کی آریہ سماج نے قدیم ویدوں کو ہندی رسمِ خط میں چھاپنے کا ارادہ ہی۔ اسی سلسلے میں "یجروید" کے اس نسخے کا ذکر کرنا ہی جو دو تین سال قبل 'بسما' کے راجا نے چھپوا دیا ہی۔ یہ دو بڑی بڑی جلدوں میں ہی اور اصل سنسکرت عبارت کے علاوہ ہندی شرح بھی دی گئی ہی۔

گجرانوالہ سے اسی قسم کی ایک کتاب اشاعت پذیر ہوتی ہی جس کا نام "وشنو سہسر نام اور ٹیکا" (وشنو کے ہزار نام مع شرح) ہی۔ سنسکرت عبارت کے ساتھ ہندی کی شرح شامل ہی۔

اب اُردو کتابوں کو ہندی میں منتقل کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہی۔ الف لیلہ کے مختلف تراجم اُردو زبان میں موجود ہیں۔ اودھ اخبار نے لکھا ہی کہ اس کا ایک ہندی ترجمہ دیوناگری رسمِ خط میں نکل رہا ہی۔ اسی طرح "گل بکاولی" اور "توتا کہانی" کے قصّوں کو "بکاولی شمن" اور "ٹک بہتری" کے نام سے ہندی میں منتقل کیا گیا ہی۔ آخر الذکر قصّے کا ترجمہ انگریزی زبان میں پادری اسمال نے کیا ہی۔

یہ شگون نیک ہی کہ ہندستان میں تاریخ نویسی کی طرف توجہ بڑھتی جاتی ہی۔ انبالہ کے وزیر اعظم خلیفہ سید محمد حسن خاں نے

---

[1] Small Journal of the A... S...ety of Bengal شمارہ ۵ ۱۸۷۴ء

اپنی ریاست کی مکمل تاریخ لکھنے کا تہیہ کیا ہے۔

ابن خلدون کی مشہور تصنیف "عنوان العبار" کا ترجمہ عربی سے اُردو میں ہو گیا ہے۔[1] سید مہدی علی حیدرآبادی نے اس کتاب کا خلاصہ اس طرح کیا ہے: "فاضل مورخ نے سب سے پہلے اس مسئلے پر بحث کی ہے کہ تاریخ میں حقیقت کی شناخت کا طریقہ کیا ہے۔ پھر اپنی کتاب کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے میں جغرافیہ اور دوسرے میں وحشی قبیلوں کا بیان ہے۔ تیسرے میں خلافت وسلطنت، چوتھے میں تمدن، پانچویں میں صنعت وحرفت اور آخری میں جملہ علوم کا ذکر ہے۔ ہر حصے میں مختلف ابواب ہیں۔ پہلے حصے کے ابتدائی باب میں انسان کی اقسام، اس کے مذاہب اور اس کی معاشرت کا حال ہے۔ پھر زمین کے مختلف حصوں، ندیوں پہاڑوں وغیرہ کا بیان ہے۔ دراصل یہ نزہت المشتاق مصنفہ علوی ادریسی حمودی کا خلاصہ ہے جو جزیرۂ سسلی کے بادشاہ ... روجر کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس وجہ سے اس میں بہت سی خامیاں رہ گئی ہیں۔ بعد ازاں ابن خلدون کی بحث کا موضوع یہ ہے کہ رنگ اور عادات پر ہوا کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ رنگ پر محض سورج کا ہی اثر نہیں ہوتا اور اس سلسلے میں وہ قطب شمالی کے باشندوں کی مثال دیتا ہے جو سورج سے بہت کم دوچار ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود رنگت کے پھیکے ہیں۔ رنگ پر غذا کے اثر کو بھی وہ تسلیم نہیں کرتا کیوں کہ چینی اور جاپانی وہی کھاتے ہیں جو ہم تاہم زرد رو ہیں۔ ابن خلدون کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے

[1] اودو ... نیاز نمبر ۱ جنوری ۱۹۶۱ء

کہ رنگ وراثت میں ملتا ہے اور نسلاً بعد نسلٍ چلتا ہے۔ یہ کوئی کلیہ نہیں کیوں کہ جو پرتگالی عرصہ دراز سے سیلون میں بس گئے اب ان کی رنگت سفید نہیں رہی۔ یہی حال امریکہ کا ہے۔ جہاں بہت سے یورپین النسل سنولا گئے۔ ان سب باتوں سے ابن خلدون نے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ ہوا انسان کے رنگ کو متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہاڑوں کی صاف ہوا میں رہنے والے میدان کے باشندوں کی بہ نسبت گورے ہوتے ہیں۔ ہمالیہ کی پہاڑیوں کا مقابلہ دوآبہ والوں سے کر لیجیے۔ ابن خلدون کا دوسرا نظریہ یہ ہے کہ جن علاقوں میں کھانے پینے کی چیزیں آسانی سے پیدا ہو جاتی ہیں وہاں کے رہنے والے زیادہ مہذب اور امن پسند ہوتے ہیں۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جن کے ملک بنجر ہوتے ہیں۔ ثابت یہ ہوا کہ مادّی دنیا پر ان چار چیزوں کا اثر فیصلہ کن ہوتا ہے: (۱) مٹّی (۲) پانی اور ہوا (۳) غذا (۴) قدرت۔

جن ملکوں کی آب و ہوا اچھی ہے وہاں کے باشندے صحت مند، مضبوط اور ذہین ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذہانت اور محنت سے بنجر زمین کو زرخیز بنا دیتے ہیں۔ یورپ کی ترقی اس نظریے کی تصدیق کرتی ہے۔ ہندستان میں قدم رکھتے وقت مسلمانوں میں جو دم خم تھا وہ یہاں بس جانے کے بعد نہ رہا اور اب ان میں اور ہندوؤں میں جسمانی اعتبار سے تمیز کرنا مشکل ہے۔ اقوام کے اطوار اور مزاج پر ان اسباب کا جو اثر ہوتا ہے اسے کوئی طاقت نہیں بدل سکتی۔ ہندستان کے عظیم الشان پہاڑوں، وسیع دریاؤں اور گھنے جنگلوں نے ہمیشہ انسان کو مرعوب کیا اور یہاں قدرت

کے جلال کے ایسے نظارے موجود تھے کہ انسان اپنے کو بے حقیقت سمجھتا رہا۔ یونان میں قدرت کا یہ طنطنہ نہ تھا، لہٰذا انسان اپنے کو بے حقیقت سمجھنے کی ضرورت محسوس نہ کرتا تھا۔ اسی طرح یورپ میں بھی قدرت کے جلال کا وہ عالم نہ تھا جو انسان کو ترقی اور تجسس کی شاہراہ پر چلنے سے روکتا۔

پرتاپ گڑھ کے پنڈت بشمبر ناتھ نے "سرابِ حیات" کے نام سے اُردو میں ایک کتاب لکھی ہے جو مشہور انگریزی اور ہندستانی مصنفوں کی مفلسی و بدنصیبی کا نوحہ ہے[1] مصنف نے نثر میں نظم کی چاشنی گھول کر ایسا لطفِ بیان پیدا کیا ہے کہ مولوی محمد حسن نور کے الفاظ میں وہ "نثر کے جانسن Samuel Johnson اور نظم کے بائرن ہیں"۔

منشی کاشی ناتھ نے "مضامین حقانیہ" کے نام سے اپنی ان تحریروں کو یک جا کر دیا ہے جو وقتاً فوقتاً امرت سر کے جریدۂ "وکیلِ ہندستان" میں شایع ہو چکی ہیں۔ یہ سب مفادِ عامہ سے متعلق ہیں۔

'نجم الامثال' کے نام سے اُردو کی کہاوتوں اور مقبول اقوال کا مجموعہ شایع ہوا ہے[2] اخبار نویس کی رائے ہے کہ "جنھیں ملک کی عام زبان سے محبت ہے ان کے لیے یہ کتاب از حد مفید ثابت ہوگی"۔

بسوا کے نواب عمر علی خاں وحشی نے "زادِ سفر وسیلۂ ظفر"

---

[1] پنجابی یکم جولائی ۱۸۷۶ء اور علی گڑھ اخبار ۱۹ ستمبر ۱۸۷۶ء

[2] علی گڑھ اخبار ۱۴ اپریل ۱۸۷۶ء۔ پوری کتاب تین حصّوں پر مشتمل ہے ابھی پہلا حصّہ چھپا ہے۔

کے نام سے ایک کتاب تحریر کی ہو۔ پنجابی[1] اس کے متعلق لکھتا ہو کہ:
"نواب صاحب جیسے مستعد حاکم ہیں ویسے ہی جیّد عالم ہیں۔ اپنا وقت وہ سیر وتفریح میں ضائع نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ رعایا کی بہبودی کے فکر میں رہتے ہیں۔ نظم و نثر میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہو۔ ان صفحات میں ان کے کلام کے جو نمونے شایع ہو چکے ہیں وہ ہمارے قول کی صداقت ثابت کرتے ہیں"۔ موصوف نے دو تین سال تک اپنی ریاست کے علاوہ سارے ملک کا دورہ کیا۔ سفرنامے میں انھوں نے شمالی ہند کے تمام بڑے شہروں کا ذکر مسجدوں اور تاریخی مقاموں کے نقشوں کے ساتھ کیا ہو۔

اب میں ہندستانی کی ان نئی مطبوعات کے نام گناتا ہوں جو میری نظر میں کسی نہ کسی حیثیت سے دل چسپ ہیں:

سرابِ عالمِ اسباب: دہلی سے شایع ہوتی ہو۔ سو صفحوں کی کتاب، بارہ ابواب اور اینگلو انڈین حضرات کے حالات پر مشتمل ہو۔ جانے آخری باب میں نیپولین بوناپارٹ کے حالات کیوں ٹانک دیے گئے ہیں۔

فسانۂ عجائب: مثنوی مولانا رومؒ کی شرح ہو۔ اس کا تعلق سرور لکھنوی کے مشہور قصے سے نہیں۔

حالات النبی: کلکتہ سے شایع ہوئی ہو۔ ضخامت تقریباً تین سو صفحات۔ کلکتہ سے مولوی محمد کامل اور منشی عبدالکریم نے مرتب کی ہو۔ حضرت آدمؑ سے لے کر آں حضرتؐ تک کے پیغمبروں

---

[1] یکم مئی ۱۸۶۶ء

کی تاریخ ہی۔

گیان پردیپ: ایک معجونِ مرکب جو کلکتہ کے پنڈت کشن چند نے ہندی میں لکھی ہی۔

لولی نامہ: دیوانِ ریختی مصنفہ احمدی۔ مسٹر ایڈورڈ بالفور نے مدراس سے شایع کی ہی۔

دیوانِ عالم: مصنفہ نواب محمد حسن خاں عالم کلکتوی۔

گل دستہ بزم آرا: اُردو نظم مصنفہ فرزند علی۔

شفاء العلیل: شاہ ولی اللہ دہلوی کے عربی رسالے 'قولِ جمیل' کا ترجمہ۔

ابرِ کرم: عشقِ الٰہی سے متعلق روایتوں کی مثنوی۔ کان پور سے شایع ہوئی ہی۔

بابِ نصیحت: بابو رام سروپ کی اخلاقی نظموں کا مجموعہ سہارن پور سے شایع ہوا ہی۔

رتناولی ناٹک: ہرش دیو کے سنسکرت ڈرامے کا ہندستانی ترجمہ از پنڈت دیودت الہ آبادی۔

مہابھارت: ہندی نثر میں نیا ترجمہ از کرشن چندر دھرما دھکاری بنارسی۔ تین جلدیں کلکتہ سے شایع ہوئی ہیں۔

پریم امرت: دکن کے ہندو مصلح رامانج کی زندگی کا ڈراما جس کا ہندی ترجمہ بدری داس نے کیا ہی۔

سخاوت نامہ: منظوم فسانہ مصنفہ شاہ رحمان مطبوعہ کان پور۔

تصویرِ غم: نظمِ حکیم اشرف علی حسنت۔

تذکیر الالیوان: عمارت سازی پر منظوم کتاب از ریاست علی۔

سیا سو یمبر سوانگ: یہ ناٹک ناتھ سنگھ کا لکھا ہوا ہے۔

ست سئی سار: بہاری کے دوہوں کا خلاصہ ہندی نظم میں از چوبے رادھا کشن۔

نقلِ مجلس: از محمد عاشق علی لکھنوی۔

مقاصد الزائرین: از ارشاد اللہ۔ کربلا اور عرب کی زیارت کے متعلق۔

معراج المضامین: شیعہ مذہب کے بارہ اماموں کے حالات۔ از اسمٰعیل حسین۔

گل دستۂ خنداں: منشی منور علی کی نظموں کا مجموعہ۔

گلشنِ عشق: شاہ زادہ ماہ لقا اور شاہ زادی محسن آرا کے عشق کی داستان۔ از خواجہ بادشاہ صغیر۔ اسی نام کی کئی اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

منتخب التواریخ: فارسی کتاب کا ترجمہ جو ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ از احتشام الدین۔

تحفۃ العوام: از حاجی حسن علی۔ دوسرا ایڈیشن ہے۔

طلسمِ فصاحت: نظم از محمد حسین جاہ۔

مفید الانشا: از پنڈت شو نارائن۔ مطبوعہ لکھنؤ۔

گل دستۂ تعشق: حسین تعشق کا دیوان۔

دائرۂ علوم طبعیات: بنارس کالج کے پروفیسر لکشمی نارائن کی تصنیف ہے۔ مولوی سید احمد خاں کی فرمایش پر یہ تقریریں کی گئی تھیں اور اخبار پنجابی نے لکھا ہے کہ انگریزی کی بڑی بڑی کتابوں کو سامنے رکھ کر انھیں تیار کیا گیا ہے۔

فیض نشان: میرزا والا جاہ عاشق کی غزلوں کا مجموعہ جو لکھنؤ میں چھپا ہے۔

بہارِ اسرارِ حقیقت: تصوف پر ایک رسالہ ہے۔

گلشنِ فیض: از غلام محمد خاں۔

گنجِ تواریخ: اُردو اور فارسی۔ از عبدالغفور خاں۔

استری درپن: عورتوں کے لیے نصیحت کی کتاب۔ از پنڈت مادھو پرشاد۔

کوی کلا پتر: ہندی انشا کا رسالہ۔ از چنتا منو۔

شمسِ فیض: شاہزادہ شاہ رُخ اور شاہزادی ماہ رُخ کی محبت کی داستان از غلام محمد خاں۔ صفحات ۲۳۶

سنگرہ سرومنی: علمِ نجوم پر ہندی میں تفصیلی بحث۔ از پنڈت سوربہ پرشاد۔ صفحات ۵۳۶

اندرجال: گنڈا تعویذ، جادو ٹونا وغیرہ کا بیان۔ از میر حسن مطبوعہ دہلی۔ صفحات ۳۰۴

سامودرک ریکھا: فراست الید پر ہندی میں کتاب۔

تحفۂ طلسمات: از عبدالرسول خاں۔

علمِ طب: از قاضی الٰہی بخش امرت سری۔ اس میں غذا و ہوا، حرکت و آرام وغیرہ پر سیر حاصل بحث ہے۔

تبیین الصنائع: از مولوی محمد الدین۔

معدن الحکمت: اُردو اور انگریزی میں پانچ سو صفحات کا طویل رسالہ ہے جس میں اصطلاحات پر ایک ضمیمہ بھی شامل ہے۔

سید غلام حسین نے شایع کیا ہے۔

تہذیب احسانی: از حکیم احسان علی۔

مفردات رزاقی: فارسی کتاب مفرداتِ نصیری کا اُردو ترجمہ۔ از حبیب الدین۔

جغرافیۂ طبعی: مدرسۃ العلوم مسلمانان کے لیے منشی محمد ذکاء اللہ نے لکھی ہے۔ اودھ اخبار نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے مصنف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے فرانسیسی ٹیلر صاحب کی مدد سے میرے ایک مقالے "اُردو شاعری کے تذکرے" کا ترجمہ ہندستانی میں کیا ہے۔

قصصِ ہند: ہندی مسلمانوں کی تاریخ کے چیدہ واقعات، لاہور سے طبع ہوئی۔ حجم ۱۸۰ صفحات۔

واقعاتِ ہند: ہندستان کی مکمل تاریخ۔ لاہور سے طبع ہوئی۔ حجم ۱۸۰ صفحات۔

کتاب السعادت: اخلاقی رسالہ مصنف محمد اکرام الدین دہلوی۔

بڑھاپا نامہ: از نظیر اکبر آبادی۔ دلّی میں طبع شدہ۔

قصۂ حقیقت رائے: از آگرہ سنگھ۔ ہندی کی اس عجیب وغریب پوتھی میں مسلمانوں کے مفروضہ مظالم کا ذکر ہے۔

جلوۂ توحید: بھگوت گیتا کا خلاصہ۔

کشف الحجاب: نظام الدین صاحب نے پردہ نشینی کے آداب بیان کیے ہیں۔ مدراس میں چھپی ہے۔

بحر الحقیقت: مذہبی نظم ہے۔ کان پور سے شایع ہوئی ہے۔

دیوانِ نیاز: شاہ نیاز احمد کا مجموعۂ کلام جو کان پور سے شایع ہوا ہی۔

تواریخ امریکہ: لکشمی داس صاحب کی تالیف جو دلّی کی ادبی انجمن کے زیرِ اہتمام شایع ہوئی ہی۔ پہلی جلد میں ڈھائی سو صفحات ہیں جن میں ابتدا سے لے کر کولمبس کی دریافت تک کے حالات قلم بند ہیں۔

لاہور سے حسبِ ذیل کتابوں کے ہندی و اُردو تراجم کی اشاعت کا اعلان ہوا ہی:

Brain's Mental Science

Fowel's Logic

Taylor's Ancient History

Huxley's Physiology

اُردو اخباروں میں شعر و شاعری کے چٹخارے میں کمی نہیں ہوئی۔ اودھ اخبار نے منشی محمد کا کلام چھاپا ہی۔ یہ صاحب "اللہ یار" تخلص کرتے ہیں اور آج تک کسی نے ایسا عجیب و غریب تخلص نہیں رکھا۔ اسی جریدے میں واجد علی شاہ کی دو غزلیں شایع ہوئی ہیں اور انھیں 'بے نظیر' و 'جادو رقم' کا لقب دیا گیا ہی۔ علاوہ برایں منشی غلام محمد خاں 'حریت' دہلوی، بھگوان دیال عاقل، منشی سید امیر علی مشہدی اور فرماں روائے رام پور المتخلص بہ نواب کا کلام وقتاً فوقتاً اشاعت پزیر ہوا کرتا ہی۔ پنجابی میں بھی حقۂ نظم نمایاں ہوتا ہی۔ محمد حسن نے اس کے لیے انگریزی کی کئی

نظموں کے ترجمے کیے ہیں۔

خیرآباد سے ریاض الاخبار نکلتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس کے ایڈیٹر نے اعلان کیا ہے کہ گل کدۂ ریاض کے نام سے دورِ حاضر کی بہترین غزلوں کا انتخاب کیا جا رہا ہے۔ حکومتِ پنجاب کے اہتمام سے لاہور میں جو مشاعرے ہوا کرتے ہیں، ان کا تذکرہ اس سال کے اخباروں میں نہیں آیا۔ البتہ دہلی، کلکتہ اور دوسرے بڑے شہروں میں ان کی گہما گہمی برابر جاری ہے۔ انھی مجلسوں میں 'نساخ'، کو ان استاذوں سے ملنے کا موقع ملا جن کا تذکرہ اس نے 'سخنِ شعرا' میں کیا ہے۔ تاج الاخبار کا بیان ہے کہ رام پور میں ہر مہینے کی چودھویں کو مشاعرہ ہوا کرتا ہے۔ جولائی کی مجلس میں مقتدر شعرا کے علاوہ حکام و امرا بھی موجود تھے۔ سب سے پہلے والیِ ریاست اور بعد ازآں منشی امیر احمد کی غزلیں پڑھی گئیں۔ آدھی رات تک شمع گردش کرتی رہی اور وداعی توپ دغنے کے بعد بزم منتشر ہوئی۔

طبعِ ثانی کے باب میں سب سے پہلے سید احمد خاں کی 'آثار الصنادید' کا نام آتا ہے۔ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۴ء میں دلی سے اس کے دو ایڈیشن چھپ کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ اس مرتبہ یہ اودھ اخبار پریس لکھنؤ سے نکلی ہے۔ شاہ تراب کی کلیات بھی دوبارہ طبع ہوئی ہے جس میں ان کے دیوان کے علاوہ ایک مثنوی اور بہت سی ٹھمریاں شامل ہیں۔ تلسی داس کی راماین کا نیا ایڈیشن 'رام بلاس'، کے نام سے نکلا ہے۔

لاہور سے بھاٹوں اور میراثیوں کے گیتوں کا چھوٹا سا مجموعہ شائع

ہوا ہی۔ یہ گیت بیاہ اور تیوہاروں کے موقع پر گائے جاتے ہیں اور اپنے ملک کے ادبِ عامہ کا حصّہ سمجھنا چاہیے۔ اسی شہر کے مشہور عالم لالہ بہاری لال نے 'ست سبھا' کے لیے بہت سے بھجن لکھے ہیں۔ ان کے مجموعے میں مغربی بدعتوں کے خلاف کتنے عام فہم گیت بھی نتھی کر دیے گئے ہیں۔

مذہبی کتابوں کی بھرمار کا وہی حال ہی اور اس میں کسی خاص مذہب کی قید نہیں ہی۔ اس سلسلے میں میں صرف مخصوص کتابوں کا خاکہ دیا کرتا ہوں اور نئے ایڈیشنوں کا تو ذکر ہی نہیں کرتا۔ لیکن بے انصافی ہوگی اگر انجیل کے اس اُردو ترجمے کا نام نہ لیا جائے جو لندن سے شایع ہوا ہی۔ یہ کام پادری میتھر Mather نے کیا ہی جو میرزاپور سے 'رفیقِ ہند' نامی اُردو اخبار نکالتے تھے۔ اس ایڈیشن کی خوبی یہ ہی کہ مشکل حصّوں کو سمجھانے کے لیے جا بہ جا نوٹ دیے گئے ہیں۔ ہر باب کے شروع میں دیباچہ ہی جس میں بحث طلب مسائل کی تشریح کی گئی ہی۔ اُردو صحیح اور صاف ہی۔

منشی شجاعت علی نے 'عیسائی ادعیہ' کے نام سے ایک منظوم کتاب شایع کی ہی۔ پادری بنرجی نامی نو عیسائی عالم نے Aryan Witness[1] کے عنوان سے ایک دل چسپ کتاب لکھی ہی جس میں انجیل کی تائید میں ہندو شاستروں سے سند پیش کی گئی ہی۔ رِگ وید سے انھوں نے 'یہودا' کا نام ڈھونڈ نکالا ہی۔ اور میری پیروی میں کشن بھگوان اور حضرت عیسیٰؑ کے حالات

---

[1] مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۵ء

میں مشابہت دکھلائی ہو اگر کوئی فرق ہو تو وہ مشرقی مبالغہ آرائی نے پیدا کیا ہو۔ یہی نہیں بلکہ بنیر جی نے 'نارد تیغ راتر' نامی کتاب کی تاویل یہ کی ہو کہ نارد مُنی ولایت کی سیر کرنے گئے تھے اور عیسیٰؑ کو 'ہری' کا نام دے دیا۔ ورنہ دونوں کی صفات اور شخصیت میں کوئی فرق نہیں۔

مسلمانوں کی مذہبی مطبوعات میں سے حسبِ ذیل اہم ہیں:۔

تفسیرِ قرآن: بمبئی سے مولوی محمد سلیم نے شایع کی ہو۔

زینت القاری: قرأت کے قواعد جو محمد عنایت احمد نے مرتب کیے ہیں۔ بمبئی میں طبع ہوئی۔

راہِ ایمان: از مولوی محمد جعفر۔ مدراس سے شایع ہوئی۔

اخبارِ ماتم: از محمد حسین۔ معرکۂ کربلا کی تاریخ۔ حجم ۱۲۶۶ صفحات۔

تحریر الشہادتین: حالاتِ کربلا۔ از حکیم ناصر علی۔ مطبوعہ لکھنؤ۔

معراج نامہ: از حاجی قمر الدین۔ یہ نظم لکھنؤ میں چھپی ہو۔

کحل البصر: ولادتِ نبویؐ کا منظوم بیان۔ از محمد عاشق علی تنّا۔

حدیقۃ الاولیا: از غلام سرور لاہوری۔ اس میں دہلی اور پنجاب کے مقتدر علما و اولیا کے حالات کے علاوہ نقش بندی، چشتی وغیرہ سلسلوں کا بھی ذکر ہو۔

قصۂ حلیمہ صادقہ: حلیمہ دائی کا ذکرِ مسعود۔

بہت سے مسلمان عیسائیوں کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا معیوب سمجھتے ہیں۔ لیکن سمجھدار لوگ اسے بُرا نہیں سمجھتے۔ ان میں سے ایک یعنی خان احمد شاہ نے 'اظہارِ حق' کے نام سے

ایک بصیرت افروز رسالہ شایع کیا ہی۔

عام طور پر میں ابتدائی کتابوں کے ذکر سے پرہیز کرتا ہوں۔ اس مرتبہ میں اس قاعدے کو توڑنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ میرا یہ اعتقاد ہی کہ بنگال میں ہندستانی کا اتنا ہی چلن ہی جتنا انگریزی یا بنگالی کا۔ اس کے ثبوت میں دو کتابوں کا نام لیا جا سکتا ہی جو حال ہی میں شایع ہوئی ہیں۔ ایک تو واکیارنب (محاوروں کا سمندر) جو بہ یک وقت انگریزی، بنگالی اور اردو میں شایع ہوتی ہی۔ آنند چند مکرجی نے اس کتابچے میں مقبولِ عام محاوروں کو یک جا کر دیا ہی۔ دوسرے 'پنیہ کھیتر پرب' (مقدس مقامات) نامی رسالہ جسے چندسین داس نے ہندی، بنگالی اور انگریزی میں شایع کیا ہی۔

مفیدِ عام۔ انگریزی زبان کی نہایت عمدہ گرامر ہی جسے نامور مصنّف محمد نصرت علی نے قلم بند کیا ہی۔ حجم ۱۳۲ صفحات۔ طبع شدہ دہلی ۱۸۷۳ء۔

چھند اور پنگل۔ ہندی عروض پر ایک رسالہ جسے بہاری لال نے لکھا ہی۔

رشحاتِ صغیر۔ صرف و نحو اور اردو زبان پر صغیر بلگرامی کا رسالہ۔

مصدرِ فیوض۔ اردو میں فارسی گرامر پر رسالہ۔ مؤلفہ نظیر الدین لاہوری۔

احسن القواعد۔ یہ بھی فارسی زبان کی گرامر ہی لیکن اوّل الذکر سے کہیں زیادہ مفصّل اور قابلِ قدر ہی۔ بریلی کے مولوی نجف علی نے تالیف کی ہی۔

قاعدۂ اُردو۔ ہندستانی کی گرامر جو شمس الدین صاحب نے لکھی اور لاہور سے شایع ہوئی۔

فرانسیسی ہندستانی کی پہلی کتاب Petit Manuel Francais-Hindostani ڈاکٹر اورلک Aurilac نے لکھی ہی۔ حجم ۱۱۹ صفحات۔

پچھلے سال میں نے ڈاکٹر فیلن کی عظیم الشان ہندستانی ڈکشنری کے پہلے حصّے کے چھپنے کی اطلاع دی تھی۔ اُردو اخباروں نے اس کی ازحد تعریف کی ہی[1]۔ آج مجھے یہ اعلان کرتے انتہائی مسرت ہوتی ہی کہ اس کے تین مزید حصّے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ پہلے حصّے کا دوسرا ایڈیشن بھی خفیف سی ترمیم کے ساتھ شایع ہوا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ قابل عالم ہمہ تن اپنے کام میں مصروف ہی۔ مجھے امید ہی کہ ان کی محنت بہت جلد ٹھکانے لگے گی۔

میری امید اس ہندستانی انگریزی ڈکشنری سے بھی وابستہ ہی جسے میرے عزیز اور لائق شاگرد موسے M. F. Deloncle تیار کر رہے ہیں۔ مَیں ان کے کام کی نگرانی کر رہا ہوں اور انھیں کئی اچھے لوگوں کی سرپرستی حاصل ہی۔

مَیں نے پادری کیلاگ (Kellogg) کی ہندی گرامر کی تکمیل کا اعلان کیا تھا۔ اب وہ چھپ چکی ہی اور مصنّف نے اس کا ایک نسخہ مجھے بھیجا ہی۔ یہ صرف اودھی ہی نہیں بلکہ مارواڑی، گھیل کھنڈی، بھوجپوری وغیرہ ہندی بولیوں کی مجمل گرامر ہی۔ یہ ایک عالمانہ کارنامہ ہی جس میں ان بولیوں کے باریک سے باریک فرق کو وضاحت

---

[1] مثلاً اودھ اخبار ۲۰ اگست ۱۸۷۶ء

سے بتائے گئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی بنیادی یگانگت بھی ثابت کی گئی ہے۔ کیوں کہ مثالیں عام طور پر نظم میں ہیں اس لیے کتاب کا ایک حصّہ ہندی عروض کے لیے وقف ہے۔ اسے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت بحر کا تعین یونانی یا لاطینی کی طرح 'رکن تہجی' کرتا ہے عربی، فارسی یا اُردو کی طرح حروف کی گنتی سے کام نہیں چلتا۔

لچھمن سنگھ نے شکنتلا ناٹک کا جو ہندی ترجمہ چھاپا ہے اس کا جدید ایڈیشن مسٹر Frederic Pencott نے تیار کیا ہے۔ اس میں نہایت مفید نوٹ دیے ہوئے ہیں۔ میں نے فرانسیسی میں ہندو اساطیر پر جو کتاب لکھی تھی اس میں بھی مہا بھارت سے شکنتلا کا حصّہ نقل کیا گیا ہے اور اس پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔

سنا ہے کہ پادری Hoernle نے پوربی ہندی پر جو گرامر لکھی ہے وہ جلد شایع ہو جائے گی۔ اس میں پورب کی سب ہندی بولیوں کا ذکر آ جائے گا۔ اس طرح اس ہندی کی مختلف شکلیں اُجاگر ہو جائیں گی جسے آج اُردو کے مقابل لانے کی کوشش زور شور سے ہو رہی ہے۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں کیوں کہ فرانس تک میں بعض لوگ پرانی بولیوں کو جن کی شکل دس کوس چل کر بدل جاتی ہے، ہماری اس خوب صورت فرانسیسی زبان پر ترجیح دیتے ہیں جو درباروں اور ادبی محفلوں میں سنور نکھر چکی ہے۔

پچھلے سال میں نے مسٹر گرانٹ ڈف کے سفر نامۂ ہند کا چرچا کیا تھا۔ اب یہ Notes of an Indian Journey (ہندستانی سفر کی یادداشت) کے نام سے شایع ہو گیا ہے۔ اس صاحبِ نظر مصنف

سے ہم نے جو توقعات وابستہ کی تھیں، وہ سب پوری ہوئیں۔

مرحوم J.W. Brooks نے نیل گری کے قبیلوں اور قدیم عمارتوں پر جو شان دار کتاب لکھی تھی وہ ان کی بیوہ کی توجہ سے شایع ہو گئی ہے اور اسے کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں کئی خوب صورت فوٹو بھی دیے گئے ہیں۔

صوبۂ سرحد میں مختلف بولیوں کا چلن ہے۔ حکومتِ ہند کے کارپردازوں کو وہاں بات سمجھنے سمجھانے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اس مصیبت سے بچنے کے لیے ایک انگریز افسر نے وہ سب ضروری الفاظ اور محاورے جمع کر دیے ہیں جن کی عام طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کتابچہ انگریزی کے علاوہ فارسی، پشتو اور اُردو میں چھاپا گیا ہے۔ اودھ اخبار نے اس کی تعریف کی ہے[1]۔

(۳)

یہ اقتباس اخبار پنجابی کا ہے[2]: ابھی تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے کہ ہندستان کو 'جاہلوں کا ملک' کہا جاتا تھا گو کہ یہ کبھی علوم وفنون کا گہوارہ تھا۔ جب سے اخباروں کی اشاعت شروع ہوئی ہے ہمارے موجودہ حالات پر روشنی پڑنے لگی ہے۔ یہ سچ ہے کہ پرانی عظمت کے مقابلے میں ہماری حالت پست ہے لیکن گزشتہ قرون سے ہمارے یہ روز وسال بہ ہر حال بہتر ہیں۔ اخباروں نے ملک میں علم کی جو ہلکی ہلکی روشنی پھیلا دی ہے اس نے جہالت کے اندھیرے

---

[1] ۳۰ جنوری ۱۸۷۶ء

[2] ۷ جون ۱۸۷۶ء

کو دُور کر دیا ہے۔ لوگوں میں سائنس اور تہذیب کی خواہش عام ہوتی جاتی ہے۔
آج اس ملک میں انگریزی، اُردو، فارسی، عربی[1] سبھی زبانوں کے اخبار نکلتے ہیں۔ ان کے ساتھ تعلیمِ عامّہ کا چرچا بڑھتا جاتا ہے۔ اگر ترقی کی یہی رفتار رہی تو کسی دن ہندستان جاہلوں کا نہیں بلکہ عالموں کا ملک کہلائے گا۔ سچ پوچھیے تو اخبار بہت بڑی نعمت ہے۔ اسی کے توسط سے نئی نئی ایجادات اور ملک ملک کی معلومات عوام تک پہنچتی ہیں۔ سیاسی اور سماجی مسائل پر غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ دنیا کے خیالات کی رَو معلوم ہوتی ہے۔ پردیسیوں کے وہ حالات جنھیں معلوم کرنے کے لیے تا عمر کتب بینی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اخبار پر نظر ڈالتے ہی آئینے کی طرح سامنے آجاتے ہیں۔ اخبار ایک طرف تو حکومت کے مشیر ہوتے ہیں اور دوسری طرف عوام کے ہادی اور مصلح۔ اس ملک میں ایسا امن چین ہے کہ اخباروں کو ہر مسئلے پر آزادی سے بحث کرنے کی اجازت ہے۔ اخبار کے بغیر ملک کو بے زبان سمجھو۔ وہاں لوگوں میں طرح طرح کی افواہیں اُڑتی اور بدامنی کی آگ بھڑکاتی ہیں۔ اخبار کے وسیلے سے ایک طرف تو حکومت پر رعایا کا منشا عیاں ہوتا ہے اور دوسری طرف رعایا حکومت کی خواہش سے باخبر رہتی ہے۔ لہٰذا پریس سب کے لیے یکساں اہم ہے...

علی گڑھ اخبار[2] نے بنگال کے گورنر Sir Richard Temple کو بہت سراہا ہے کہ انھوں نے ہندستانی اخباروں سے مہربانی کا

---

[1] ہندستان سے عربی کا صرف ایک جریدہ شایع ہوتا ہے۔ یہ لاہور کا مفیدِ عام ہے۔ شامی صحیفہ نگار حسن نے لندن سے ایک اخبار مراۃ الاحوال حال ہی میں نکالا ہے۔
[2] ۲۵ فروری ۱۸۷۶ء

سلوک کیا۔ اس نے لکھا ہے کہ نیک نیت اور بدنیت نقادوں میں تمیز ہونی چاہیے: "حکومت کو نیک نیت مبصروں کا احسان مند ہونا چاہیے کیوں کہ وہ آزاد خیالی اور ایمان داری سے جو کچھ کہتے ہیں وہ توجہ کا مستحق ہے بلکہ بدنیت لوگ بھی کبھی کبھی کام کی رائے دیتے ہیں۔ یوں کہیے کہ ہر قسم کی تنقید قابلِ غور ہے۔ بنگال کے گورنر اس نکتے کو سمجھتے ہیں۔ اگر اخبار ہمیشہ حکومت کا دم بھرتے رہیں تو ان میں اور مصاحبوں میں کوئی فرق نہ رہے۔ اس صورت میں نہ رعایا کو ان پر بھروسا ہوگا اور نہ وہ ایمان داری سے اپنا فرض پورا کر سکیں گے۔ البتہ اگر وہ غیر جانب دار رہیں اور کسی وقت حکومت کی کسی کارگزاری کی تائید کریں تو ان کی رائے میں اثر ہوگا۔ گورنر بنگال کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہوگی کہ اہلِ ہند حکومتِ برطانیہ کو پسند کرتے ہیں اور اسے دوسری مغربی حکومتوں خصوصاً حکومتِ روس پر ترجیح دیتے ہیں جو ہندستان کی جانب اپنا اثر پھیلا رہی ہے۔ اس اثر کی وجہ سے ہندستان میں جو گھبراہٹ پھیلی ہوتی ہے وہ گویا راجا اور پرجا کے باہمی اخلاص کی دلیل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ برطانیہ کا رویّہ روادارانہ ہے اور اس کے سائے میں ہم رُوحانی، ذہنی اور مادّی ترقی کر سکیں گے۔"

لگ بھگ چالیس سال سے ہندستان میں اخبار نکلتے ہیں۔ اب تو ان کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ (اخباری زبان میں) ہر گلی کوچے اور گھر گھر میں ان کے شائق موجود ہیں۔

پنجابی کا بیان ہے[1] کہ ہندستانی اخباروں کی تعداد میں روز افزوں

---

[1] ۱۲ مئی ۱۸۷۶ء

ترقی ہو رہی ہی۔ اسے اس کا افسوس ہی کہ حکومت پریس پر پابندی لگا رہی ہی اور اپنے عہدے داروں کو مضمون نگاری سے روکتی ہی۔ اس اخبار کا خیال ہی کہ انگریزی جریدوں کے پاس خبر حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں لیکن ہندستانی اخباروں کے محدود وسیلوں کو اور بھی مختصر کرنا نامناسب ہی۔ اگر حکومت کو یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے انتظام کے متعلق رعایا کیا خیال رکھتی ہی تو اس سے اس کا سراسر فائدہ ہی۔ لیکن اگر پریس آزاد نہ ہو تو یہ کیوں کر ممکن ہی؟ امید ہی کہ عرصے سے ملکی پریس کو جو مراعات حاصل تھیں اب وہ منسوخ نہ کی جائیں گی۔

جامِ جمشید کو شکایت ہی[1] کہ انگریزی کے اخبار اپنے ہندستانی ہم عصروں کو خاطر میں بھی نہیں لاتے۔ "اپنے زُعم میں وہ اپنے کو عوام کا فیاض گردانتے ہیں اور ہمیں نرِ فضول سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمیں ان کے طعن و طنز کی مطلق پرواہ نہیں۔ اب ہم جہالت اور کاہلی کی گرد جھاڑ چکے ہیں اور بے دھڑک دن کو دن اور رات کو رات کہتے ہیں۔ ہم لوگوں پر یہ جھوٹا الزام ہی کہ حکومت کے مخالف راجاؤں سے رُپے لے کر ان کی حمایت کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ نہ تو یہ راجا اخبار پڑھتے ہیں اور نہ ان کی قدر و قیمت سے واقف ہیں۔ سچ تو یہ ہی کہ ہندستانی اخبار انگریزی جریدوں سے کسی طرح کم ایمان دار نہیں۔ فرق یہ ہی کہ ہم میں اتنی آزاد خیالی نہیں۔ دونوں میں تیز اور کُند تلوار کا فرق ہی۔ بے چارے دیسی راجا تو انگریزی اخباروں سے جتنا ڈرتے ہیں اتنا بڑے لاٹ صاحب سے بھی نہیں۔ اگر ان کے

---

[1] منقول از علی گڑھ اخبار بابت ۱۰ مارچ ۱۸۶۶ء

اعتراضوں کا جواب وہ دیسی پریس کے توسط سے دینا چاہیں تو اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ اب وہ زمانہ بیت گیا جب بڑے لاٹ راجاؤں سے کہتے تھے کہ میں کان پکڑ کر تمھیں تخت سے اُتار دوں گا۔ لیکن انگریزی اخباروں کو پہلے سے ان کا حالِ دل معلوم ہوتا ہے اور وہ راجاؤں کو ڈرا دھمکا سکتے ہیں۔ ان کی دھمکی بے اثر بھی نہیں ہوتی۔ ہندستانی اخبار صرف ان دھمکیوں کا جواب دیتے ہیں..... بہرحال انگریزی کے اخباروں کو ہم سے بھائی چارا برتنا چاہیے اور کشاکش چھوڑ کر ہم سے اتحاد پیدا کرنا چاہیے۔ ورنہ تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق ہم بھی انھیں ترکی بہ ترکی جواب دینے پر مجبور ہوں گے"۔

اودھ اخبار کی رائے ہے کہ ہندستان میں مختلف قسم کے اخبار ہیں۔ ایک تو انگریزی جو ہر مغربی خیال اور مصلحت کی تائید کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔ دوسرے ہندستانی زبانوں کے اخبار۔ ان سب کا ایک مقصد ہے یعنی وطن کی محبت اور غریب دیس بھائیوں کی اصلاح اور بہتری کا جذبہ۔ حکومت کے بہی خواہ ہوتے ہوئے بھی وہ آزادی سے ہر بے انصافی کی مخالفت کرتے ہیں۔ گو کہ پریس کی آزادی اب بھی محدود ہے لیکن خدا کرے کہ یہ باقی رہے اور اس پر کسی قسم کی آنچ نہ آئے۔ ہندستانی ایڈیٹر — خواہ وہ اُردو صحیفوں کے مدیر ہوں یا انگریزی فارسی وغیرہ کے — ملک کے ساتھ حکومتِ وقت کی بھی عزت کرتے ہیں اور ان کی پوری پوری مدد کرتے ہیں۔ اس کے برعکس انگریزی اخباروں کے اکثر مضمون نگار

له ۱۵ مئی ۱۸۶۹ء

یورپین ہیں اور اس ملک سے برائے نام دلچسپی لیتے ہیں۔ جب کبھی وہ ملکی امور پر خیال آرائی فرماتے ہیں فاش غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری برادری کے اخبار صحتِ خیال پر اس قدر زور دیتے ہیں۔ انگریزی کے اخبار محض رشک وحسد کی وجہ سے ہماری آزادی کے مخالف ہیں اور ہم پر پابندیاں لگانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ شکر ہے کہ حکومت نے اب تک ان کے کہے پر کان نہ دیا اور بمبئی ٹائمس نے ہمیں دلاسا دیا ہے کہ پریس کی آزادی باقی رہے گی۔

علی گڑھ اخبار اسی سلسلے میں لکھتا ہے[1]: "کچھ عرصے سے ہماری اخباری برادری ہراساں ہے کہ کہیں اس پر نئی پابندیاں نہ عائد کی جائیں۔ اسے ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ زبان بندی کر دی جائے اور حکومت پر نکتہ چینی کرنے کا اختیار چھین لیا جائے۔ اس ضمن میں حکّام کی خاموشی نے اور بھی گھبراہٹ پھیلا دی ہے۔ کہتے ہیں کہ وزیرِ ہند ہندستانی اخباروں کی زبان درازی پر سخت خفا ہیں اور ان کے کارپرداز سمجھاتے ہیں کہ اگر ہمارا منھ بند کر دیا جائے تو ہندستان ان کے لیے جنّت نظیر ہو جائے۔ ہم ان کے رویّے کی جتنی مخالفت کرتے ہیں وہ اتنے ہی چراغ پا ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے بعض ہم عصر تو یہ بھی کہ گزرتے ہیں کہ حکومت سارے ملک میں تاریکی پھیلانے کے درپے ہے۔ لیکن ہم ان سے متفق نہیں۔ یہ الزام بے بنیاد ہے ورنہ ہم سب سے پہلے اس کے

---

[1] ۱۲ مئی ۱۸۷۵ء

خلاف آواز اٹھاتے بلکہ اس سینسر کی بھی مخالفت کرتے جو ہماری آزادی کے لیے خطرہ پیدا کر رہا ہی۔ اگر اخباروں کو آزادی کی نعمت سے محروم کر دیا جائے تو وہ ملک کی کوئی خدمت نہ کر سکیں گے۔ اگر ہندستان میں اخبار باقی نہ رہیں تو گورمنٹ من مانی حکومت کرنے لگے گی اور کوئی کچھ نہ کہ سکے گا۔ کیا انگریز اس قسم کی پابندیوں کو پسند کریں گے اور ان کا طوق ہماری گردن میں ڈال کر خوش ہوں گے؟ ہمیں تو اب بھی یقین ہی کہ ایسا اندھیر نہ ہوگا اور پریس اپنی آزادی سے محروم نہ کیا جائے گا۔"

ان سب باتوں کے باوجود حکومت دراصل ملکی اخباروں پر تھوڑی سی پابندی عائد کرنا چاہتی ہی۔ کیوں کہ یہ ماننا پڑتا ہی کہ کبھی کبھی وہ آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں[۱]

کشمیر میں بھی پریس آزاد ہی۔ اس کا اقرار ریاست کے وزیرِ اعظم نے ایک نمایندے سے کیا جسے تحفۂ کشمیر کے کسی مضمون سے شکایت تھی[۲]

مسٹر لائٹنر Leitner کے اس خیال سے ہمیں کامل اتفاق ہی کہ "اگر مشرق میں اخبار بینی عام ہو جائے اور ریلوں کا جال بچھ جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ از سرِ نو اپنے کھوئے ہوئے مرتبے کو دوبارہ حاصل نہ کر لے۔ یہ شرط ضرور ہی کہ وہ مغرب کی کورانہ تقلید نہ کرے۔"

---

[۱] Indian Mail ۲۵ ستمبر ۱۸۷۶ء

[۲] علی گڑھ اخبار ۵ نومبر ۱۸۷۵ء

نئے ہندستانی اخباروں کی فہرست ذیل میں درج کرتا ہوں:

آئینۂ طبابت: طبی رسالہ جو اُردو اور انگریزی میں زیرِ ادارت شیخ امام الدین اکبرآبادی شائع ہوتا ہے۔

اشرف الاخبار: دلّی کا سیاسی جریدہ۔

بحرِ حکمت: طبی ماہ نامہ۔ زیرِ ادارت ڈاکٹر رحیم خاں لاہوری۔

بمبئی گزٹ

قاصدِ پٹنہ

فرحت الاحباب: بمبئی کا ہفتے وار اخبار جسے منشی محمدالدین نے نکالا ہے۔

گنجینۂ قوانینِ ہند: ماہانہ رسالہ جو آئین و قوانین کے لیے وقف ہے۔ لاہور سے نکلتا ہے۔

گنجینۂ نظائر: یہ انڈین لا رپوٹ کا اُردو ایڈیشن ہے۔ لاہور سے نکلتا ہے۔

گل دستۂ شعرا: اُردو نظم کا انتخاب جو ہر مہینے لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔

ہندو بندھو: اس مذہبی رسالے کو لاہور کے پنڈت شونارائن ہندی اور اُردو میں نکالتے ہیں۔

جبل پور سماچار: یہ ماہ نامہ ہندی اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔

گیان پرکاش: پونہ کا ہندی اخبار۔

جامع الاحکام: یہ 'ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن' کا آرگن ہے جو لکھنؤ سے مہینے میں دو بار شائع ہوتا ہے۔

کایستھ دھرم پرکاش: اس میں کایستھوں کی دھرم سبھا کے احکام مہینے بھر میں دو مرتبہ شائع ہوتے ہیں۔

منبع الاحکام: اس ماہ نامے میں ہائی کورٹ کے فیصلے درج ہوتے ہیں۔

مریاداپری پاٹی سماچار: آگرے کا ماہانہ رسالہ جو ہندی اور سنسکرت میں نکلتا ہے۔

مراسلۂ کشمیر: کشمیری پنڈتوں کا ماہانہ رسالہ اُردو زبان میں ہے۔

مخبرِ سرور: بمبئی کا ہفتے وار اخبار۔ اسے حاجی مولا بخش کی ادارت کا شرف حاصل ہے۔ حاجی صاحب انگریزی، گجراتی، ترکی، عربی وغیرہ کئی زبانوں کے ماہر ہیں اور ان سے اپنے اخبار کے لیے ترجمے کیا کرتے ہیں۔

نیت پرکاش: اس کا اجرا امرت سر سے ہوا ہے۔ ہفتے وار ہے اور مقصد ہندوؤں میں مذہبی جوش پیدا کرنا ہے۔

پریاگ دھرم پرکاش: ہندی اور سنسکرت کا ماہانہ رسالہ۔

رہبرِ ہند: جالندھر سے شائع ہوتا ہے۔

رسالۂ انجمن مذاکرۂ علمیہ: پٹنہ کی انجمن ادب کا آرگن۔

رسالۂ انجمن تہذیب کان پور۔

ریاض الاخبار: خیرآباد سے نکلتا ہے۔

سکل سمبودھنی پترکا: ہندی کا ادبی اور مذہبی ماہ نامہ جو امرت سر کے سنتوکھ سنگھ کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

ستیہ مترا: بمبئی کا اخبار۔

تحفۂ کشمیر:

اُردُو اکولہ اخبار: اکولہ (برار) سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ پنجابی نے اس کے معیار کی تعریف کی ہے۔

کہیں پڑھنے میں آیا کہ جو ہندو عیسائی ہو گئے ہیں انھوں نے 'آرین' کے نام سے انگریزی میں رسالہ نکالا ہے[1] اگر یہ یورپین اور ہندو خیال کے مابین ترجمانی کر سکے تو ایک بہت بڑی کمی پوری ہو جائے۔

قاسم الاخبار: محمد قاسم خاں اس کے مالک اور مدیر ہیں۔

رام پور سے ہر جمعرات کو تاج الاخبار شائع ہوتا ہے۔ سولہ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ آغا علی نقوی غنی اس کے مدیر ہیں۔

دلّی کا ناصر الاخبار سرکاری حکام کی خدمت میں مفت حاضر ہوجاتا ہے۔ وہ شاکی ہے کہ "حکومت اب پہلے کی طرح ہندستانی اخباروں کی مدد نہیں کرتی۔ سر ولیم میور کے زمانے میں ایک ایک پرچے کی سوسو دو دو سو کاپیاں خرید کر افسروں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں تاکہ وہ حالات سے باخبر رہیں۔ اس مد میں ۲۵ ہزار روپے ہر سال خرچ کیے جاتے تھے۔ لیکن اب یہ رقم گھٹا کر صرف دس ہزار کر دی گئی ہے۔ چناں چہ اخبار فاقہ زدہ ہو گئے ہیں۔ اگر ہر صوبہ ان کی سو نہیں تو پچاس کاپیاں ہی خرید لے تو ان کا دلدر دور ہو جاتے۔ مناسب تو یہ ہے کہ ہندستان کے تمام اخبار نویس مل کر بڑے لاٹ بہادر سے درخواست کریں کہ پرانی رسم کی تجدید ہو اور کیوں کہ جہالت پر بہر حال علم کو ترجیح دی جاتی ہے، لہٰذا کیا عجب کہ ان کی عرض سن لی جائے۔ اخباروں کی حالت ان پودوں کی سی ہے جن کی پرورش اگر سلیقے

---

[1] Indian Mail ۱۳ مارچ ۱۸۶۹ء

سے ہو تو وہ موسم میں پھول اور پھل سے باغ بان کو مالا مال کر دیتے ہیں۔"

یہ کہہ چکا ہوں کہ جریدۂ روزگار کا اجرا شہزادۂ ویلز کی آمد کے زمانے میں مدراس سے ہوا تھا۔ اس نے اس تقریب کی مفصل روئداد شائع کی ہے۔ پیشِ نظر نمبر میں ولی عہد کی تصویر دی گئی ہے اور مدراس میں ان کا جو استقبال ہوا اس کا ذکر ہے۔

اودھ اخبار نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال پورے کر لیے۔ ان میں سے چودہ سال وہ ہفتے میں ایک بار اور پھر تین سال ہفتے میں دو بار نکلتا رہا۔ پچھلے سال سے وہ ہر دوسرے روز شائع ہونے لگا ہے۔ اس کے بہت سے قدردان چاہتے ہیں کہ وہ روز نکلا کرے۔ اخبار کے مالک کی بھی یہی خواہش ہے لیکن اس سے پہلے انھیں کم از کم پانسو نئے مستقل خریداروں کی ضرورت ہے۔

منظور احمد صاحب فرخ آبادی نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ ترکی، مصر، ایران اور ہندستان کے اکثر اخبار میری نظر سے گزرتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی اودھ اخبار کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بہرکیف فی الحال تو وہ ہفتے میں تین مرتبہ نکلتا ہے۔ منشی غلام محمد خاں نے از سرِ نو اس کی ادارت اپنے ذمے لے لی ہے۔ وہ پہلے بھی اس کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں اور ان کی قابلیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

گنجینۂ نظائر کا نام اوپر آ چکا ہے۔ ایک نئے فرمان کے بموجب 'ہائی کورٹ' اور 'پریوی کونسل' کے فیصلہ جات اب ایک سالانہ رپوٹ میں جمع کر دیے جاتے ہیں۔ قانون پیشہ طبقے کے

مطابے پر کوہِ نور پریس لاہور نے اس کا اُردو ترجمہ گنجینۂ شائیگاں کے نام سے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو لوگ انگریزی نہیں جانتے وہ ملک کے آئین قانون سے بے خبر نہ رہیں۔

اشرف الاخبار گو کہ نوزائیدہ ہے تاہم اپنے اعلا معیار کی وجہ سے دلّی کے بہترین اخباروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے مالک اور مدیر محمد میرزا خاں ہیں جو اپنی انشا پردازی، تاریخ دانی اور رواداری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کا قلم منجھا ہوا اور رائے جچی تُلی ہے۔

(۴)

اہلِ ملک نے تعلیم کے میدان میں ایسی ترقی کی ہے کہ حکومت نے برار کے شعبۂ تعلیمات کا ناظم ایک ہندو کو نامزد کیا ہے۔ ان کا نام راؤ صاحب نارائن ہے اور یہ پونہ کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ اس تقرر پر انگریزی اخباروں نے بڑا واویلہ مچایا ہے۔ اودھ اخبار نے ان کے اعتراضوں کو تردید کی غرض سے نقل کیا ہے[۱]۔ معترضوں کو شکایت ہے کہ جو فرنگی آکسفورڈ اور کیمبرج کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں انھیں ہندستان میں معمولی اسامیاں دی جاتی ہیں لیکن بڑی بڑی ملازمتوں پر ہندستانی مقرر کیے جاتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ یہ حکومت کی دانش مندی ہے کہ وہ اہلِ ملک کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے سے وابستہ کر رہی ہے۔ ان میں جو لوگ خاص طور پر ممتاز ہیں ان کی ہمت افزائی ہونی چاہیے۔ مثال کے طور پر ایک طالبِ علم کرشن چندر بنرجی کو لیجیے جو رُڑکی میں

---

[۱] ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۸ء

اوّل رہا اور انگریز طلبا سے بھی بازی لے گیا۔ انھوں نے سب سے پہلے بنرجی کو مبارک باد دی۔

پچھلے مقالے میں علی گڑھ کالج کی فائننس کمیٹی کے اس اہم اجلاس کا ذکر نہ کر سکا تھا جو سرولیم میور کی موجودگی میں ۱۱ نومبر ۱۸۷۵ء کو منعقد ہوا۔ اب اس کی روداد اُردو زبان میں موصول ہوئی ہے اور میں اس کا تھوڑا سا حال سنانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس اجلاس میں کمیٹی کے ارکان کے علاوہ علاقے کے رؤسا اور کالج کے تمام بہی خواہ شریک تھے۔

سرولیم سب سے پہلے سید احمد خاں کی رفاقت میں بنگلہ تشریف لے گئے جہاں کمیٹی کے صدر اور کالج کے سکریٹری مولوی سمیع اللہ خاں نے ان کا استقبال کیا۔ ان کے ساتھ وہ بورڈنگ کے معائنے کے لیے گئے اور اساتذہ و طلبا سے بے تکلفانہ گفتگو کی۔ جلسے کی نشست کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ کمیٹی کے سکریٹری سید احمد خاں نے اُردو زبان میں اپنی رپوٹ پڑھ کر سنائی جس کے شروع میں معزز مہمان کی بجا طور پر تعریف تھی۔ بعد ازآں انھوں نے کمیٹی کی کارگزاری کی جو تفصیل سنائی اسے دُہرانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ سب پر عیاں ہے۔ رپوٹ کے خاتمے پر سنی و شیعہ دینیات کے دونوں پروفیسروں نے نثر و نظم میں قصیدے سنائے۔ آخر میں سرولیم میور نے اُردو میں نہایت فصیح تقریر کی جو اخبار کے پانچ کالم میں چھپی ہے۔ ان کی اُردو دانی کا بڑا چرچا ہے۔

موصوف نے کہا کہ: "میرے دوست سید احمد خاں عرصے سے

یہ کالج قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کمیٹی کے ارکان نے اس کار نیک میں ان کی امداد کی وہ مددر جہ تحسین ہے۔ حکومت نے جب سے مجھے اس کالج کا مشیر نامزد کیا مجھے اس کے معائنے کی تمنا رہی۔ مغربی علوم کی تعلیم کا یہاں جو انتظام کیا گیا ہے اس صیغے سے مجھے خاص ہم دردی ہے اور اسی جذبے کے تحت میں نے اس ادارے کی مدد کی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر عین مسرت ہوئی کہ یہ صیغہ حسن و خوبی سے اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔" سر ولیم نے کالج کی رواداری کی تعریف کرتے ہوئے عیسائیوں کو مشورہ دیا کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

سر ولیم نے کہا کہ ہندستان جیسے ملکوں میں جہاں مذاہب کی کثرت ہو اور حکومتِ وقت کسی خاص مذہب کو ترجیح نہ دیتی ہو، تعلیم کا نظریہ دنیوی ہونا چاہیے۔ انھوں نے طلبا کو بھی مفید مشورہ دیا۔ کالج کے سرپرستوں اور کارپردازوں کی ستایش پر سر ولیم نے اپنا دل چسپ خطبہ ختم کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔

یہ کہنا باقی رہ گیا کہ سر ولیم میور کے نام سے ایک وظیفہ دینے کے لیے کالج میں چندہ جمع کیا جا رہا ہے۔ اُدھر الہ آباد میں ان کا مجسمہ قائم کرنے کی تجویز ہے اور اس کے لیے ایک فنڈ کھولا گیا ہے۔ یہ تجویز مہاراجا بنارس کی ہے اور رقم کی فراہمی میں ہندو پیش پیش ہیں۔ اودھ اخبار نے چندہ دینے والوں کی فہرست چھاپتے ہوئے لکھا ہے[۱] کہ یہ سر ولیم سے زیادہ ہماری عزت کا باعث ہوگا۔ مہاراجا بنارس نے دو ہزار کا بیش بہا عطیہ عنایت فرمایا ہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد مہاراجا پٹیالہ علی گڑھ کالج کو دیکھنے کے لیے آئے۔ سائنٹی فک سوسائٹی کے ہال میں جا کر انھوں نے اس کی

---

[۱] ۲۱ جولائی اور یکم ستمبر ۷۶ء

مطبوعات کو ایک نظر دیکھا۔ بعد ازآں ان کا استقبال ٹاؤن ہال میں کیا گیا۔ مولوی سمیع اللہ کے ایڈریس کے بعد مولوی محمد اسحاق نے ایک نظم میں ان کا خیر مقدم کیا۔ مہاراجا نے ایک پُر لطف تقریر کی جس میں انھوں نے کالج کو اٹھارہ سو روپے کی سالانہ امداد مستقل طور پر دینے کا اعلان کیا۔ انھوں نے فوری طور پر اس کا انتظام بھی کر دیا اور ان کا اقرار نامہ ۱۰ دسمبر کے علی گڑھ اخبار میں شائع ہوا ہے۔ اپنے خطبے کے آخر میں انھوں نے کالج کے علاوہ ان سب ہندستانیوں کی بہبودی کی دعا کی جو برطانیہ کے سایۂ عافیت میں رہتے ہیں۔ کالج کو جو عطیے ملے ہیں ان کی فہرست طویل ہے۔ مہاراجا وجیانگرم، نظام حیدرآباد اور سر سالار جنگ کے نام نامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[1]۔

علی گڑھ اخبار نے وہ فرمان نقل کیا ہے جس کے مطابق حکومتِ ہند کالج کو دائمی طور پر بہت سی زمین دے دی ہے۔

اب اس کالج کی بنیادیں مستحکم ہو چکی ہیں۔ اس کے روحِ رواں سید احمد خاں ہیں اور اسے سارا وقت دینے کے لیے انھوں نے سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا ہے۔ اس وقت وہ جج کے عہدے پر بنارس میں تعنات تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی قوم کی ترقی کا انھیں کتنا دھیان ہے اور کس لگن سے وہ اس کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ انھیں اس کی مطلق پروا نہیں کہ لوگ ان کے کام کی قدر کرتے ہیں یا نہیں۔ بہت سے تنگ نظر مسلمانوں کو ان کی آزاد خیالی سخت ناپسند

---

[1] علی گڑھ اخبار بابت ۱۰ جولائی سے معلوم ہوتا کہ مہاراجا پٹیالہ اور مہاراجا وجیانگرم کے عطا کیے ہوتے وظیفوں کی تقسیم کے لیے سید صاحب نے خاص انتظام کیا ہے۔

ہے۔ اس کے باوجود سارا ملک بہ یک زبان انھیں "ہندستان کا خیر خواہ" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ استعفے کے موقع پر ممالک متحدہ کے لفٹنٹ گورنر نے ایک خط کے ذریعے ان کی خدمات کو بہت سراہا ہے۔ بنارس والوں کی طرف سے جن میں ہندو مسلمان اور انگریز سبھی شامل تھے۔ انھیں ایک رخصتی ایڈریس چاندی کی مزین صندوقچی میں رکھ کر دیا گیا۔

یکم اپریل کو مسٹر ٹرنر کی صدارت میں الہ آباد ہائی اسکول میں تقسیم انعامات کا جلسہ ہوا۔ پرنسپل کی رپوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکول میں اس وقت تقریباً چھ سو طالب علم ہیں۔ مسٹر ٹرنر نے اپنی تقریر میں کہا کہ "یہاں طلبا کی تربیت و تعلیم کا ایسا اچھا انتظام ہے کہ وہ صحت کے ساتھ انگریزی نظم سنا سکتے ہیں۔ ہندستان آکر میں خاص طور پر ایک چیز سے متاثر ہوا وہ یہ کہ یہاں کے طلبا کی یادداشت بہت اچھی ہوتی ہے۔ یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انگریز بچوں کی طرح وہ کھیل کود میں زیادہ وقت نہیں گنواتے۔ اگر اس کے ساتھ ان میں جوش اور ولولہ بھی پیدا ہو جاتے تو وہ انگریزوں سے بڑھ جائیں۔ کیوں کہ صرف باتوں کو یاد رکھنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان پر سمجھ بوجھ کر عمل کرنا اور بھی ضروری ہے۔ پیڑ لگانے سے حاصل ہی کیا اگر اس میں پھل پھول نہ آئیں۔"[1]

پچھلے مقالے میں میں نے اطلاع دی تھی کہ پروفیسر مونیر ولیمس اپنی بیوی اور لڑکی کے ساتھ ہندستان گئے ہوئے ہیں۔ اس سفر کا مقصد انڈین انسٹی ٹیوٹ کی تجویز کو مقبول کرنا تھا۔ بمبئی پہنچ کر انھوں نے

---

[1] علی گڑھ اخبار ۲۴ اپریل ۱۸۸۳ء

اخبار ٹائمس آف انڈیا کو حسبِ ذیل خط لکھا: "آپ کا یہ قیاس بالکل صحیح ہے کہ میں معلومات حاصل کرنے آیا ہوں۔ کسی قسم کی تبلیغ سے مجھے دل چسپی نہیں۔ یہ ضرور کہوں گا کہ سول سروس کے امیدواروں کی تعلیم کے متعلق آج آپ نے جو اظہارِ خیال کیا ہے میں اس سے کلیۃً متفق ہوں۔

عام مقابلے کا طریقہ بہ ہر صورت غنیمت ہے۔ لیکن انتخاب کے بعد امیدواروں کا لندن میں رہنا اتنا مفید نہ ہوگا جتنا آکسفورڈ میں دو سال رہایش اختیار کرنا۔ یہ مراد نہیں کہ آکسفورڈ کا مجوزہ انڈین انسٹی ٹیوٹ صرف انھی کے لیے وقف ہوگا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انگلستان کے پڑھے لکھے لوگ بھی ہندستان کے معاملے میں جاہلِ مطلق ہیں۔ اب ولی عہد کے سفر کی وجہ سے ان میں اس ملک کے حالات جاننے کی خواہش زور پکڑ رہی ہے۔

مجوزہ انسٹی ٹیوٹ کا اصل مقصد یہ ہوگا کہ انگریزوں کی دل چسپی ہندستان کی طرف مائل کرے اور یہاں کے صحیح حالات انھیں بتلائے۔ اس کی یہ کوشش بھی ہوگی کہ تعلیم یافتہ ہندستانیوں کو انگلستان جانے کا شوق دلائے۔ اگر ہندستانی طلبا اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے آکسفورڈ آنا پسند کریں تو انھیں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جاسکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ملک کے اکابر اس تجویز کو کام یاب بنانے میں میری مدد کریں گے اور اس کے سرپرستوں میں انگلستان کے سربرآوردہ اصحاب کی طرح ان کے نام بھی ہوں گے۔"

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی شاخِ بمبئی کے ایک جلسے میں پروفیسر موصوف نے اپنی تجویز کو زیادہ صراحت سے بیان کیا۔ مجوزہ

انسٹی ٹیوٹ ایک قسم کی انجمن ہوگی جس میں مشرقیات سے دلچسپی لینے والے لوگ یک جا ہوسکیں گے۔ یہ تعلیمی ادارہ ہوگا جو متعلقہ مضامین میں آکسفورڈ کے نصابِ تعلیم کی تکمیل کرے گا۔ اسے ایسے پروفیسروں کا تعاون حاصل ہوگا جو سنسکرت، فارسی وغیرہ کے علاوہ قدیم ہندستان کے فلسفے اور آئین پر بھی درس دے سکیں۔ ہندستانی طالبِ علم کو ہر قسم کی آسانی بہم پہنچائی جائے گی اور ایسا انتظام کیا جائے گا کہ وہ یونانی اور لاطینی کی بجائے اپنی زبانیں سیکھ سکے۔"

پروفیسر ولیمس کے اعزاز میں ڈاکٹر آتمارام پانڈورنگ نے ایک پُرتکلف دعوت دی جس میں یورپیوں کے علاوہ کئی ہندو بھی شریک تھے۔ اس مجلس میں انگریز عالم کو ہندو دھرم کے متعلق تبادلۂ خیالات کا اچھا موقع ملا۔ آپ کو معلوم ہی ہو کہ Indian Wisdom کے نام سے انھوں نے اس مضمون پر ایک سیر حاصل کتاب لکھی ہو۔

اپنی تجویز کی تائید میں پروفیسر ولیمس نے ملک کے مختلف شہروں میں تقریریں کیں۔ کلکتہ کے جلسے میں بنگال کے لفٹنٹ گورنر نے شرکت کی تھی۔ مجوزہ انسٹی ٹیوٹ کا ایک مقصد تو یہ ہوگا کہ سول سروس کے امتحان کے لیے ہندستانی طلبا تیار کیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ یورپیوں کو ہندستان کے صحیح حالات سے اور ہندستانیوں کو یورپ کے حالات سے آگاہ کیا جائے۔ اگر انگریز ہندستان کو اچھی طرح سمجھ جائیں تو ان کا طرزِ حکومت بھی بہتر ہو جائے۔ انھیں اس اجنبی ملک کے مذاہب، تمدن اور طور طریقوں کا غائر مطالعہ کرنا چاہیے اور یہی ایک صورت دونوں قوموں کے تعلقات کو مستحکم کرنے کی ہو۔

اگر پروفیسر ولیمس کی تجویز پر عمل ہوا تو آکسفورڈ میں ہندستانی طلبا کو صرف انگریزی ہی نہیں بلکہ اپنی زبان کی بھی قدر معلوم ہوگی اور وہ ان ہندستانی صفات سے آشنا ہوں گے جنھیں وہ خود بھول چکے ہیں لیکن جن کی یورپ کے علمی حلقوں میں عزت ہے۔

کلکتہ کے جلسے میں بابو کیشو چندر سین نے بھی شرکت کی اور اس تجویز کی تائید کی۔ سر ٹیمپل نے کہا کہ انسٹی ٹیوٹ کو تین درجوں میں تقسیم کرنا چاہیے۔ ایک تو ہندستانی طلبا کے لیے مخصوص ہو اور دوسرا ان انگریزوں کے لیے جو ہندستان جانے والے ہوں۔ تیسرا ان لوگوں کے لیے جو ہندستان سے دل چسپی رکھتے اور وہاں کے حالات معلوم کرنا چاہتے ہوں۔

لندن ٹائمس میں پروفیسر مونیر ولیمس کا جو خط شایع ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادۂ ویلز اور وائس رائے ہند نے ان کے انسٹی ٹیوٹ کی سرپرستی قبول کرلی ہے۔

کلکتہ سے آگرہ اور دلّی ہوتے ہوئے پروفیسر ولیمس لاہور گئے۔ وہاں ان کے اعزاز میں انجمنِ پنجاب کا ایک جلسہ ہوا۔ اس میں بھی انھوں نے انسٹی ٹیوٹ کے مقاصد بیان کیے اور انجمن سے امداد کی درخواست کی۔

اس جلسے میں مشہور ماہر مشرقیات مسٹر ایسٹ وک Eastwick بھی موجود تھے۔ انھوں نے ہندستان کے متعلق بڑی چھان بین کی ہے اور بہت بڑے پیمانے پر اس ملک کا "گائڈ" تیار کر رہے ہیں۔ سارا ملک آٹھ حلقوں میں بانٹا جائے گا اور ہر ایک کے لیے ایک جلد وقف

ہوگی۔ علاوہ براین بڑی محنت سے انھوں نے کئی نادر قلمی کتابوں کو مٹنے سے بچالیا۔ لاہور کے شاہی علاقے میں کتبوں کا معائنہ کرتے ہوتے وہ ایک گاڑی کے نیچے آگئے تھے۔ بال بال بچ گئے ورنہ جان جانے میں کوئی کسر نہ رہی تھی[1]

انجمن پنجاب کے مذکورۂ بالا جلسے کا ذکر کرتے ہوتے اودھ اخبار نے یہ مضمون سپردِ قلم کیا ہے[2]: "معزز مہمان نے اس مجلس میں جو تقریر کی وہ بتا رہی تھی کہ انھیں ہم سے بڑی ہمدردی ہے اور ہمارے معاملات سے ان کی دل چسپی مخلصانہ ہے۔ انھوں نے ہماری اس شکایت کا ذکر کیا کہ انگریز حاکم ہمارے مزاج اور ریت رواج کو بالکل نہیں سمجھتے اور کہا کہ یہ شکایت بڑی حد تک صحیح ہے۔ لیکن جس طرح انگریز ہندستانیوں کو نہیں سمجھتے اس دیس والے بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ضرورت اس کی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی تہذیب اور تمدن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جب تک ایسا نہ ہوگا دونوں کا اتحاد نامکمل رہے گا۔

لارڈ میو کے زمانے میں اہلِ ملک کے لیے کئی اسامیاں مخصوص کر دی گئی تھیں۔ پروفیسر ولیمس کا ارادہ ہے کہ ان کے امیدوار آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کرنے بھیجے جائیں۔ یونی ورسٹی ایسا انتظام کرنے کا ذمّہ لیتی ہے کہ نامانوس اور اجنبی چیزوں کو دیکھ کر ان طلبا کے فطری رجحان میں کوئی فتور نہ ہو اور ان کی تربیت میں کوئی نقص نہ پیدا ہو۔ اس کے لیے ان کی تعلیم کا خاص انتظام کرنا ہوگا اور

---

[1] Indian Mail ۱۳ مارچ ۱۸۷۶ء

[2] ۲۳ فروری ۱۸۷۶ء

اس کے بعد دونوں قوموں کے باہمی تعلقات استوار ہوجائیں گے ان میں حاکم اور محکوم کی تمیز نہ ہوگی اور اس بنا پر کسی شکایت کا موقع نہ ہوگا۔

مسٹر ایسٹ وک نے پروفیسر ولیمس کی تجویز کو بہت سراہا اور ہم نے اوپر جو کچھ لکھا ہے وہ ان دونوں کی تقریروں کا خلاصہ ہے۔ ہم ہندستانیوں کا فرض ہے کہ ان خیرخواہ عالموں کی تجویز کو قابلِ عمل بنائیں..... کیا اب بھی ہم اپنی روایتی بے پروائی کو نہ چھوڑیں گے؟ ان انگریزوں نے جو راستہ سمجھایا ہے اس پر چلنے میں ہمارا سراسر فائدہ ہے۔ ہمیں فوراً چندہ جمع کرنے کے لیے کمیٹی بنانی چاہیے اور ایسی کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے نوجوان یورپ جاکر وہاں کے علوم وفنون سے بہرہ مند ہوں۔

یہ اچھی بات ہے کہ اس تجویز میں کسی خاص فرقے یا مذہب کی قید نہیں ہے۔ لہٰذا اس کارِ نیک میں بلاتکلف ہم ہاتھ بٹا سکتے ہیں"۔

ہندستان سے واپسی کے بعد پروفیسر ولیمس نے ایک مضمون لکھا جس میں بتایا ہے کہ ان کا سفر بہت کامیاب رہا اور ان کی رائے انگریزوں اور ہندستانیوں میں یکساں مقبول ہوئی۔ ان کی اپیل پر پانسو ملکی لیڈروں نے دستخط کیے۔ ان کا ایک مطالبہ یہ ہے کہ یونانی یا لاطینی کی بجائے ہندستانی طلبا کو ان کی کلاسک زبانیں پڑھائی جائیں اور انھیں امتحان میں لیا جائے۔

آکسفورڈ یونی ورسٹی نے انڈین سول سروس کے امیدواروں کو خاص مراعات دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کی تائید میں پروفیسر

ولیس نے کہا کہ یہ مراعات ان سب کو ملنی چاہییں جو ہندیات کو خاص مضمون کی طرح پڑھنا چاہتے ہیں۔

اس دوران میں لندن کے Asiatic Stranger's Home (ایشیائی مسافروں کا مسکن) کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ کئی ہندستانی اخباروں کی رائے ہے کہ اسے آکسفورڈ منتقل کر دینا چاہیے۔ ایشیا اور افریقہ کے بہی خواہوں نے کئی سال سے یہ ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اس میں پادری کے فرائض جارج اسمال کے سپرد ہیں۔ موصوف دس سال تک کلکتہ اور بنارس میں رہ چکے ہیں اور سنسکرت، بنگالی و ہندستانی سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ ان کی دو کتابیں 'سنسکرت ادب کا مقدمہ' اور 'توتا کہانی' کا ترجمہ مشہور ہیں۔

اکتوبر میں پروفیسر ولیس دوبارہ ہندستان روانہ ہوتے پہلی مرتبہ وہ صوبۂ مدراس نہ جا سکے تھے۔ اب کے وہ وہاں اپنی تجویز کی اشاعت کے علاوہ قلمی نسخوں کی تلاش کریں گے جن کی ضرورت انھیں اس عظیم الشان کتاب کے سلسلے میں ہے جو ہندو مذہب اور اس کے فرقوں پر وہ لکھ رہے ہیں۔

پنجاب کے اخباروں نے ڈاکٹر لائٹنر کی واپسی پر خوشنودی کا اظہار کیا ہے۔ انھیں اس ملک سے جتنی محبت ہے ملک والوں کو بھی ان کی ذات سے اتنی ہی محبت ہے۔ وہ کالج کے پرنسپل اور انجمن لاہور کے صدر ہیں۔ اس موقع پر شعبۂ عربی کے پروفیسر مولوی عبدالحکیم نے ایک نہایت عمدہ قصیدہ لکھا ہے جسے پنجابی اخبار نے چھاپا ہے۔[1] انجمن کی طرف سے ان کی خدمت میں خیر مقدم

---

[1] ۵ اپریل سنہ ۷۰ء

کا ایڈریس پیش کیا گیا۔ پنجاب یونی ورسٹی کا ذکر آیا تو مجھے یاد پڑا کہ اس نے رائے بہادر پنڈت موتی لال کو اُردو کا اور بابو چندر رلے کو ہندی کا ممتحن مقرر کیا ہے۔[1]

نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کی شاخ لندن کی سالانہ رپوٹ بابت ۱۸۷۵ء میری نظر سے گزری۔ اس انجمن کا مقصد ہندستان کی سماجی اصلاح ہے۔ یہ معلوم کرکے مجھے خوشی ہوئی کہ اس وقت انگلستان میں اسی طالب علم ہیں جو یا تو سول سروس کی تیاری کر رہے ہیں اور یا قانون وغیرہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو تفریح یا سیر کی غرض سے آتے ہوتے ہیں۔ یہ سوسائٹی ان ہندستانیوں کے سفر کو خوش گوار بنانا چاہتی ہے جو سات سمندر پار ولایت آتے نہیں گھبراتے۔ انھیں ایسے لوگوں سے متعارف کرتی ہے جو ان کے کام آسکتے ہیں اور انھیں ہر ممکن سہولت بہم پہنچاتی ہے۔ سوسائٹی ایسے جلسے منعقد کرتی ہے جن میں ہندستانی ان انگریزوں سے ملتے ہیں جو ان کے دیس سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ رپوٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایسوسی ایشن کا رسالہ ہندستان میں از حد مقبول ہے۔ نیز اس کی شاخیں مدراس، بمبئی اور دیگر مقامات میں قائم ہو چکی ہیں۔

کلکتہ میں بھی ہندستانیوں اور انگریزوں میں ربط قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ان کے مشترکہ جلسوں کے لیے ایک عمارت بنانے کی تجویز زیرِ غور ہے۔ وہاں اخبار بینی کے علاوہ

---

[1] Indian Mail ۲۶ مئی ۱۸۷۶ء

ادبی و علمی مباحثوں کا بھی انتظام ہوگا۔ مہاراجا ہلکر نے اس عمارت کے لیے ایک کثیر رقم دینے کا وعدہ کیا ہے[1]

مَیں یہ اطلاع دے چکا ہوں کہ نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کی بانی مس کارپنٹر ہندستان گئی ہوئی تھیں کراچی میں ان کا شان دار استقبال کیا گیا اور انھوں نے ایک اسکول کے فنڈ میں پانسو رُپے دیے۔ پونہ کے ایک جلسے میں انھوں نے مختلف معاشی مسائل پر اظہارِ خیال کیا۔ مدراس ہوتے ہوتے وہ کلکتہ گئیں اور وہاں برہمو سماج کے ایک مذہبی جلسے میں شرکت کی۔ سال رواں کے ماہ اپریل میں وہ جب یورپ روانہ ہوئیں تو ان کے ساتھ بابو ششی پرشاد بنرجی کے دو بچے تھے جن کی تعلیم انگلستان میں ہوگی[2]۔ لندن پہنچ کر انھوں نے اپنے سفر پر ایک نہایت دل چسپ تقریر کی۔ ایسوسی ایشن کے سکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے اس ایڈریس پر دستخط کیے جو سر سالار جنگ کو دیا گیا ہے۔

سیّد احمد خاں کی پیروی میں مولوی سیّد امداد علی آگرہ میں مسلمان لڑکیوں کے لیے ایک مدرسۃ العلوم قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کاش ایسے بہت سے اسکول بن جائیں اور مسلمان طالبات مغربی تعلیم حاصل کر سکیں۔ سیّد احمد خاں نے بہت عرصہ پہلے 'تہذیب الاخلاق' میں لکھا تھا کہ قومی ترقی کے لیے عورتوں کی تعلیم ازبس ضروری ہے اور اس کا بندوبست جتنی جلدی ہو سکے

---

[1] علی گڑھ اخبار ۵ نومبر ۱۸۷۵ء

[2] Indian Mail ۱۷ جنوری ۱۸۷۶ء

اتنا ہی اچھا۔ علی گڑھ کالج کے قیام کے بعد یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہو کہ عورتوں کے لیے انھی اصولوں پر ایک تعلیم گاہ بنائی جائے۔ کیوں کہ کوئی پڑھا لکھا لڑکا کسی جاہل عورت سے شادی کیوں کرنے لگا؟" بمبئی کے زنانہ الیگزینڈرا اسکول کے معائنے کے لیے پچھلے سال راجا کولھا پور، مہاراجا بھاؤنگر اور نواب رادھن پور کے علاوہ سدرلینڈ کے ڈیوک بھی آتے تھے۔ ان سب نے بہ یک زبان اسکول کی پرنسپل کے عمدہ انتظام کی تعریف کی اور اسکول کے بانی مانک جی کرسٹ جی کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دی۔ انھوں نے عورتوں کی تعلیم کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہو۔

معلوم ہوتا ہو کہ پنجاب کے شرفا خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، اپنے بچوں کو حصولِ تعلیم کے لیے بڑے شوق سے اسکول بھیج دیتے ہیں۔ ملک کے دوسرے صوبوں میں یہ بات نہیں۔ لاہور اور اطراف کے اسکولوں میں مسلمان طلبا کی اکثریت ہو۔ ہوشیار پور اور گرداس پور کے آدھے سے زیادہ طلبا دوٗر دوٗر سے آتے ہیں۔ لاہور میں تو یہ دیکھا گیا ہو کہ دیہاتی لڑکے اپنے گانو چھوڑ کر تعلیم کے شوق میں شہر آجاتے ہیں[1]۔

صوبۂ سرحد کے ضلع ہزارہ کی تعلیمی ترقی دل چسپی سے خالی نہیں۔ چار سال پہلے یہاں صرف تین اسکول تھے اور ان میں بھی گنے چنے

---

[1] اودھ اخبار ۵ مارچ ۱۸۷۶ء میں یہ لکھنا بھوٗل گیا تھا کہ مذہب پرست پارسیوں کو سخت شکایت ہو کہ ان کے بچوں کو خالص دنیوی تعلیم دی جاتی ہو جس کی وجہ سے وہ بڑے ہو کر پرانی باتوں کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔

لڑکے آتے تھے۔ اب اسکولوں کی تعداد ۲۵ ہے جن میں کوئی گیارہ کو طلبا ہیں۔ ان میں سے کئی آزاد علاقے سے پڑھنے آتے ہیں[۱]

صوبہ جات شمالی و مغربی کی تعلیمی ترقی بھی اطمینان بخش ہے۔ اس سلسلے میں لفٹنٹ گورنر نے کہا کہ ابتدائی تعلیم یا تو مفت اور یا بہت ارزاں ہے۔ لیکن اعلا تعلیم کے اخراجات تدریجی طور پر بڑھتے جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے شائق صرف امیرزادے ہیں جنھیں سرکاری بڑی اسامیوں کی خواہش ہے۔ لیکن اس ضمن میں بھی امیروں اور غریبوں میں تفریق کرنی چاہیے تاکہ سب کو تعلیم سے فیض یاب ہونے کا یک ساں موقع ملے۔ مدرسوں کی تنخواہ مقرر ہونی چاہیے یہ نہیں کہ جتنی فیس ملے ان میں بانٹ دی جائے[۲]

شاہ آباد (بہار) میں ایک اسلامیہ مدرسہ ہے جس میں تقریباً چالیس طلبا دینیات کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ زمانۂ قدیم کی طرح اب بھی نادار طلبا کے خورد و نوش کا مفت انتظام کیا جاتا ہے۔ بندیل کھنڈ کے راج کمار کالج میں کوئی بتّیس طلبا ہیں جن میں کئی ریاستوں کے ولی عہد بھی ہیں۔ صوبۂ مدراس کے زمیں داروں اور راجاؤں کی اولاد کے لیے بھی اسی قسم کی تعلیم گاہ قائم کرنے کی تجویز ہے۔ لیکن اس کے لیے کم از کم دس لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ اس وجہ سے تجویز پر عمل ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ متوسط ہند کے راج کماروں کے لیے اسی قسم کا کالج اِندور میں بنانے کا سوال

۱؎ Indian Mail یکم اپریل ۱۸۷۶ء

۲؎ علی گڑھ اخبار ۵ اگست ۱۸۷۶ء

بھی زیر غور ہے۔ یوں تو وہاں ایک بہت بڑا کالج پہلے سے ہے جس میں امرا کے لڑکے لیے جاتے ہیں۔ ایک خاص درجے میں ہلکر کے ولی عہد، رتلام کے راجا، نواب زادہ باندہ اور دیگر رئیس زادے تعلیم پاتے ہیں۔

اجمیر کے میو کالج میں حسب دستور راج کماروں کی بھیڑ رہتی ہے۔ فی الحال ان کی تعداد ۲۳ ہے اور اس میں برابر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

اودھ کے ناظم تعلیمات مسٹر نیس فیلڈ کی رپوٹ کے مطابق اس صوبے میں ۱۵۵۵ اسکول ہیں جن میں ساٹھ ہزار طلبا ہیں یعنی دو سو باشندوں پر ایک طالب علم کا اوسط بیٹھتا ہے۔ ہندی کے مقابلے میں اُردو کا زیادہ چلن ہے۔ گو کہ ہندی کو بے جا طور پر ترجیح دی جاتی ہے۔ تاہم ۷۴-۱۸۷۳ء میں اُردو خوانوں کی تعداد ۳۱۸۸۹ سے بڑھ کر ۳۳۳۸۸ ہو گئی اور ہندی خوانوں کی تعداد ۲۶۴۲۸ سے گھٹ کر ۲۴۱۱۳ رہ گئی۔ انگریزی خواں ۵۰ ہزار کے لگ بھگ تھے اور عربی پڑھنے والے آٹھ سو تھے۔ لیکن سنسکرت کے شیدائی دو سو سے زیادہ نہ نکلے۔ کُل خرچ کا ½ فی صدی فیس سے وصول ہوا۔ باقی کی کفالت حکومت نے کی۔[1] یہی رپوٹ شاہد ہے کہ اودھ میں — جہاں کی واحد زبان ہندستانی ہے — مسلمان ہندوؤں کی بہ نسبت سرکاری تعلیم کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت اسکولوں میں ملے گا۔

کلکتے کے بڑے پادری ڈاکٹر Middleton مڈل ٹن کا قائم کردہ بشپ کالج ہگلی کے کنارے بنا ہوا ہے۔ اس میں ہندستانی

---

[1] علی گڑھ اخبار، ۱۷ دسمبر ۱۸۷۵ء

عیسائیوں کو مبلّغ یا مدرّس وغیرہ کی تعلیم تو دی جاتی ہی ساتھ ہی ملکی زبانوں کے پڑھانے کا بھی انتظام ہی۔ پچھلے سال اس میں ۲ ۵ طالب علم تھے جن میں سے ۲۸ بورڈنگ ہوس میں رہتے تھے۔

لکھنؤ کے مدرسۂ ایمانیہ میں روز بہ روز ترقّی ہورہی ہی۔ یہاں دینیات کے علاوہ دیگر علوم وفنون کی تعلیم بھی دی جاتی ہی۔ اس کے طلبا نے زندگی کے مختلف شعبوں میں شہرت حاصل کی ہی جن کی فہرست پنجابی نے شایع کی ہی[1]

مہاراجا جے پور ان معدودے چند ہندستانی رئیسوں میں سے ہیں جو اپنے ملک کی ترقّی کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ لارڈ میو کے گہرے دوست تھے اور ان کا مجسّمہ ایک شاندار اسپتال کے سامنے نصب کیا ہی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ لارڈ میو ایک ہندستانی قاتل کے شکار ہوئے۔ اجمیر کے میو کالج کو مہاراجا نے ایک لاکھ کا گراں قدر عطیہ دیا ہی۔ اجمیر میں لڑکیوں کے لیے فنونِ لطیفہ کا ایک اسکول ہی جس کا انتظام یورپین خواتین کے سپرد ہی۔ شہر میں گیس کی روشنی ہوتی ہی جس سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئی ہیں۔

بہار کی ادبی انجمن کا رکن ہونے کا شرف مجھے بھی حاصل ہی۔ شہزادۂ ویلز کی آمد کے زمانے میں اس نے صنعت وحرفت کا ایک مدرسہ کھولا اور ولی عہد کے نام پر اس کا نام رکھا ہی[2]

---

[1] ۷، جولائی ۱۸۷۶ء

[2] علی گڑھ اخبار ۲۱ جنوری ۱۸۷۶ء

(۵)

ہندستان میں مفادِ عامّہ اور اصلاح کے مقصد سے نت نئی سبھائیں بنتی جاتی ہیں اور ان کی تعداد کا شمار ناممکن ہے۔ ان میں سب سے بااثر "انڈین ایسوسی ایشن" ہے جس کا دائرۂ کار کشمیر سے راس کماری تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا صدر دفتر کلکتہ میں ہے۔

گزشتہ ۲۴ فروری کو علی گڑھ کی سائنٹی فک سوسائٹی کا سالانہ جلسہ ہوا۔ سکریٹری کی رپوٹ میں یہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ اس کی ترقی خاطر خواہ نہیں ہے اور ارکان کی تعداد ۱۵۸ سے گھٹ کر ۱۳۷ رہ گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ سوسائٹی نے یورپ کی منتخب اور مفید کتابوں کے ترجمے کی جو اسکیم تیار کی تھی وہ منسوخ تو نہیں ؛ ملتوی ضرور ہو گئی ہے۔ وجہ یہ کہ جہاں سے امید تھی وہاں سے رُپیہ وصول نہ ہو سکا۔ البتہ تاریخِ ایران کا دوسرا حصّہ شائع ہوا ہے اور سوسائٹی مطبوعات کے سلسلے کو جاری رکھنے کی ہر امکانی کوشش کرے گی۔

حکومتِ بنگال کی سرپرستی میں ڈاکٹر مہیندر لال ایک سائنٹی فک ایسوسی ایشن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ صوبے کے حاکم نے اسے شہر کے بیچوں بیچ ایک عمارت بھی دے دی ہے[۱]۔

کئی مرتبہ ایسی مثالیں ہماری نظر سے گزری ہیں کہ ہندو بیواؤں نے ستی کی رسم کے امتناع پر غصّے کا اظہار کیا ہے۔ کیوں کہ شوہر کے انتقال کے بعد وہ دین و دنیا کہیں کی نہیں رہتی۔ نہ تو دوسری شادی کر سکتی ہیں اور نہ گھر میں عافیت کی زندگی بسر کر سکتی ہیں۔ لہٰذا دقات

---

[۱] Indian Mail ۲۵ مارچ ۷۶ء

تنگ آکر وہ خود کُشی کرلیتی ہیں اور اس پرستی کو بہرحال ترجیح دیتی ہیں کیوں کہ اسے وہ مذہباً مستحسن سمجھتی ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ہندستان کی تمام اصلاح پرور انجمنیں بیواؤں کی شادی کی مؤید ہیں[1]۔ ہندو بیوہ کی بے بسی کی مثال حسبِ ذیل واقعے سے ملے گی جو میں اودھ اخبار[2] سے نقل کرتا ہوں: "کلکتہ میں ایک تشکیل اور تعلیم یافتہ ہندو لڑکی شری متی کماری داسی نامی رہتی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ بیوہ ہو گئی۔ انتہائے غم میں اس نے خودکُشی کے ارادے سے افیون کھالی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تو گھر والوں کو اس کی ایک تحریر ملی جس میں بتلایا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی جان کیوں لے رہی ہے۔ یہ تحریر اخباروں میں شایع ہو چکی ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ: "اب میں جی کر کیا کروں! دوبارہ شادی بے وفائی ہو گی۔ بچپن کی شادی سے بڑی کوئی لعنت نہیں۔ میں زہر کھا رہی ہوں کیوں کہ چین مجھ سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا۔ ہندو عورت سے زیادہ بدنصیب کون ہو گا۔ میرا بیاہ ۱۴ سال کی بالی عمر میں ہو گیا اور چار سال میں میں بیوہ بھی ہو گئی۔ اس بارِ غم کو برداشت کرنے کی ضرورت میں محسوس نہیں کرتی۔ بھگوان نے مجھے عورت کیوں بنایا؟"

اس الم ناک سانحے پر اودھ اخبار یوں رائے زنی کرتا ہے:

---

[1] عبدالکریم خاں نے اس موضوع پر 'رانڈوں کی شادی' کے عنوان سے ایک مفید رسالہ لکھا ہے۔

[2] ۲۱ نومبر ۱۸۸۵ء

"اصلاح پرور جماعتیں اس طرف توجہ کیوں نہیں کرتیں؟ یہ سچ ہے کہ ایک دم وہ اس کبیدہ رسم کو روک نہیں سکتیں۔ لیکن بیواؤں کی حالت میں تو اصلاح ہو سکتی ہے۔ تمام مذاہب کی ایک مشترکہ کانفرنس میں اس مسئلے پر غور ہونا چاہیے اور بیواؤں کی شادی کو مقبول کرنا چاہیے۔ کم سے کم پڑھے لکھوں کو تو اس پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔ کوئی مذہب اس کی ممانعت نہیں کرتا۔ اس کے باوجود ہندستان میں ہر چند سرمایے کوئی ان بدنصیب عورتوں پر رحم نہیں کھاتا۔ زمانۂ قدیم میں مسلمانوں میں بیوہ کی شادی کا چلن تھا۔ علما اسے سراہتے تھے بلکہ اسے کسرِ نفس کی علامت تصور کرتے تھے۔ جب ہندوؤں میں بھی اس کی اجازت ہے تو وہ اس معاملے میں مسلمانوں کی پیروی کیوں نہیں کرتے۔

جب حدیثوں میں بیواؤں کی شادی کی تلقین کی گئی ہے تو آج کل کے مسلمان اس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ اسے بُرا کیوں سمجھتے ہیں؟ عالم اور قاضی عام مسلمانوں کو اس بات پر رضامند کیوں نہیں کرتے کہ جوان بیواؤں کی شادی کو اپنا فرضِ منصبی سمجھیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کے بعد کٹ ملّا اس قسم کے مستحسن اقدام کے خلاف کچھ نہ کہیں گے بلکہ اس کی حمایت میں پیش پیش ہوں گے۔

ہندستانی مسلمانوں میں اس تجویز کی مخالفت دو طبقوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ ایک تو وہ نیم مُلّا جن سے خدا ہماری قوم کو محفوظ رکھے۔ دوسرے خود عورتیں۔ جن کی کم عقلی مسلّم الثبوت ہے

نیم ملا تو خیر راہِ راست پر لائے جا سکتے ہیں۔ لیکن بے وقوف عورتوں کی اصلاح مشکل ہے۔ کیوں کہ یہ جہالت کے پردے میں پڑی سڑتی ہیں اور ان کی کوئی جماعت بھی نہیں ہے کہ انھیں سدھارے۔ مگر بادِش بخیر، ان کی تعلیم کی ذمّے داری تو مردوں پر ہے۔ اگر وہ ارادہ کر لیں تو عورتوں کو اپنے خیالات کی اصلاح پر مجبور ہونا ہوگا۔

مردوں کا یہ حال ہے کہ سہارن پور کے مولوی محمد قاسم نے دو چار بیواؤں کا نکاح پڑھا دیا۔ بس پھر کیا تھا غضب ہو گیا۔ جاہل مسلمان ان کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ مولوی صاحب بھی سینہ سپر ہو گئے کہ اگر راہِ حق پر جان قربان کرنا پڑے تو پروا نہیں۔ اگر مردِ مومن کچھ کرنے کا فیصلہ کرے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں روک سکتی"

ہندو مسلمانوں میں کثرتِ ازدواج کی رسم ہے۔ لیکن عیسائیوں میں اس کی یک لخت ممانعت ہے۔ جب کوئی ایسا ہندستانی جس کی کئی بیویاں ہوں، عیسائی ہونا چاہتا ہے تو پادری عجب مخمصے میں پھنس جاتے ہیں۔ یہ معاملہ آج بھی در پیش ہے۔ کاٹھیاواڑ کی مشہور ریاست بھاؤنگر کے نوجوان راجا نے عیسائی ہونے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ لیکن آج سے چار سال پہلے صرف سترہ سال کی عمر میں انھوں نے ایک ساتھ چار لڑکیوں سے بیاہ رچا ڈالا۔ یہ سب کم عمر ہیں صرف ایک کی عمر بائیس سال ہے۔ پادریوں نے راجا سے کہہ دیا کہ ان سب کے ساتھ آپ عیسائی نہیں ہو سکتے۔ راجا کو پندرہ سالہ رانی

سے محبت ہے۔ لیکن باقی تینوں کا کیا حشر ہوگا؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ دوسری شادی کرلیں؟ اگر یہ ہوسکا تو اصلاح پرور جماعت کو اپنے اصولوں کی اشاعت کا اچھا موقع ملے گا۔

منشی پیارے لال اس کمیٹی کے صدر ہیں جس کا مقصد شادی بیاہ کی فضول خرچی کو روکنا ہے۔ انھیں اس مقصد سے بڑی دل چسپی ہے۔ اپنے صوبۂ بہار کا دورہ کرتے ہیں اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکّام کے تعاون سے انھوں نے دیہاتیوں کے لیے اخراجات کی فہرست بنادی ہے۔ کوئی اسے نہ مانے تو حاکمِ ضلع سے شکایت کی جاسکتی ہے۔[۵]

گزشتہ ۳۰ جولائی کو پونہ میں صغرسنی کی شادی کی روک تھام کے لیے ایک کانفرنس ہوئی۔ رائے بہادر گووندرام نے ایک پُرجوش تقریر کی جس میں اس بُرے رواج کی سخت مذمت کی گئی۔ اس کے نقصانات کی تفصیل سنانے کے بعد فاضل مقرر نے بتایا کہ یہ شاستروں کے احکام کے خلاف ہے۔ لیکن ایک طرف تو نیک لوگ یہ جدّوجہد کررہے ہیں۔ دوسری طرف رجعت پسند جاہلوں نے جو گجراتی ہندوؤں کی ایک ذات کے لیڈر ہیں، یہ منادی کردی ہے کہ جو اپنی بیٹی کا بیاہ چھ مہینے کی عمر میں نہ کردے گا وہ ذات باہر کردیا جائے گا![۳]

پنجابی نے اطلاع دی ہے کہ ضلع لاہور کے قصبۂ قصور میں ایک انجمن قائم کی گئی ہے۔" حالاں کہ اس کی عمر بہت کم ہے اور اس کے

[۵] اودھ اخبار ۲۱ اپریل ۱۸۷۶ء

[۳] علی گڑھ اخبار ۲۲ ستمبر ۱۸۷۶ء

کارکنوں کی تعداد بھی گنی چنی ہے تاہم ان کی کام یابی قابلِ ستائش ہے۔ اس وقت انجمن کے ارکان کی تعداد ۲۲۸ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جو لوگ صنعت وحرفت کے حامی ہیں ہر طرح انجمن کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ اس کے ماہانہ رسالے کے خریداروں کی تعداد ۳۲۵ ہے۔ اس کی ترتیب میں اچھے اچھے لکھنے والے حصّہ لیتے ہیں اور پچھلے سال سب ملاکر اس میں ۶۵ مضامین نظم ونثر درج ہوئے۔

صنعت وحرفت کے طلبا کی تعداد ۱۲۵ ہے۔ انجمن کے اینگلو اُردو اسکول میں ۲۲۴ طالبِ علم ہیں۔ انجمن کے کتب خانے میں مختلف زبانوں کی ۲۴۰ کتابیں ہیں جن میں سے کچھ تو لوگوں کی دی ہوئی ہیں اور کچھ خریدی ہوئی ہیں۔ ایسے چھوٹے سے شہر میں اتنی کارآمد انجمن کی موجودگی بڑی تعریف کی بات ہے۔

انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے زراعت کی طرف توجہ کی ہے۔ زراعت صرف پنجاب ہی نہیں بلکہ ملک بھر کا سب سے اہم پیشہ ہے۔

ضلع کانگڑہ کے شہر نورپور میں 'انجمن خیر خواہِ ملک' ظہور میں آئی ہے۔ اس کے صدر پنڈت درگا پرشاد ہیں اور تقریباً پچاس ارکان میں سے کچھ سرکاری عہدے دار ہیں اور باقی شرفاے شہر ہیں۔ مہینے میں دوبار اس کے جلسے ہوتے ہیں اور انجمن کے ماہ نامے میں ان کی رودادچھپا کرتی ہے۔ انجمن کی کارگزاری ادب اور تعلیم تک محدود ہے۔ کالج اور اسکولوں کے نادار طلبا کو مفت درسی کتابیں بانٹنے کی غرض سے انجمن چندہ بھی وصول کرتی ہے۔ وہ ایک کتب خانہ

قائم کرنے کا ارادہ بھی رکھتی ہے۔

ضلع مظفر پور کے قصبۂ حاجی پور میں کچھ عرصے سے انجمن رفاہِ عام قائم ہوئی ہے۔ اس نے اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی ہے۔ اس کی دلچسپی کا مرکز بھی ادب اور علم ہے۔ انجمن کا ارادہ ہے کہ اپنے ارکان کے لیے ملک کے تمام اہم اخبار منگواتے۔ اس کے کارکنوں میں ایک نامی گرامی شاعر اللہ یار ہے جس کی غزلیں اخبار پنجابی میں چھپا کرتی ہیں۔

نواب گنج ضلع بارہ بنکی کے رئیس نے اپنے قصبے میں انجمنِ تہذیب قائم کی ہے۔ اس کا افتتاح مسٹر Wood وُڈ نے کیا اور اُردو میں اپنی فصیح تقریر کی جس کا خلاصہ اودھ اخبار[1] میں شائع ہوا ہے اس کے سکریٹری میر واجد علی اور پنڈت رتن ناتھ ہیں۔ ان ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ انجمن ہے۔

سوہاگ پور ضلع ہوشنگ آباد میں انجمن فلاحِ اہلِ اسلام کے نام سے ایک بھاری بھرکم کمیٹی بنی ہے۔ فرسودہ رسموں کے انسداد کے علاوہ مسلمانوں کی تعلیم اور روزی کا انتظام اس کے مقصدوں میں شامل ہے۔ غریب مسلمانوں کی دست گیری کی طرف بھی یہ انجمن توجہ کرتی ہے۔

اس سال کے شروع میں برہمو سماج کی نگرانی میں بابو نوین چندر رائے نے الہ آباد میں یتیموں اور بیواؤں کے لیے ایک محتاج خانہ کھولا ہے۔ یہ کسی قوم یا ذات کے لیے محدود نہیں، اس کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ امیدواروں

---

[1] ۱۹ جولائی ۱۸۶۹ء

کو محتاج خانے کے قواعد کی پابندی کرنی ہوگی اور اس کے طریقۂ تعلیم پر چلنا ہوگا۔

گزشتہ ۲۷ اپریل کو بنگال کے لفٹننٹ گورنر نے کلکتہ میں البرٹ ہال کا افتتاح کیا جو شاہ زادۂ ویلز کے سفر کی یادگار میں قائم کیا گیا ہے۔ لوگ بہت عرصے سے ایک ایسی جگہ کی کمی محسوس کر رہے تھے جہاں وہ جلسے کر سکیں اور تعلیم یافتہ لوگوں سے مل سکیں۔ بابو کیشو چندر سین نے اس موقع پر ایک دل چسپ تقریر کی۔

(۶)

مذہب اور زبان و ادب میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس وجہ سے ہندستان کے دو سب سے بڑے مذاہب اسلام اور ہندومت کا ذکر ناگزیر ہے۔ ہندومت میں بھی سب سے پہلے برہمو سماج کا ذکر کرنا ہے جس نے ہندوؤں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یا یوں کہیے کہ انھیں مغربیت کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

اس سماج کا سالانہ جلسہ گزشتہ ۲۲ جنوری کو کلکتہ میں ہوا۔ مہمانوں میں بنگال کے لفٹننٹ گورنر اور کلکتہ کے لاٹ پادری ممتاز تھے۔ جلسہ ایک دعا اور ایک بھجن کے ساتھ شروع ہوا۔ پھر بابو کیشو چندر سین نے اپنا خطبہ سنایا اور باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ عیسیٰؑ نے اپنی ملت کی قیادت کلیسا کے سپرد کی تھی تاکہ ان کے پیرو اِدھر اُدھر بھٹکنے نہ پائیں۔ ہر عیسائی فرقے نے کلیسا کی عظمت کو تسلیم کیا ہے اور عیسیٰؑ کے خلیفہ سینٹ پال نے اس کے استحکام کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کیں۔ آگے چل کر بابو صاحب

نے کہا کہ برہمو سماج حقانیت کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ اصول ویدوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ ان کی راے میں الوہیت کی جیسی وضاحت ویدوں میں کی گئی ہے کسی آسمانی کتاب میں نہ ملے گی۔

اخبار (Indian Mirror) انڈین مرر کا بیان ہے کہ برہمو سماج نے ایک پھلواری خریدلی ہے جس میں بابو کیشو چندر سین اپنے رفیقوں کے ساتھ جمع ہوتے اور ایشور کے بھجن گاتے ہیں۔ پیڑوں کی چھانو میں مرگ چھالا بچھاکر یہ لوگ گھنٹوں روحانیت کے مسئلوں پر غور کیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ تو خدا کی یاد میں محو ہوجاتے ہیں اور کچھ باغ بانی کرنے لگتے ہیں۔ کوئی پانی لا رہا ہے، کوئی پیڑ کاٹ رہا ہے، کوئی قلم لگا رہا ہے۔ استغراق کا وہ عالم ہوتا ہے کہ لوگوں کو تن بدن کی سُدھ نہیں رہتی۔ تھک کر سب گھڑی بھر کے لیے سوجاتے ہیں اور جاگ کر دوبارہ یادِ الٰہی میں مگن ہوجاتے ہیں۔ شام کو یہ لوگ آرتی کی گھنٹی بجاکر کیرتن گانے لگتے ہیں اور بسااوقات مست ہوکر سڑکوں پر نکل پڑتے ہیں۔ کسی غریب کا جھونپڑا آیا تو اس میں جاکر حمد گانے لگتے ہیں[1]۔

سنا ہے کہ ایک نوجوان برہمو سماجی جو جرمنی میں تعلیم حاصل کررہا ہے خشکی کے راستے پیدل ہندستان لوٹنا چاہتا ہے تاکہ یورپ اور ایشیا کے مختلف ملکوں کے طور طریقوں کا بہ ذاتِ خود مطالعہ کرے اور اپنے دیس والوں کو ان کے حالات سنائے۔

---

[1] Indian Mail ۲۸ فروری ۱۸۷۶ء

[2] پنجابی، جون ۱۸۷۶ء

کان پور سے 'اصل عقائد برہما سماج' نامی رسالہ شایع ہؤا ہی جس میں سماج کے اصولوں کی تشریح اُردو زبان میں کی گئی ہی۔

برہمو سماج کی دیکھا دیکھی ملک بھر میں طرح طرح کی سبھائیں بن رہی ہیں۔ میں ان میں سے کئی کا ذکر کر چکا ہوں۔ اسی سلسلے میں جنگلی بھیلوں کے علاقے سے ایک دل چسپ اطلاع ملی ہی۔ ان کا ایک گرو جس کا نام جرگی ہی[1] ایک نئے دھرم کی تبلیغ کر رہا ہی۔ وہ کہتا ہی کہ خدا ایک ہی اور اس کی مرضی ہی کہ سب انسان مل جل کر امن چین سے رہیں۔ اس کے چیلے 'بھگت' کہلاتے ہیں اور ان کی تعداد اس وقت ایک ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ یہ نصیحت کرتے پھرتے ہیں کہ شراب حرام ہی، گوشت خوری ممنوع ہی اور کھانے سے پہلے نہانا فرض ہی[1]۔

پنڈت دیانند سرسوتی بت پرستی کی مذمت اور اپنے ویدک دھرم کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ پونہ سے وہ سورت پہنچے اور ان کی تقریر سننے کے لیے قدامت پرست بھی ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے[2]۔ بعد ازاں سوامی جی کا گزر بڑودہ کی طرف ہؤا۔ بہت سے باثر لوگوں نے جو مذہبی اصلاح کی ضرورت محسوس کرتے ہیں انھیں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ اب تو ان کا حوصلہ بڑھ گیا اور یہ اندور گئے جہاں مہاراجا نے انھیں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی تھی۔ بابو کیشو چندر سین نے

---

[1] Indian Mail ۱۷ جنوری ۱۸۷۶ء

[2] تاج الاخبار ۲ جنوری ۱۸۷۶ء۔ یہی وہ سوامی دیانند ہیں جنھوں نے آریہ سماج کو جنم دیا ہی۔

کی طرح سوامی دیانند بھی بُت پرستی کے مخالف ہیں اور ویدوں کے پُرانے مذہب کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے اپنے پچھلے مقالے میں لکھا تھا کہ بابو کیشو چندر سین اپنے ساتھیوں کو یورپین لباس پہننے سے منع کرتے ہیں کیوں کہ ان کی رائے میں یہ وطن سے بُعد پیدا کر دیتا ہے۔ پنجابی[1] نے ایک طویل مضمون میں ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو پرایا لباس پہنتے ہیں۔ اسی موضوع پر علی گڑھ اخبار میں بابو کاشی ناتھ نے لکھا ہے کہ "ہر قوم کا اپنا ایک لباس ہوتا ہے۔ لیکن ہندستان میں ہندو اپنی دھوتی پر قائم ہیں تو بہت سے لوگ تُرکی ٹوپی اور یورپین پتلون کے شیدائی ہیں۔ اس قسم کی افراتفری ہمیں زیب نہیں دیتی.... قومیت کے طرف داروں کو اس طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔ کم از کم عورتوں کو تو انگریزی گھاگھرے اور سایہ سے بچنا چاہیے۔ ہمیں تو وہ ساڑی اور چادر ہی بڑی بھلی لگتی ہیں۔

یہ بھی مناسب نہیں کہ یونی ورسٹی میں تقسیمِ اسناد کے موقع پر قبا اور جبّہ پہنی جائے۔ کیا ان تقریبوں میں قومی لباس پہننا نامناسب ہے؟ منصفوں اور سرکاری افسروں کی یہ ضد کہ ان کے آگے لوگ مخصوص لباس میں پیش ہوں، یقیناً قابلِ ملامت ہے۔ وکیلِ ہندستان کا یہ مطالبہ بالکل بجا ہے کہ حکومت اس ضمن میں کوئی قاعدہ بنا دے تاکہ لوگ افسروں کے غمزوں کے شکار نہ ہوں"۔

اب ان ہندوؤں کی طرف آیئے جو اصلاح کے مخالف ہیں۔

---

[1] ۱۹ اگست سنہ ۶۶ء

دھرم سبھا نے گزشتہ ۱۶ جنوری کو قیصر باغ لکھنؤ میں اپنی پہلی سال گرہ منائی۔ اودھ اخبار کا نامہ نگار لکھتا ہے[1]: "صبح سے شام تک غریبوں میں اُبلے ہوئے چاول بٹتے رہے۔ ہزاروں اس صدا برت سے مستفید ہوئے۔ اس کے بعد سبھا کے کارکنوں کا جماؤ گھٹ گیا۔ ان میں پنڈت اور گیانی زیادہ تھے۔ تین سو سے کم نہ ہوں گے۔ پہلے تو شیئو گیتا اور رامایَن کا دَور ہوا جسے حاضرین نے کان لگا کر سنا۔ پھر مہاراج پنڈت گنگا دھر نے دھرم سبھا کے مقصد پر روشنی ڈالی۔ آخر میں مقدس وید کی کوئی دُعا بہ بانگِ دُہل پڑھی جس کا مطلب یہ تھا کہ: "جب تک سورج اور چاند قائم ہیں یہ سبھا زندہ رہے اور اسے دن دُونی رات چوگنی ترقی ہو......" اب گانے بجانے والوں نے اپنے کرتب دکھائے اور خوب رنگ جمایا۔ رات تک یہ نشست رہی۔ بعد ازاں پنڈتوں کو چاندی اور دوسروں کو مٹھائی ملی"۔

انڈین ڈیلی نیوز، نامی انگریزی اخبار نے قدامت پسند ہندوؤں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے پُرانے رسم و رواج کی حفاظت کے لیے منظم ہو جائیں۔" مغربی تہذیب کے سیلاب میں سب کچھ بہا جا رہا ہے۔ لیکن اگر ہم میں کئی بُرائیاں ہیں تو کچھ خوبیاں بھی ہیں اور انھیں بہرحال زندہ رہنا چاہیے۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے دھرم اور ہماری تہذیب میں اتنی یگانگت ہے کہ اصلاح کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ کام کرنے کا ہے اور جنھیں اپنی قدیم روایت سے محبت ہے انھیں دھرم سبھا کی ہر امکانی مدد

---

[1] اودھ اخبار ۲۶ جنوری ۱۸۶۶ء

کرنی چاہیے۔"

اس جدّوجہد کے باوجود ہندستان کے پُرانے رسم و رواج رفتہ رفتہ مٹتے جاتے ہیں۔ کئی فرسودہ تیوہار سرکاری طور پر بند کر دیے گئے ہیں۔ اس سال ہندؤ بیوپاریوں نے دسہرا نہ منانے کا فیصلہ کیا ہے[1] تاہم عوام اپنی پُرانی ڈگر پر چلے جاتے ہیں۔

یہ خیال غلط ہے کہ ہندو مسلمانوں میں میل جول نہیں ہے۔ شہنشاہِ اکبر کی پیروی میں مسلمان اب بھی ہندوؤں کی تقریبوں میں خوشی خوشی حصہ لیتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً میں نے اس اتحاد کی مثالیں بھی دی ہیں۔

دہلی کی انجمنِ اسلامیہ کا ایک جلسہ گزشتہ ۲۲ مئی کو ہوا تھا۔ اخبار پنجابی نے اس کا تھوڑا سا حال لکھا ہے[2]: "انجمن کے اکثر ممتاز ارکان نے جلسے میں شرکت کی۔ آغا حسن خاں بہادر بھی تھے جنھیں ان کی خدمات کے عوض حکومتِ انگلشیہ نے ہزار روپے سالانہ کی پنشن دی ہے۔ شاہزادۂ ویلز نے انھیں انگلستان آنے کی دعوت بھی دی ہے۔ انجمن کے ناظم خواجہ علی احمد نے اغراض و مقاصد کی وضاحت کے بعد انجمن کی کارگزاری بیان کی۔ منشی محمود الحسن نے ملکہ کو شہنشاہ کا خطاب دیے جانے کی اہمیت بتائی اور برطانیہ کے وزیرِ اعظم نے اس ضمن میں پارلیمنٹ میں جو کچھ کہا تھا، اس کا خلاصہ سنایا۔ منشی جی نے یقین دلایا کہ ہندستان کے رئیس

---

[1] اودھ اخبار ۳۰ اگست ۷۶ء

[2] ۱۰ جون ۷۶ء

اس خطاب پر خفا نہ ہوں گے بلکہ بہت مسرور ہوں گے۔ مناسب تو یہ ہی کہ رعایا کی طرف سے ملکہ کو مبارک باد کا پیغام بھیجا جائے"۔

انجمن اسلامیہ کلکتہ چودہ سال سے حکومت کی سرپرستی میں پنپ رہی ہی مسلم جماعت کے سربرآوردہ اشخاص اس کے ارکان ہیں ۲۰ اپریل کو ان کا ایک ڈیپوٹیشن نئے گورنر جنرل کا خیر مقدم کرنے گیا۔ بڑے لاٹ نے یقین دلایا کہ تیں انجمن سے پورا پورا تعاون کروں گا اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے اس کی مساعی کی بڑی تعریف کی۔ انجمن نے کتب خانہ قائم کر کے مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے کی جو کوشش کی ہی اسے بھی سراہا۔ کیوں کہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے مسلمان سرکاری ملازمتوں سے محروم ہو گئے۔ لیکن اب یہ کمی پوری ہوتی جاتی ہی[1]۔

بمبئی کی انجمنِ اسلامیہ ان میں سب سے زیادہ خوش حال ہی۔ یورپ سے سر سالار جنگ کی واپسی پر اس نے انھیں ایڈریس پیش کیا۔ پچاس ارکان موجود تھے جن کی قیادت قمر الدین طیب جی کر رہے تھے۔ سر سالار جنگ نے انجمن کا شکریہ ادا کیا اور اس کے مقاصد سے ہم دردی ظاہر کی۔ ۲۵ اگست کو وہ حیدرآباد روانہ ہوئے۔ وہاں ان کا بڑا شان دار استقبال ہوا[2]۔

لکھنؤ کی انجمنِ اسلامیہ نے اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے اپنا دستور اُردو میں شایع کیا ہی۔

---

[1] پنجابی ۶ مئی ۱۸۷۶ء

[2] Indian Mail ۲۵ ستمبر ۱۸۷۶ء ص ۱۵

کان پور میں انجمن تہذیب کے نام سے مسلمان یتیموں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک ادارہ قائم ہوا ہے۔ ثانوی مقصد مسجدوں کی مرمت اور دیکھ بھال ہے۔ یہ انجمن اب تک کئی مسجدوں کی مرمت کر چکی ہے۔ حکومت نے جن مسلمان یتیموں کو عیسائی مشنریوں کے حوالے کر دیا تھا وہ انجمن کو واپس مل جائیں گے اور ان کی پرورش و تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے گا۔[1]

پنجاب کے لفٹنٹ گورنر اور لاہور کے کمشنر نے ایک ایسی خدمت انجام دی ہے جس سے مسلمان بہت خوش ہیں۔ لاہور کی سنہری مسجد عرصۂ دراز سے شکستہ و غیر آباد کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ عوام نے بارہا حکومت سے اس کی مرمت کی درخواست کی تھی۔ مسجد کے زیرِ سایہ کوئی تیس دکانیں ہیں جن کا پانسو روپے سالانہ کرایہ حکومت کو ملتا ہے۔ لاہور کے باشندوں کی طرف سے حکام کی خدمت میں عرضی گزرانی گئی کہ یہ رقم مسجد کی مرمت میں صرف ہونی چاہیے۔ اب جا کر حکومت نے اس مطالبے پر غور کیا اور امید بندھ چلی ہے کہ یہ ساری رقم مسجد کی حفاظت میں لگائی جائے گی۔[2]

پائنیر کے حوالے سے علی گڑھ اخبار نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد سلطنتِ برطانیہ میں رہتی ہے۔ اکیلے ہندستان میں پانچ کروڑ سے زیادہ مسلمان ہیں۔ تنہا بنگال میں ترکی یا مصر سے

---

[1] پنجابی ۱۱ مارچ ۱۸۷۶ء

[2] اودھ اخبار ۲۵ جنوری ۱۸۷۶ء

زیادہ مسلمانوں کی آبادی ہے۔

لیکن یہ مسلمانوں کی بدنصیبی ہے کہ وہ بہت سے فرقوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ ہندی مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔ سُنّی، شیعہ، وہابی غرض کہ لاتعداد فرقے ہیں۔ یہ غنیمت ہے کہ پڑھے لکھے مسلمانوں میں تعصب نہیں ہے۔ سیّد احمد خاں اپنے کالج میں سب سے برابری کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود پنجاب کی شیعہ جماعت انبالہ میں اپنا اسکول کھولنے کے لیے چندہ جمع کر رہی ہے۔

جس طرح عرصۂ دراز سے عیسائیوں میں فرقہ بندی کے خلاف سمجھ دار لوگ جد وجہد کر رہے ہیں، مسلمانوں میں بھی شیرازہ بندی کی تحریک جاری ہے۔ اُلفت حسین دہلوی نے سنّی و شیعہ جماعتوں میں اتحاد کی ضرورت پر پنجابی[1] میں ایک مضمون لکھا ہے: "پیغمبروں کے رفیقوں یا بیویوں کا ذکر احترام سے کرنا چاہیے اور کسی اسلامی فرقے کے متعلق توہین آمیز الفاظ استعمال نہ کرنے چاہییں۔ بور، توتے وغیرہ مکروہ جانوروں کو نہ کھانا چاہیے۔ اگر کوئی بدعت نہ ہوتی ہو تو محرم میں شرکت کرنے میں ہرج نہیں۔ آں حضرتؐ کی ولادت اور وفات منانا سب مسلمانوں کا یکساں فرض ہے۔ امامت کا مسئلہ ایسا نہیں کہ اسے نزاع کا موضوع بنایا جائے۔ غرض یہ کہ ہر فرقے کو رواداری برتنا اور دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا چاہیے۔ اگر سُنّی اپنی پگڑی سمیت دفن ہونا چاہیں تو مضائقہ نہیں، لیکن قرآن قبر میں رکھنے کی رسم قابلِ ملامت ہے۔ ہم سب کی یہی خواہش

---

[1] ۱۷ جون ۱۸۶۶ء

اور کوشش ہو کہ ملّتِ اسلامیہ میں اتحاد ہو اور منافقوں کا مُنھ کالا ہو۔"

اس کے باوجود حیدرآباد میں سُنّی اور شیعہ جماعتوں میں خون خرابا ہو گیا۔ سر سالار جنگ نے اس کے بعد فیصلہ کیا کہ ہنگامہ پرور پٹھانوں کو ریاست سے نکال دیا جائے۔ ان کی تعداد دس ہزار ہو اور یہ سنّی العقیدہ ہیں۔

ہندستان میں اسلام کی ترقی کی باڑھ رُکی نہیں۔ کہا جاتا ہو کہ عام طور پر مرد اپنا مذہب بدلتے ہیں، عورتیں راسخ العقیدہ ہوتی ہیں۔ لیکن سندھ میں الٹی گنگا بہ نکلی۔ وہاں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہو[1]

کٹیار کے ایک نوعمر ہندو نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بھائی بندوں نے اس کے استاد پر استغاثہ دائر کیا لیکن جب انھیں تین ہزار کی تھیلی مل گئی تو وہ چپکے بیٹھ رہے۔

پچھلے سال مَیں نے اندازہ لگایا تھا کہ اخبار پنجابی کی یہ اطلاع کہ انگریزی میں اسلام کی موافقت میں کتابیں لکھی جا رہی ہیں، ہو نہ ہو مسٹر اسمتھ کی تصنیف "محمدؐ اور اسلام" سے متعلق ہو۔ میرے قیاس کی تصدیق اودھ اخبار کے ایک مضمون سے ہوتی ہو[2] جس کا عنوان "مسلمانوں کو مژدہ" ہو۔ اس میں ڈبلن یونی ورسٹی کے فاضل پروفیسر میر اولاد علی کا ایک خط درج ہو جو انھوں نے منشی نول کشور مالک اودھ اخبار کو تحریر کیا تھا۔ میر صاحب نے

---

[1] Indian Mail ۱۴ مارچ ۱۸۷۶ء

[2] ۲۲ دسمبر ۱۸۷۵ء

لکھا ہو کہ انگریز عالم وقتاً فوقتاً اسلام کی تائید میں جو کچھ لکھا کرتے ہیں، اس میں مسٹر بوسورتھ اسمتھ کی ایک کتاب کو خاص امتیاز حاصل ہی۔ جس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ لیکن اہلِ ہند اب تک اس تصنیف سے ناآشنا ہیں۔ اس لیے میراولادعلی نے اسے اُردو میں منتقل کرنے کا ارادہ کیا ہی۔ یہ پہلے اودھ اخبار میں جستہ جستہ شایع ہوگی اور بعد ازاں کتابی صورت میں۔ اپنے نوٹ میں ایڈیٹر نے لکھا ہی کہ "گو کہ یہ سچ ہی کہ غیر مذہب والے ہمارے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں، وہ زیادہ قابلِ اعتنا نہیں۔ تاہم جب کوئی فرنگی تعصب کی عینک اتار کر انصاف سے ہمارے دین کا مطالعہ کرتا ہی تو ہمارا خوش ہونا فطری ہی۔ کیا اچھا ہو کہ ہندستان کے انگریزی اخبار بھی رواداری کی روش اختیار کرلیں تاکہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں اتحاد کا امکان پیدا ہو جائے"۔ اب میں سید اولادعلی کے مکتوب کا خلاصہ درج کرتا ہوں: "ہندو دھرم سے آپ کو جتنا بھی اُنس ہو، بجا ہی۔ لیکن آپ نے عربی، فارسی اور اُردو میں کتابیں چھاپ کر اہلِ ملک کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً بڑا فائدہ پہنچایا ہی۔ آپ کی رواداری کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہوسکتا ہی کہ آپ نے قرآن اور حدیثوں کے نئے ایڈیشن شایع کیے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر میں مسٹر اسمتھ کی ایک قابلِ قدر کتاب کے بعض حصے آپ کے اخبار میں اشاعت کی غرض سے بھیج رہا ہوں۔ جب ترجمہ ختم ہو جائے گا تو مصنف کی اجازت حاصل کرکے اسے کتابی صورت میں چھاپنے کا انتظام کیا جائے گا۔ ہندو اور مسلمان صدیوں سے ایک دیس میں بستے ہیں اور ان میں

بھائیوں کا سامیل جول ہے۔ جب کوئی غیر ان کے مذہب پر منصفانہ نقطۂ نگاہ سے کچھ لکھتا ہے تو دونوں توجہ سے اسے پڑھتے ہیں۔ 'محمدؐ اور اسلام' کے نام سے لندن اور امریکہ میں جو کتاب شایع ہوئی ہے، اس کا بڑا چرچا ہوا ہے اور یورپ و امریکہ کے اخباروں نے اس کی تعریف کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اخبار عالم، پنجابی اور دیگر ممتاز اخبار میرے ترجمے کو نقل کریں گے اور شاید عیسائی جرائد بھی اس سے دریغ نہ کریں۔

مسٹر اسمتھ نے اپنی کتاب کو چار حصّوں میں تقسیم کیا ہے: تمہید، سیرتِ محمدؐ، اسلام، اسلام اور عیسائیت۔ انگریزی کے تمام چھوٹے بڑے اخباروں نے مصنّف کی معلومات، صاف گوئی اور اندازِ تحریر کی جی کھول کر تعریف کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے مسلمان بھائیوں اور نیک نیت ہندستانی عیسائیوں سے اس کتاب کو روشناس کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ میرا منشا یہ بھی ہے کہ سر ولیم میور اس کتاب سے آشنا ہوں. کیوں کہ ہمارے مصنّف نے جگہ جگہ ان کے اعتراضوں کا جواب بھی دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تیرہ سو سال بعد ایک عیسائی مصنّف پیدا ہوا جس نے انصاف کا دامن پکڑا ورنہ ہمارے خلاف کتنا زہر نہ اگلا جا چکا ہے"۔

اس کے بعد میر اولاد علی نے مختلف انگریزی اخباروں کے تبصروں کا ترجمہ دیا ہے جن میں مسٹر اسمتھ کی کتاب کو سراہا گیا ہے۔ وہ چاہتے تو کئی فرانسیسی اخباروں کی راے بھی نقل کرسکتے تھے۔ میں نے ایک موقعہ پر اس کتاب کے حق میں راے دی ہے۔

آخر میں چل کر میر صاحب نے لکھا ہی کہ: "مصنف کا اصل مقصد دینِ اسلام کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرنا ہی اور یہ کام انھوں نے بڑی دلیری سے انجام دیا ہی۔ دنیا کا پانچواں حصہ جس مذہب کو مانتا ہو اور جس کے ماننے والے کروڑوں آدمی برطانیہ کے زیر سایہ رہتے ہوں اس کی صحیح نمایندگی ازبس ضروری تھی اور مسٹر سمتھ نے بڑی قابلیت سے یہ فرض ادا کیا ہی۔"

گو کہ میر صاحب کو کہیں کہیں مسٹر سمتھ سے اختلاف ہی، لیکن انھوں نے بلا تکلف ہندستان کے تمام انگریز افسروں اور بالخصوص پادریوں کو اس کے مطالعے کا مشورہ دیا ہی۔ "محمدؐ نے رسول اللہ ہونے کا دعوا کیا اور اس دعوے کو ثابت بھی کیا۔ خدا کے ایک ہونے پر عیسائیوں کو بھی ایمان ہی۔ اگر وہ محمدؐ کو خدا کا رسول مان لیں تو ان میں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہ رہے۔ اس معاملے میں انھیں مسٹر سمتھ کی پیروی کرنی چاہیے۔"

نیویارک یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈریپر نے اپنی کتاب 'سائنس اور مذہب کی کش مکش' میں پیغمبرِ اسلام کی بڑی تعریف کی ہی۔ وہ تو یہ بھی کہنے سے نہ چوکے کہ دنیا کو وحدت کا پیغام اسلام نے سنایا۔ یہ بات تو یاد رکھنے کی ہی کہ مسٹر ڈریپر مذہب کے معاملے میں آزاد خیال ہیں اور عیسائیت پر جا و بے جا اعتراض کر جاتے ہیں۔

'ظفر جلیل' نامی عربی کتاب کا اردو ترجمہ بمبئی سے شایع ہوا ہی۔ کتاب مبلغوں کے مطلب کی ہی اور اس کا ترجمہ قطب الدین دہلوی

نے کیا ہے۔ لکھنؤ سے عیسائیت کی رد میں ایک رسالہ بہ قلم محمد رکن الدین صاحب شائع ہوا ہے۔ اس کا نام 'اصولِ بطلانِ مذہب عیسیٰ' ہے۔

رُوس کے ایک جریدے نے لکھا ہے کہ ایشیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمانوں کی جدوجہد جاری ہے۔ یہ سُن کر اُن جوشیلے عیسائیوں کو یقیناً مایوسی ہوگی جو اسلام کی فنا کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ یہ تحریک مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا ثبوت ہے۔ صرف ترکی ہی نہیں بلکہ بخارا، کاشغر وغیرہ ہر طرف اس کی ہوا چل رہی ہے۔ چین کے مسلمان چینی حکومت کا جُوا اتار پھینکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوتے ہیں[1]۔ دُور دراز کے صوبوں میں وہ ایک نئی بغاوت کی تیاری کر رہے ہیں جس میں غیر مسلم قبیلے بھی ان سے تعاون کریں گے۔ اکیلے 'تن کن' کے شہر میں پچاس ہزار چینی مسلمان اور کم از کم دس مسجدیں ہیں[2]۔ ہندستان میں بھی انھوں نے بڑا رعب جما رکھا ہے اور حکومت سے ہر قسم کی رعایتیں وصول کر لیتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر طرف ان میں بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے اور اس میں یورپینوں سے نفرت کا شائبہ ضرور شامل ہے۔

والیِ کاشغر یعقوب خاں نے مومین کے گورنر کے بھانجے کی تجہیز و تکفین بڑے اہتمام سے کی۔ وہ تیس سرداروں کے ساتھ

---

[1] پنجابی ۱۲ جولائی ۱۸۶۶ء

[2] اودھ اخبار ۳۰ اپریل ۱۸۶۶ء

مسلمانوں کی آزادی کے لیے لڑتے ہوئے شہید ہوا یعقوب خاں نے چین کے مہاجر مسلمانوں کو پناہ دینے کا بھی وعدہ کیا ہے[۱]

پچھلے سال آغازِ نومبر میں لکھنؤ میں میرزا کلب علی خاں نے انگریزوں اور ہندستانیوں کے ایک شان دار جلسے میں یورپ کی سیاحت کے حالات سنائے۔ وہ ڈیڑھ سال یورپ میں رہ کر ابھی لوٹے ہیں۔ انھوں نے لندن، پیرس اور قسطنطنیہ کے جو دل چسپ حالات بیان کیے انھیں سن کر حاضرین محوِ حیرت رہ گئے۔ میرزا صاحب ان حالات کو قلم بند کر رہے ہیں۔

کلکتہ اور مدراس کے مسلمانوں نے سلطان ترکی خلیفہ عبدالعزیز کی فاتحہ خوانی کی رسم ادا کی۔ اس وقت انھیں معلوم نہ تھا کہ سلطان نے خودکشی کر لی ہے۔ کیوں کہ جب یہ خبر مشتہر ہوئی تو بمبئی کے قاضی نے فاتحہ خوانی کی ممانعت کر دی[۲] وہاں کے مسلمانوں نے مرحوم کی بخشش کی دعا پر اکتفا کیا۔ اس لڑائی میں ہندی مسلمانوں کی ہم دردی ترکی کے ساتھ ہے اور انھوں نے ترکی کی مدد کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ اودھ اخبار نے ان ترکوں کے نام چھاپے ہیں جنھوں نے اپنے جنگی فنڈ میں چندے دیے ہیں۔ ان میں سلطان اور سلطانہ کے نام پیش پیش ہیں جنھوں نے ایک لاکھ اور پچاس ہزار کے گراں قدر عطیے دیے ہیں۔ اخبار نے ہندی مسلمانوں سے اس فیاضی کی پیروی کی

---

۱ Indian Mail ۱۳ جولائی ۱۸۷۶ء

۲ " ۴ فروری ۱۸۷۶ء

اپیل کی ہی۔ بمبئی میں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں ملکہ معظمہ کو ایک عرضی بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ اس میں حکومتِ برطانیہ سے مطالبہ کیا جائے گا کہ سلطنتِ ترکیہ کے حصّے بخرے کی تحریک کی مخالفت کرے۔ اس قسم کے جلسے کلکتہ اور دوسرے شہروں میں بھی ہوتے ہیں۔

اب یہ دیکھنا ہی کہ ہندستان میں اسلام کی ترقی کا کیا حال ہی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہی کہ اپنی حکومت کے دوران میں مسلمانوں کی تعداد اتنی نہیں بڑھی جتنی اس وقت بڑھ رہی ہی۔ اور تو اور یورپین بھی مسلمان ہو رہے ہیں۔ اودھ اخبار اپنی ۲ جون ۱۸۷۶ء کی اشاعت میں لکھتا ہی کہ لندن کے سٹی مجسٹریٹ مسٹر Pradiston نے اسلام پر ایمان لانے کا اعلان کیا ہی۔

دبدبۂ سکندری[1] کی اطلاع ہی کہ ایک سرکاری افسر جو رنگون سے آیا تھا، کالی کٹ میں مسلمان ہو گیا۔

اودھ اخبار لکھتا ہی کہ سہاگ پور میں ایک مسلمان رمضان خاں پادریوں کے جھانسے میں آ کر عیسائی ہو گیا تھا، اب وہ توبہ کر کے دوبارہ مسلمان ہو گیا۔

ایک دوسرے اخبار کی اطلاع ہی کہ لکھنؤ کے مضافات سے ایک آئرش نے مسلمان ہونے کی اجازت مانگی ہی!

لیکن سب سے تعجب خیز خبر یہ ہی کہ شملہ میں ایک نوجوان انگریز ہندو بن گیا اور جوگی ہو کر پہاڑ کے ایک سندر میں تپ جپ

---

[1] ۱۷ جولائی ۱۸۷۶ء

کرنے لگا؟

(۷)

پچھلے سال مَیں نے ہندستان کے پروٹسٹنٹ مشنریوں کے متعلق کچھ عرض کیا تھا۔ اس کے ضمیمے کے طور پر اخبار پاینیر کا حسبِ ذیل اقتباس درج کرتا ہوں: "یسوعی (JESUIT) فرقے نے تبلیغ کے فن میں بڑا کمال پیدا کیا تھا۔ امریکہ، چین اور ہندستان ہر جگہ انھیں کام یابی حاصل ہوئی۔ ان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ جس دیس میں جاتے ہیں وہیں کا بھیس اختیار کر لیتے ہیں اور کافروں کو خوش کرنے کے لیے ان کے رواج بھی عیسائیت میں ضم کر لیتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اپنی تعلیم کو مقبول کرنے کا یہی کارگر طریقہ ہے۔ ان کی رواداری ان پروٹسٹنٹ پادریوں سے بہ ہر حال بہتر ہے جو دوسروں کی قدیم روایتوں کی توہین کرتے ہیں اور اپنے مذہب کو نہایت ترش روئی سے دوسروں کے آگے پیش کرتے ہیں۔

ان کے مقابلے میں زے ویر یا شواز جیسے کام یاب مبلغوں کو دیکھیے۔ ان میں سے ایک ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے جوگیوں کی طرح رہنے لگا اور دوسرے نے نو عیسائیوں میں ذات پات کا چلن چلنے دیا۔ دونوں کی یہی کوشش تھی کہ پہلے مریدوں کی ذہنی سطح پر جاکر پھر آہستہ آہستہ ان کی اصلاح کریں۔ اسی لیے کئی سمجھ دار پادری اپنی تگ و دو کو پہلے ترویج تعلیم تک محدود رکھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھ گئے ہیں کہ گو کہ ہندو دھرم

۵؎ علی گڑھ اخبار ۴ اگست ۱۸۶۶ء

بے کار اوہام کا طومار رہی، تاہم یہ اوہام سماج میں اس طرح گھس بیٹھ گئے ہیں کہ یک بہ یک ان کی بیخ کنی نہیں کی جاسکتی۔ سب سے پہلے سماج سے جہالت کا اندھیرا دُور کرنا چاہیے تاکہ وہ خود ان اوہام کی حقیقت سے واقف ہو سکے۔ اس ماحول میں کوئی بہتر مذہب نہ پنپ سکے گا اور اگر اس کی اشاعت ہوئی بھی تو اس کی شکل ضرور مسخ ہو جائے گی۔ معلّموں کی حیثیت سے پروٹسٹنٹ پادریوں نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ سرکاری مدرسوں سے ان کے اداروں کا مقابلہ کرنے سے صحیح حالت کا پتا نہیں چلتا۔ لیکن گزشتہ تیس سال کی تعلیمی ترقی کا جائزہ لیجیے تو ان کی کارگزاری کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ تعلیمی تحریک کی قیادت سراسر پادریوں نے کی ہے اور یہ مبالغہ نہیں کہ یورپین تہذیب اور تمدن کو ہندستان میں پھیلانے کا سہرا پادریوں کے سر ہے۔ اس کے باوجود ہندو مت پر حملہ کرکے پادریوں نے کوئی کامیابی حاصل نہ کی۔ ان پر یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ ہندستان کے باشندے یورپ کے مذہبی خیالات کو من وعن قبول نہ کریں گے۔ یہ سچ ہے کہ ہندو دھرم موجودہ شکل میں باقی نہ رہے گا، لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ اس کی جگہ عیسائیت نہیں لے سکتی۔ ہندستانی آگے چل کر کسی اپنے مذہب کا سہارا لیں گے جس کی بنیاد آسمان پر نہیں بلکہ زمین پر ہو۔ باخبر نقادوں کی رائے ہے کہ ہندستان کے عیسائی ادب میں آزاد خیالی کا افسوس ناک فقدان ہے۔ وہ قدامت پرستی کے بارسے بوجھل ہے۔ قیاس تھا کہ نو عیسائی شاید اجتہاد اور

تازگیِ خیال کا نمونہ پیش کریں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور ہندستانی کلیسا کی کم مایگی ثابت ہوگئی۔ وہ دن مبارک ہو گا جب ہندستان کے عیسائی ادب میں خود تنقیدی کی شان پیدا ہوگی"۔

یہ سچ ہو کہ کروڑوں رُپیہ خرچ کرکے بھی پروٹسٹنٹ مبلغ ۱۸۷۲ء تک صرف ۳ لاکھ ۱۸ ہزار عیسائی بنا سکے۔ اس کے برعکس رومن کیتھولک اپنی تعداد دس لاکھ سے زیادہ بتاتے ہیں۔ لیکن سرکاری اعدادِ شماری کے مطابق ملک بھر میں نو لاکھ سے زیادہ عیسائی نہ تھے[1]۔ البتہ یہ بات یاد رکھنے کی ہو کہ کیتھولک صدیوں سے ہندستان میں تبلیغ کر رہے ہیں اور پروٹسٹنٹوں کو آئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے۔ اب کیتھولک بھی نئے جوش سے تبلیغ میں لگ گئے ہیں اور پچھلے سال انھوں نے بیس لاکھ رُپے خرچ کیے۔

ہندستان میں پروٹسٹنٹ فرقے کے صرف چار بشپ ہیں لیکن کیتھولک بشپ بیس سے کم نہیں ہیں۔ تقریباً سبھی کیتھولک پادری یورپین ہیں۔ اس کے برعکس پروٹسٹنٹ کلیسا کے ۳۸۰ پادری ہندستانی نو عیسائی تھے۔ گو کہ میں بذاتِ خود کیتھولک ہوں لیکن یہ کہنا پڑتا ہو کہ پائنیر کی اس شکایت میں کچھ حقیقت نہیں ہو کہ پروٹسٹنٹ مبلغوں کی جد و جہد زیادہ کارگر نہیں ہوئی۔ بہرحال نادانستہ طور پر لوگ عیسائیت کے قریب آ رہے ہیں اور اس میں مشن اسکولوں کا بڑا ہاتھ ہو۔ ان کی تعداد ساڑھے تین ہزار

---

[1] Indian Mail ۹ ستمبر ۱۸۷۲ء کے مطابق دیسی عیسائیوں کی گنتی دو لاکھ ۹۶ ہزار سے کسی صورت میں زیادہ نہیں۔

سے کچھ ہی کم ہے۔ اس لیے یہ امید عبث نہیں کہ ہندو جلد راہِ حق کی طرف آجائیں گے۔

بودھ مت اپنی انسانیت پروری کے لحاظ سے عیسائیت کے قریب ہے۔ لیکن غور سے دیکھیے تو اس میں دہریت اور فنا پرستی کے عناصر ہیں۔

لہٰذا اسلام ان دونوں گُم راہ کُن مذاہب سے بہت بہتر ہے۔ وہ وحدت اور سزا وجزا کا قائل ہے اور بہت سی باتوں میں عیسائیت سے قریب ہے۔ اسی لیے وہ اپنے کو دنیا کا واحد دینِ حق سمجھتا اور عیسائیت کو اپنا رقیب گردانتا ہے۔

پادری (Lightfoot) لائٹ فُٹ نے ایک رسالے میں اس خیال کی تردید کی ہے کہ پُرانے زمانے کے عیسائی مبلّغ اب کے مشنریوں کی بہ نسبت زیادہ مستعد ہوتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ Xavier زے ویر نے آن کی آن میں پانچ لاکھ مدراسیوں کو عیسائی بنا لیا۔ لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ وہ زیادہ تر اچھوت تھے، زے ویر کی حمایت والیِ ریاست کر رہے تھے۔ اس نے ذات پات میں کھنڈت ڈالنے کی کوشش نہ کی اور یہ کہ اُدھر مسلمانوں کا عمل دخل نہ تھا۔ جہاں زندگی پر مذہب کی کارفرمائی ہو وہاں عیسائیت جلدی نہیں پھیل سکتی۔ لیکن آج کل کے زمانے میں اعلا طبقے کے ہندو اور مسلمان عیسائیت کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ صرف تعداد بڑھانے سے کیا ہوتا ہے اور اس نظر سے بھی دیکھیے تو سنہ ۱۸۶۱ء میں برما میں ساٹھ ہزار آدمی بہ یک وقت عیسائی ہو گئے۔ مختلف عیسائی فرقوں

کی باہمی رقابت سے کام ضرور بگڑ جاتا ہی۔ یہ بھی ہی کہ ہندستان میں ماحول کے مطابق تبلیغ کا انداز بدل دینا چاہیے۔

انجیل کا پیرایۂ تحریر یک سر مشرقی ہی اور یہ بڑی اچھی بات ہی۔ کیوں کہ ہندستانیوں کو یہ کہنے کا موقع نہیں رہتا کہ "یہ کوئی مغربی یا فرنگی مذہب ہی۔"

دہری (بہار) میں ڈاکٹر راے کو بڑی دھوم دھام سے بپتسما دیا گیا۔ پشاور میں ایک راج پوت عیسیٰؑ کی ملت میں شامل ہوگیا۔ لیکن ہم نے سب سے بڑا معرکہ ایک برہمن کو عیسائی بنا کر سر کیا۔ اس کا نام 'سبرامنیم' ہی اور اس کا شجرۂ نسب تین ہزار سال تک چلا جاتا ہی۔ عیسائی ہوتے ہی اس نے چوٹی اور زنّار کو خیرباد کہا۔

ان واقعات کے ذکر نے بابو گگلیندر (مگیندر ؟) موہن ٹیگور کی یاد دلائی جن کے عیسائی ہونے پر سارے ملک میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ ان کے باپ نے جو ہندووں کے جیّد عالم اور کئی کتابوں کے مصنّف ہوتے ہیں، ان سے قطع تعلق کر لیا۔ پچھلے سال مجھے اس معزّز نو عیسائی اور اس کی دونوں بیٹیوں سے پیرس میں ملنے کا اتّفاق ہؤا۔ خوش قسمتی سے باپ کی وصیت غیر قانونی نکلی اور اس کے انتقال کے بعد بابو صاحب کو بہت بڑی جایداد ورثے میں مل گئی۔ مَیں نے انگریزی میں لکھا ہؤا ان کا ایک رسالہ پڑھا ہی جو لندن سے شایع ہؤا ہی۔ اس میں ان کے ایمانِ راسخ کی جھلک ملتی ہی اور اس امید کا اظہار نظر آتا ہی کہ ہندستان بہت جلد عیسیٰؑ کے نور سے جگ مگا اٹھے گا۔

اس سال بھی مجھے پادری کلارک نے اپنے امرت سر مشن کی سالانہ رپوٹ بھیجی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ چوبیس سال کی اَن تھک محنت کے بعد امرت سر میں جو سکھوں کا مرکز ہے انھوں نے ہندستانی نو عیسائیوں کا ایک مضبوط مرکز قائم کرلیا ہے۔ اس کی شاخیں امرت سر ضلع میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مرکز کے کارکنوں میں چار نو عیسائی پادری بھی ہیں جن میں عماد الدین کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے آگرہ جاکر حال ہی میں اُردو میں عیسائیت کی تبلیغ کی ہے۔

رپوٹ کا آدھا حصہ اُردو میں ہے اور عماد الدین کا لکھا ہوا ہے۔ انھوں نے بھی پادری کلارک کے بیان کی تصدیق کی ہے۔ افسوس کہ اس میں میرے اس شبہے کی تائید نظر آتی ہے کہ مسلمانوں کو عیسائی بنانا ٹیڑھی کھیر ہے اور اگر کوئی اِکّا دُکّا راہِ راست پر آ بھی گیا تو کچھ عرصے بعد پھر اپنی ڈگر پر واپس چلا جاتا ہے لیکن ایک آدھ بندۂ خدا دوبارہ حق کی آواز پر لبیک کہتا ہے۔ اس کی مثال اخبار کوہِ نور کے سابق مدیر میاں عبداللہ نے دی۔ جو لوگ خلوص سے اپنے نئے مذہب پر جمے رہتے ہیں وہ بسا اوقات ترقی کرکے پادری کے مرتبے کو پہنچتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ خال خال ہیں۔ باقی ایسے ہیں جو دل ہی دل میں عیسائی ہیں لیکن علی الاعلان اس کا اقرار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ مثال کے طور پر پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ عربی کے پروفیسر مولوی حسن شاہ کو لیجیے۔ مرتے وقت ان کے تکیے کے نیچے سے انجیل برآمد ہوئی اور بسترِ مرگ پر

انھوں نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی کہ تم کھلم کھلا عیسیٰؑ پر ایمان لے آؤ۔ پادری عماد الدین تقریر اور تحریر کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ کلکتہ کے لاٹ پادری کے آگے انھوں نے اُردو میں خطبہ سنایا تھا۔

بعض نیک بخت سِکھ ایسے بھی ہیں جو عیسائیت کو "گیان" کی معراج سمجھتے ہیں اور پادریوں سے کہتے ہیں کہ یہ اسمِ اعظم ہمیں بھی سکھلا دیجیے لیکن عوام پادریوں کو جادوگر سمجھتے اور ان کی شکل دیکھتے ہیں دوڑ بھاگتے ہیں۔ انھیں رام کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ عام فہم زبان میں کتابیں لکھیں اور مفت تقسیم کریں۔

کچھ ہندوؤں کی تبدیلِ مذہب کی کہانی ازحد دلچسپ ہے۔ کیوں کہ پہلے یہ عیسائیت کے سخت مخالف تھے۔ پھر کچھ ایسا قلبِ ماہیت ہوا کہ راہِ حق کو پہچان لیا۔ عماد الدین کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ نوعیسائیوں کو اپنے خاندان کے دباؤ یا ماں باپ کے آنسوؤں کا مقابلہ کرتے دیکھ کر دل بھر آتا ہے۔

مشن اسکولوں میں بچّوں کو عیسوی مذہب کے اصول نظم میں یاد کرائے جاتے ہیں تاکہ وہ آسانی سے حفظ ہو سکیں۔ علاوہ برایں انھیں حساب، جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ یتیم اور لاوارث بچّوں کے لیے محتاج خانے بھی ہیں۔ غرض یہ کہ امرت سر مشن کا کام ہر لحاظ سے قابلِ ستایش ہے۔ عیسائی عورتیں زنانہ مدرسوں میں جاتی ہیں اور بڑی ہوشیاری سے اپنی بہنوں کو عیسائیت کی طرف راغب کرتی ہیں۔ بمبئی میں ایک میڈیکل مشنری سوسائٹی ہے جس نے بڑا اچھا کام کیا ہے۔[1]

---

[1] Indian Mail - ۱۵ ستمبر ۱۸۶۹ء

پادری کلارک کی عنایت سے مجھے پنجاب کی اُس انجمن کی سالانہ رپوٹ دست یاب ہوتی ہو جس کا مقصد مذہبی کتابوں کی اشاعت ہو۔ پادری صاحب اس کے سکریٹری ہیں۔ رپوٹ میں کئی مشہور ہندو نوعیسائیوں کا ذکر ہو مثلاً پادری چیٹرجی، داؤدسنگھ، چندولال، بابو رادھارکھو۔ لیکن مسلمان صرف ایک ہو —— پادری عمادالدین۔ مَیں انجمن کے مالی معاملات کا ذکر نہ کروں گا۔ اس کی ادبی کارگزاری کا تعلق ہندی اور اُردو دونوں سے ہو۔ سب ملاکر اُردو کی تقریباً سات ہزار کتابیں اور ساڑھے آٹھ ہزار رسالے — اور ہندی کی دو ہزار کتابیں اور ساڑھے چھ سو رسالے فروخت ہوئے۔ رپوٹ کے مرتّب کا بیان ہو کہ پنجاب میں ہندی کا رواج برائے نام ہو۔ اور انجمن آیندہ اس زبان میں کوئی چیز شایع نہ کرے گی۔

پچھلے دنوں جو قابلِ ذکر کتابیں یا رسالے چھپے ہیں، ان کے نام حسبِ ذیل ہیں:۔

سنت چیتو کی حکایت کی شرح۔ حجم ۵۴۰ صفحات

مسیح ابن اللہ —— پادری Vangan کی کتاب کا ترجمہ۔ حجم ۱۵۶ صفحات۔

چند جوانوں کا قصہ۔

جھوٹے اور سچے تعبیرگویوں کا قصہ۔

اس بیان کو مَیں زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ لیکن جو کتابیں زیرِ طبع ہیں ان میں "گیت مالا" کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ پادری Ulman اُلمان نے بڑی محنت سے انگریزی کی حمدوں اور بھجنوں

کا ترجمہ ہندستانی نظم میں کیا ہے۔ اُردو کی بہترین تصنیفات کے صلے میں جو انعامات تقسیم ہوا کرتے ہیں ان میں سے پانچ سو رُپے کا انعام اس کتاب کے مصنف کو ملا ہے۔

'مسیحی القاب' کی تصنیف ایک دوسرے پادری نے کی ہے۔ اسے دوسو کا انعام مرحمت ہوا ہے۔

زیرِ طبع کتابوں Thomas a Kempis کی مشہورِ عالم کتاب Imitation of Christ کا اُردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ Confessions of St. Augustiru بھی اُردو میں منتقل کی جارہی ہے۔

ہندستان میں عیسوی تعلیم کی ترویج کی غرض سے لندن میں جو کمیٹی بنی ہے اس کا سالانہ جلسہ گزشتہ ۷ مئی کو لارڈ Shafts Bury شیفس بری کی صدارت میں ہوا تھا۔ اس میں جو رپوٹ پڑھی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندستانی بچوں کی تعلیم کے لیے ہندستانی معلّم رکھے گئے ہیں اور ان کی مذہبی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ ہندستانی اور دوسری اہم ملکی زبانوں میں کمیٹی کی طرف سے مفید کتابیں شایع کرنے کا انتظام ہے۔ ہندستانی مدرسوں کی تعداد ۱۲۸ اور طلبا کی تعداد آٹھ ہزار سے زیادہ ہے۔ پچھلے سال کمیٹی کی طرف سے ۱۱۶ کتابیں چھپیں اور ان کے پانچ لاکھ نسخے تقسیم کیے گئے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہندستانی کلیسا کو قطعی طور پر ملکی بنا دینا چاہیے۔ اسے کسی غیر ملکی کلیے کے زیرِ نگیں رکھنا مناسب نہیں۔

اخبار پنجابی[1] کے نامہ نگار نے لکھا ہے: " اگلی ۷ مئی کو چاند پور میں

---

[1] ۸ اپریل ۱۸۶۶ء

ایک بہت بڑا میلہ لگے گا جس میں ہندستان کے مختلف مذاہب کے نمایندے جمع ہوں گے اور اپنے اپنے اصول بیان کریں گے۔ اس طرح لوگ دوسروں کے خیالات اور رایوں سے واقف ہوسکیں گے اور اپنے مذہب کا دوسروں سے مقابلہ کرسکیں گے۔ میلے میں بہت سے لوگ جمع ہوں گے اور لین دین کا بازار بھی گرم ہوگا۔ اس میلے میں شرکت سے دینی اور دنیوی دونوں فائدے ہوں گے۔ ہر سال اس قسم کے اجتماع کا انتظام کیا جارہا ہے"۔ اگر میلے میں اس قسم کا مناظرہ ہوا تو عیسائیوں کا سراسر فائدہ ہے۔

پنجابی[1] نے ہندستان کے مختلف مذاہب پر ایک مضمون شایع کیا ہے جو غالباً کسی وہابی کا لکھا ہوا ہے۔ میں اسے یہاں نقل کرتا ہوں: "مذہب بہت بڑی نعمت ہے۔ لامذہب کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے نہ کوئی ایمان۔ اچھا مذہب سکونِ قلب کا باعث ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والوں میں بھلے بُرے سبھی ہوتے ہیں لیکن ان کی کمی اور زیادتی سے بڑا فرق ہوجاتا ہے۔ ہر مذہب کے اصولوں میں حالات کے مطابق تبدیلی ہوا کرتی ہے۔ تحریریں نہیں تو عمل میں یہ تبدیلی ظاہر ہوکر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بانیِ مذہب کا اصل منشا بہت کم سمجھ میں آتا ہے اور عوام سے صرف ایمانِ راسخ کی توقع کی جاتی ہے"۔

اب ہم انصاف سے ہر مذہب کے حسن و قبح کا تجزیہ کرتے ہیں اور اپنی صاف گوئی کے لیے معافی طلب ہیں:

---

[1] ۱۰ جون ۱۸۷۶ء

(۱) سب سے پہلے ہندومت کو لیجیے۔ یہ بہت پُرانا مذہب ہے اور اگر اسے الہامی مذہب سمجھا جائے، تو حیرت کا مقام نہیں۔ لیکن اس کے ماننے والوں کی ریت رواج فرسودہ ہو چکی ہیں۔ کسی زمانے میں منو کے شاستر کا چلن تھا اور اس وقت کے لحاظ سے یہ غنیمت تھا۔ اس دھرم میں رحم و کرم اور نیکی کی تلقین کی گئی ہے۔ دوسرے مذاہب کی بہ نسبت اس میں خدمتِ خلق کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ بایں ہمہ ستی، بیواؤں کی شادی کی ممانعت اور برہمنوں کی فوقیت ـــــ یہ سب قابلِ ملامت رسمیں ہیں۔ جہاں تک بُت پرستی کا تعلق ہے اس کا رواج بعد میں ہوا کیوں کہ ویدوں میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

ہندو دھرم سے بودھ مت نکلا جو اب چین اور برما میں رائج ہے۔ اس نے زندگی کے تحفظ کا سبق دیا اور تشدد کی سخت مذمت کی.

آب و ہوا کے اثر نے اہلِ ہند کو نرم دل اور امن پسند بنایا ہے.

ہندوؤں کا خیال ہے کہ دیس باہر جانا خلافِ مذہب ہے۔

ہندو دھرم کی بنیاد ویدوں پر ہے۔ جو کچھ ویدوں میں نہیں ہے وہ بعد میں جوڑ گیا ہے۔

(۲) یہودی مذہب: ہندستان میں اس کے ماننے والے بہت تھوڑے سے لوگ ہیں۔ یہ الہامی اور قدیم مذہب ہے۔ لیکن اس دور کے یہودی متعصب، علاحدگی پسند اور قدامت پرست ہیں۔ ان میں آزادی کی خواہش نام کو بھی نہیں ہوتی۔

(۳) عیسائیت: اس میں بھی خاصا تصرّف ہوا ہے۔ اس کے دو بڑے فرقے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ہیں۔ عیسائی صلیب اور تثلیث

کے پجاری ہیں۔ ایک فرقہ وحدت پرستوں کا بھی ہے جو عیسیٰ کو رسول مانتے ہیں، ابن اللہ نہیں مانتے۔ یہ فرقہ اسلام سے بہت قریب ہے۔ اسی وجہ سے متعصب عیسائی اسے اسلام دوستی کا طعنہ دیتے ہیں۔ عام طور پر عیسائی اپنے مذہب کے اصولوں پر عمل نہیں کرتے۔ ان کے ایمان کی بنیاد عقل اور عمل ہے۔ اصولاً ان کی بہت سی باتیں صحیح ہیں، لیکن اب ان کی ملت میں لامذہبیت کا عمل دخل ہوتا جاتا ہے۔

(۴) اسلام: شیعہ اور سنیوں میں بنیادی فرق ہے۔ اس کی اصل تو کچھ نہیں لیکن بعد میں تعصب کی وجہ سے یہ خلیج وسیع ہوتی گئی۔ اسلام نے ساری دنیا میں اُجالا کر دیا تھا لیکن اس کے پیروں نے تن آسانی اور لاپروائی کی وجہ سے اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ اسلام کا سنگِ بنیاد وحدت کے اصول پر رکھا گیا ہے۔ لیکن مسلمان نہ قرآن سمجھتے ہیں اور نہ اس کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔ وہ حدیث اور امامت کے جھگڑوں میں پھنس کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔

ان میں زیادہ تعداد سنیوں کی ہے۔ یہ بھی دو حصّوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو پُرانے اماموں کو مانتے ہیں اور دوسرے 'وہابی' جو اللہ اور قرآن کے سوا کسی کے قائل نہیں وہابی تعداد میں کم ہیں لیکن اصول اور عمل کے سچے ہیں۔ البتہ یہ یہودیوں کی طرح مذہب میں ظاہرداری کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ بہرحال ان کا مستقبل روشن ہے۔ شیعہ مذہب تنزل اور پستی کی حالت میں ہے۔

(۵) تصوّف: اس کے ماننے والے سبھی ملّتوں میں ملیں گے۔ یہ روحانی تہذیب کے قائل ہیں اور ان میں مذہبی تعصب کا شائبہ

بھی نہیں ہوتا۔

یہ سچ ہو کہ اس وقت مسلمان ذلیل وخوار ہیں۔ لیکن اس کے برعکس قرآن کی تعلیم انسان کو بہتری اور بلندی کی طرف لے جاتی ہو۔ یوں تو ہر بانیِ مذہب کے بعد تفرقے کا بیج پڑجاتا ہو۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد عیسوی مذہب کی یہی حالت ہوئی۔ مسلمانوں میں خلافتِ راشدہ کے زمانے میں پھوٹ کا بیج پڑ گیا۔ رشک وحسد کا زہر خون آشامی کی شکل میں ہویدا ہوا۔ تیرھویں صدی عیسوی سے مسلمانوں کا زوال شروع ہوگیا۔ لیکن کیوں کہ اسلام کے متعلق قرآن کریم حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہو لہٰذا اس کا شیرازہ منتشر نہ ہوا۔ یہ بدعت ضرور پیدا ہوگئی کہ جن ملکوں میں عربی نہ سمجھی جاتی تھی وہاں مُلّا مذہب کے اجارہ دار بن بیٹھے اور انھوں نے بڑا نقصان پہنچایا۔ اپنے حلوے مانڈے کے لیے انھوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی۔

جب مسلمان حکم راں عیش وعشرت کے بندے بن گئے تو علم کا زوال اور جہالت کا بول بالا شروع ہوا اور اس کے ساتھ جاہل مُلّاؤں اور خود پرست فقیہوں کے دَور کا آغاز ہوا۔

اب قرآن کا مستند ترجمہ اُردو میں شایع ہو چکا ہو اور ہر مسلمان اسے سرمۂ بصیرت بنا سکتا ہو۔ امید ہو کہ اس کے بعد کسی تاویل کی گنجایش نہ رہے گی اور مسلمان مذہبی معاملات میں رُوحانی دلالوں کے محتاج نہ رہیں گے۔ کاش مسلمان اور عیسائی آپس میں بھائی چارے کا رشتہ پیدا کریں اور ان کے اتحاد سے دنیا میں امن وانصاف قائم ہو۔"

(۸)

نومبر ۱۸۶۵ء میں میرحسن کے نواسے اور میرانیس کے بھائی میر مونس کا انتقال ہوگیا[1] اپنے گھرانے کی روایت کے مطابق اپنی شعرو شاعری میں کمال حاصل تھا۔ اس سانحے نے لکھنؤ کو ایک مرتبہ پھر ماتم کدہ بنا دیا۔

اس کے چھینے بھر بعد بمبئی میں مشہور عالم 'جان ولسن' اس جہانِ فانی سے سدھارے۔ تقریباً پچاس سال سے انھوں نے ہندستان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ عین جوانی میں وہ مشنری کی حیثیت سے ہندستان پہنچے اور پارسیوں میں تبلیغ کا کام انجام دینے لگے۔ اس کے لیے انھوں نے ہندستانی سیکھی جو بمبئی میں عام طور پر بولی جاتی ہے۔ ۱۸۳۲ء میں انھوں نے جو اسکول قائم کیا وہ اپنی قسم کا پہلا مدرسہ تھا جو حکومت سے امداد نہ لیتا تھا۔ بعدازاں ولسن صاحب نے گجراتی اور پہلوی میں مہارت حاصل کی۔ ہندو دیومالا کا بھی انھوں نے غائر مطالعہ کیا اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں وہ جو کچھ لکھا کرتے تھے، وہ حد درجہ دل چسپ ہوتا تھا۔ اس سوسائٹی کی شاخِ بمبئی کے وہ آنریری صدر تھے۔ وہ بمبئی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور ان کی یادگار میں شعبۂ فلسفے میں ایک لیکچرر شپ قائم کی گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج تک صوبۂ بمبئی میں کسی مشنری نے اتنی عزت حاصل نہیں کی۔ پارسیوں کے متعلق ان کی تحقیقی کتابیں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ہندوؤں کی ذات پات

---

[1] اودھ اخبار ۱۷ نومبر ۱۸۶۵ء

کے بارے میں ان کی تحقیق کم اہم نہ تھی اور امید ہو کہ ان کے لائق فرزند ان مسودوں کو مرتب کر دیں گے۔ ڈاکٹر ولسن کے جنازے کے ساتھ ہر قوم کے لوگوں کا مجمع تھا اور شاہ زادۂ ویلز کا نمایندہ بھی جلوس کے ہم راہ تھا۔

اسی منحوس مہینے میں مہاراجا دلیپ سنگھ کے آتالیق پنڈت رادھا کشن نے رحلت فرمائی۔ گو وہ سنسکرت کے بہت بڑے پنڈت تھے لیکن اُردو کے بھی مانے ہوے عالم تھے۔ شاعری میں 'مشکر' تخلص کرتے تھے اور اسی نام سے تذکروں میں ان کا ذکر آیا ہو۔

انھی دنوں اُردو کے مشہور شاعر منشی ظہیر الدین خاں ناظر کا انتقال ہو گیا۔ اودھ اخبار نے یہ ماتم افزا خبر چھاپ کر وعدہ کیا ہو کہ کسی آیندہ اشاعت میں ان کی تصانیف کی فہرست درج کرے گا۔

اسی زمانے میں ستر سال کی عمر میں Edward Thornton ایڈورڈ تھارٹن صاحب ہم سے بچھڑ گئے۔ وہ عرصے تک Allen's Indian Mail ایلنز انڈین میل کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ علاوہ بریں ایسٹ انڈیا بورڈ کے سکریٹری بھی تھے۔ سندھ کا گزیٹیر انھوں نے ہی مرتب کیا تھا اور ہندستان میں مشرقی سلطنت کی تاریخ کے مصنف تھے۔ ان کتابوں کی وجہ سے انھوں نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔

اسی دسمبر کے مہینے میں شہرۂ آفاق ماہر مشرقیات 'فرانس جونسن' نے اسّی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ فارسی زبان کی بہترین ڈکشنری انھی کی محنت کا نتیجہ ہو۔ یہ عربی و اُردو کے طلبا کے لیے بھی مفید ہے

افسوس کہ یہ لغت اب نایاب ہو گئی ہے۔ نوجوانی میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کالج واقع ہیلبری میں سنسکرت، بنگالی اور تلگو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ تیس سال تک انھوں نے یہ خدمت انجام دی اور ان کی جگہ پر پروفیسر مونیر ولیم مقرر ہوئے جو اب آکسفورڈ میں سنسکرت کے استاد ہیں۔ وہ بے مثل زبان داں تھے اور انھوں نے حیرت انگیز حافظہ پایا تھا۔ مہابھارت کے انتخاب کے علاوہ انھوں نے سگھدوت اور ہت اپدیش کا سنسکرت سے ترجمہ کیا اور گلستاں کو فارسی سے انگریزی میں منتقل کیا۔

سالِ رواں کی چوتھی جنوری کو پیرس میں موسیے JULE MOHL یولس مُہل کا انتقال ہو گیا۔ موصوف رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری اور صدر رہ چکے تھے۔ گو وہ ہندستانی نہ جانتے تھے لیکن مشرق سے انھیں بے حد محبت تھی اور مشرقی علوم کے متعلق ان کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔

۷ مارچ کو کلکتہ سے بشپ ڈاکٹر ملمین کا یک بہ یک انتقال ہو گیا۔ اپنے سالانہ مقالوں میں کئی بار ان کا ذکر کر چکا ہوں۔ وہ ہندستانی اور بنگالی میں وعظ کہنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ وہ میرے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے اور ان کی رہ نمائی میں عیسائیت نے ہندستانی میں بڑا فروغ حاصل کیا۔ ہندو مسلمان سب ان کی عزت کرتے تھے۔ اپنی مصروفیتوں کے باوجود انھیں ادب سے شغف تھا اور ان کی کتابیں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ بیماری کی حالت میں وہ محض ادائے فرض کے لیے پنجاب کے دورے پر نکل گئے وہیں راولپنڈی میں بیمار ہو کر انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

۱۹ مارچ کو ہندستانی زبان کے مخلص قدردان کرنل چارلس چیزنی اس دنیا سے سدھار گئے۔ ابھی ان کی عمر پچاس سال بھی نہ ہوئی تھی۔ نام ور انگریز سپاہی جنرل چیزنی کے وہ بیٹے تھے اور ان کے بھائی کی لکھی ہوئی 'ہندستانی سیاست' نامی کتاب کا جواب ملنا مشکل ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مرحوم کے انتقالِ پُر ملال پر سارا انگلستان اشک بار ہے۔ فنِ جنگ پر انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں جو وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

یہ غم انگیز داستان ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ کیوں کہ اسی مارچ کے مہینے میں مشہور ادیب سیّد رونق علی ہم سے بچھڑ گئے۔ پہلے بھی کئی بار ان کا نام آچکا ہے۔ شاعری میں وہ 'افسوں' تخلّص کرتے تھے۔ پہلے وہ اودھ اخبار کے شعبۂ ادارت میں تھے۔ بعد ازآں پٹیالہ اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ ہندستانی کے ادبی حلقوں میں ان کی بڑی عزّت تھی۔ ۱۸۶۷ء میں وہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اخبار نویسی کی طرف آنے سے پہلے وہ اُردو اور فارسی میں غزلیں کہا کرتے تھے اور انھیں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اُردو میں وہ شیخ فضل احمد کیفؔ سے اور فارسی میں خواجہ عزیزؔ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ جب منشی نول کشور نے پٹیالہ میں چھاپا خانہ قائم کیا تو منشی رونق علی کو اس کا نگراں بنایا۔ وہاں کے وزیرِ اعظم خلیفہ محمد حسن خاں ان کے قدردان تھے۔ ۱۸۸۰ء میں مہاراجا نے ریاست میں ایک اخبار کی ضرورت محسوس کی۔ اس کی ادارت مرحوم کے سپرد ہوئی اور اخباری برادری نے ان کے قلم کا لوہا مان لیا۔ جب

مہاراجا شاہ زادۂ ویلز سے ملنے کلکتہ گئے تو سید صاحب کو ہم راہ لے گئے۔ وہیں وہ بیمار ہوئے اور آرام کی غرض سے راستے میں لکھنؤ میں ٹھہر گئے۔ یہ اسی خطے کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ کے تو شیدائی تھے۔ وہیں صرف ۳۸ سال کی عمر میں انھوں نے رحلت کی۔ ان کے بھائی منشی محمد علی اب پٹیالہ گزٹ کے مدیر مقرر ہوئے ہیں۔[1]

اس کے مہینے بھر بعد ہی مہاراجا پٹیالہ اس دنیا سے سدھار گئے۔ ہندستانی اخباروں نے ان کی سخاوت اور فیاضی کو بہت سراہا ہے۔[2] ان کی عمر اس وقت صرف ۲۴ سال تھی۔ وہ اسکول کے طلبا کو انعام دے کر لوٹے تھے کہ یک بہ یک بیمار ہو گئے اور آن کی آن میں اجل نے انھیں آ لیا۔ اتفاق سے حکومت پنجاب کے سکریٹری ان دنوں پٹیالہ ہی میں تھے۔ انھوں نے وزیر اعظم خلیفہ محمد حسین سے کہا کہ کیوں کہ ولی عہد ابھی طفلِ مکتب ہیں لہٰذا سارا راج کاج انھی کے ذمے ہوگا۔[3] ان کی لاش ہردوار پہنچائی گئی جہاں وہ گنگا میں ٹھنڈی کی جائے گی۔ علی گڑھ اخبار نے اس جواں مرگ حاکم کی تعریف میں مضمون لکھا ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید کی طرح یہ راجا بھیس بدل کر رات کو شہر کا گشت لگاتا اور لوگوں کا حال معلوم کرتا تھا۔ کئی لوگوں کو یہ چلن پسند نہ تھا کیوں کہ کسی رئیس کا عوام سے ملنا اس کے شایانِ شان

---

[1] اودھ اخبار ۲ و ۹ اپریل ۱۸۷۶ء

[2] پنجابی ۹ اپریل ۱۸۷۶ء

[3] علی گڑھ اخبار ۵ مئی ۱۸۷۶ء

نہیں سمجھا جاتا لیکن حقیقت میں وہ اپنی رعایا کے محسن تھے۔

گزشتہ مئی میں شہرہ آفاق عالم سنسکرت Christian Lassen کرسچین لے سن کا انتقال ہوگیا۔ وہ ناروے کے رہنے والے تھے لیکن جرمنی میں رہ گئے تھے اور وہاں کی بون یونی ورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے۔ جرمنی نے سنسکرت لسانیات میں جو نام پیدا کیا، اس کی ابتدا اسی عالم سے ہوئی۔ پراکرت گرامر کے مؤلف کی حیثیت سے انھوں نے خاص شہرت حاصل کی۔

۳ جون کو سوئٹزر لینڈ میں رگاٹز کے مقام پر ڈاکٹر مارٹن ہوگ کا انتقال ہوا۔ ۱۸۵۹ء سے لے کر ۱۸۶۵ء تک وہ پونہ میں سنسکرت کے پروفیسر تھے اور وہاں انھوں نے پہلوی زبان کا غائر مطالعہ کیا۔ اس پر انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن پر میں تبصرہ کرچکا ہوں۔ سنسکرت کے علاوہ ہندستانی سے بھی انھیں خاص لگاؤ تھا۔ اسلام پر بھی ان کی ایک کتاب ہے جو حکومتِ بمبئی کے ایما پر آج سے چھ سال پہلے چھپی تھی۔ یورپ لوٹنے کے بعد وہ میونخ یونی ورسٹی میں سنسکرت اور پہلوی کے اُستاد مقرر ہوئے۔

۲۵ جولائی کو نام ور ماہر ہند 'رابرٹ چلڈرس'، نے صرف ۳۸ سال کی عمر میں رحلت کی۔ سنگلی اور پالی زبانوں پر انھیں کامل عبور حاصل تھا۔ انڈیا آفس لائبریری میں قدیم علمی کتابوں کی حفاظت ان کے ذمے تھی۔ افسوس کہ ایسا ہونہار عالم عین جوانی میں اس دنیا سے اٹھ گیا۔

۱۰ اگست کو انگلستان میں عربی زبان کے مشہور عالم ایڈورڈ ولیم لین ۷۵ سال کی عمر میں مرگئے۔ عربی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے وہ عرصۂ دراز تک مصر میں رہے۔ اسی وجہ سے ان کا لب و لہجہ اتنا شستہ تھا کہ عربوں کو حیرت ہوتی تھی۔ ان کا 'الف لیلہ' کا ترجمہ مستند ہی اور مصر کے آداب و رسوم پر ان کی کتاب نہایت پُرلطف ہی۔ لیکن ان کا اصل کارنامہ جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ عربی فارسی لغت ہی۔ اس کی پانچ جلدیں چھپ چکی ہیں، چھٹی جلد زیرِ طبع ہی۔ اور آخری دونوں جلدوں کے مستودے تیار رہیں۔ وہ مخلص عیسائی تھے لیکن مسلمانوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ عبرانی سے واقف تھے، لہٰذا اصل زبان میں انجیل کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔

یکم ستمبر کو اخبارِ عالم میرٹھ کے مدیر و مالک میرزا محمد وجاہت علی خاں اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔ ہندستانی اخبارنویسوں میں انھیں ایک خاص مرتبہ حاصل تھا۔ وہ میرے مہربان تھے اور بہت عرصے سے اپنا اخبار مجھے بھیجتے تھے۔ ان کی صاف گوئی اور رواداری کی میں دل سے قدر کرتا تھا۔ اس امر کا بھی افسوس ہی کہ ان کے بعد اخبار اور چھاپے خانے کا چلنا مشکل معلوم ہوتا ہی کیوں کہ ان کے اکلوتے بیٹے کی عمر صرف چار سال ہی۔

کن کن کا ذکر کیا جائے۔ ایسے کتنے ہی جگر خراش واقعات ہیں۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں!

ہندستانی زبان و ادب ۱۸۷۷ء میں

پچھلے سال ہندستان پر دو مصائبِ عظیم نازل ہوئے۔ ایک تو وہ خطرانگیز طوفان جس نے ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کو شکارِ اجل بناکر دم لیا۔ دوسرے وہ قحط جس نے لاکھوں آدمیوں کو بھوکا مار ڈالا۔ یہ سانحہ حیرت انگیز ہے کیوں کہ ہندستان میں تجارت و آمد و رفت کی آزادی ہے اور دوسرے ملکوں سے اس کا براہِ راست تعلق ہے لیکن سالِ رواں کی یکم جنوری کو جو شان دار دربار دلّی میں اس غرض سے منعقد ہوا کہ ملکہ کے 'قیصرِ ہند' کا لقب اختیار کرنے کا اعلان کرے۔ اس نے اس دُکھ بیتی کی یاد بُھلا دی۔

دربار کے وقت شادمانی و جلسہ جلوس کا وہ غلغلہ رہا کہ کسی کو ان مصائب کا خیال بھی نہ آیا۔ اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو جشن اور جلوس سے اتنی رغبت نہیں جتنی ہندستانیوں کو۔ آج سے تین ہزار سال پہلے دلّی میں اسی قسم کا دربار ہوا تھا جس کی داستان 'بنگال ایشیاٹک سوسائٹی' کے رسالے میں بابو راجیندرلال مترا نے لکھی ہے۔ اسی موقع پر سر کول بروک نے 'رائل ایشیاٹک سوسائٹی' کے رسالے میں 'شاہی القاب' پر ایک عالمانہ مضمون لکھا ہے جو ہر جگہ دل چسپی سے

پڑھا جائے گا۔

شاہی اعلان کے متعلق میں زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کیوں کہ تمام اخباروں نے اس پر رائے زنی کی ہے۔ مغلوں کی پرانی راج دھانی میں بڑے کرّ وفر سے یہ اعلان سنایا گیا اور ہندستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں یہ تقریب دھوم دھام سے منائی گئی۔ کلکتہ میں جو انگریزوں کی راج دھانی ہے، یہ اعلان انگریزی، ہندستانی اور بنگالی میں مشتہر کیا گیا کیوں کہ بنگال میں ان تینوں زبانوں کا چلن ہے۔ کلکتہ کے باشندوں کی طرف سے جو ایڈریس ملکۂ معظمہ کی خدمت میں بھیجا گیا وہ بھی انھی تینوں زبانوں میں لکھا ہوا تھا۔

اخبارِ انجمنِ پنجاب کا بیان ہے کہ آیندہ ملکہ کے تمام احکام میں 'قیصرِ ہند' کا لقب درج ہوگا۔ دلّی دربار میں جو اسناد تقسیم ہوئی ہیں، ان میں بھی انگریزی و اُردو میں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ لفظ 'قیصر' 'سیزر' سے نکلا ہے۔ لیکن اسے یک سر یورپین نہ سمجھنا چاہیے گو کہ یہ روم کے بادشاہوں کا خطاب تھا۔ مشرقی زبانوں میں بھی اس کا چلن ہے۔ حکیم مومن خاں کی ایک نعت میں لفظ 'قیصر' کا استعمال ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ 'قیصر' کی بہ نسبت 'شہنشاہ' اس ملک میں زیادہ مقبول ہے۔ لیکن اس کا مطلب 'شاہوں کا شاہ' ہے اور ہندستان میں کوئی 'شاہ' نہیں ہے۔ ہندستانی اخباروں نے لکھا تھا کہ سب سے پہلے ہندستانی رئیسوں کو 'بادشاہ' کا خطاب ملے بعد ازاں والیِ انگلستان 'شہنشاہ' کا لقب اختیار کرے۔

لیکن حکومتِ برطانیہ کو یہ تجویز پسند نہ آئی اور اس نے دیسی راجاؤں کی عزت افزائی مناسب نہ سمجھی۔ لہٰذا ملکہ کو شہنشاہ کہنے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

اگر میں دلّی دربار کا حال لکھنے بیٹھوں اور ان مقامی درباروں کا چرچا کروں جو قیصرِ ہند کے اعزاز میں سارے ملک میں ہوئے تو ایک پوری کتاب درکار ہوگی۔ اودھ اخبار نے ۱۲ نومبر ۱۸۷۶ء کو دربار کے انتظام کی اجمالی کیفیت بیان کرنے کے لیے جو ضمیمہ شائع کیا تھا وہ بڑے سائز کے ۳۶ کالم سے کم طولانی نہ تھا۔

شاہی اعلان کے موقع پر کئی اسلامی انجمنوں نے وائس رائے کی خدمت میں ایڈریس پیش کیے۔ ان میں انجمنِ ادب دلّی، انجمنِ پنجاب، انجمنِ اسلام بمبئی اور انجمنِ ادب بنگال قابلِ ذکر ہیں۔ انجمنِ پنجاب کی طرف سے اس کے صدر ڈاکٹر لائیٹنر نے سپاس نامہ گزارا۔ وائس رائے نے جواب میں کہا کہ لاہور یونی ورسٹی سے ہماری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ موجودہ صدر کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو اعزازی ڈگری دے کر ویینا یونی ورسٹی نے سارے ہندستان کی عزت افزائی کی ہے۔

ملکہ کا نیا خطاب سرکاری طور پر اردو میں 'قیصرِ ہند' طے پایا ہے۔ لیکن ہندی میں اس کا ترجمہ 'ہند کا قیصر' کیا گیا ہے جو صریحاً غلط ہے۔ 'ہند کی قیصر' کہا جاتا تو بھی ایک بات تھی۔ شاید اس امر کے پیشِ نظر کہ ولی عہد کبھی نہ کبھی بادشاہ ہوں گے یہ بدعت گوارا کی گئی ہے۔ دربار کے زمانے میں ملکہ کے جو نئے سکّے لٹائے گئے ان میں یہی

لکھا ہؤا تھا۔

یہ خبر خوشی سے سُنی جائے گی کہ اس تقریب میں لارڈ لٹن نے تیموریہ گھرانے کے اُن افراد میں پانچ ہزار رُپے تقسیم کیے جنھیں ماہانہ وظیفہ نہیں ملتا ہے۔ پنجابی نے اس عطیے کا ذکر "دلّی کے شاہی گھرانے پر نگاہِ کرم" کے عنوان سے ایک مضمون میں اس طرح کیا ہے:[1] "اس بدنصیب گھرانے سے حکومت کو زیادہ فیّاضی برتنی چاہیے۔ برما کے مختلف شہروں میں شاہی خاندان کے بارہ تیرہ افراد ہیں۔ دلّی کے شاہ زادوں کی بہ نسبت انھیں کچھ زیادہ مل جاتا ہے۔ لیکن برما جیسے اجنبی ملک میں ۲۵ رُپے پر گزر اوقات کرنا بھلا کس طرح ممکن ہے۔ سب سے زیادہ پنشن شاہ زادہ جواں بخت کو ملتی تھی[2] انھیں ساڑھے تین سو اور ان کی والدہ اور بیوی کو ڈھائی ڈھائی سو ملتے تھے۔ سات آٹھ سال پہلے کی بہ نسبت ان سے بہرحال بہتر سلوک کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں تو یہ بے چارے ایک کال کوٹھری میں بند رکھے جاتے تھے[3]" اُدھر میرزا الٰہی بخش کی پنشن میں ڈھائی سو رُپے سالانہ کا اضافہ ہوگیا ہے۔

سالِ رواں کی ۸ جنوری کو وائس رائے ہند لارڈ لٹن نے علی گڑھ کالج کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ علی گڑھ اخبار نے اس

---

[1] ۹ جون ۱۸۷۷ء [2] علی گڑھ اخبار (۲۰ اکتوبر ۱۸۷۷ء) کا بیان ہے کہ میرزا جواں بخت کی صاحب زادی کی شادی شاہ زادہ حسن سے ہوتی ہے۔ شادی کے اخراجات کے لیے حکومت نے دس ہزار رُپے دیے۔

[3] رنگون گزٹ کے حوالے سے انڈین میل میں بہ تاریخ ۲۹ جنوری ۱۸۷۷ء

تقریب کی پوری تفصیل شایع کی ہی اور وہ تقریریں بھی نقل کی ہیں جو ہندستانی اور انگریزی میں ہوئی تھیں۔[1] مجلسِ انتظامیہ کی طرف سے جو سپاس نامہ پڑھا گیا اس میں کالج کی تحریک پر حکومت کے لطف وکرم کا شکریہ ادا کیا گیا۔ اس پر مجلس کے صدر لطف علی خاں اور سکریٹری سید احمد خاں کے دست خط تھے۔ سپاس نامے میں سابق گورنر جنرل لارڈ نارتھ بروک، سر ولیم میور اور سر جان اسٹریچی کا خاص طور پر ذکر تھا۔ اُن انگریزوں کا بھی شکریہ ادا کیا گیا تھا جنھوں نے انگلستان میں کالج کے لیے چندہ جمع کیا۔ ان میں لارڈ اسٹینلے کا نام کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اب ذرا اس مضمون کی داد دیجیے جو "سالِ نو" کے عنوان سے پنجابی نے چھاپا ہی:[2] لاکھ لاکھ شکر ہی اس خدائے پاک کا جس نے پچھلے سال ہم پر اپنی رحمت کا سایہ کیا اور ہمیں جملہ آفات سے محفوظ رکھا۔ اس پروردگار کی مدد شاملِ حال نہ ہو تو زندگی کا کیا بھروسا۔ یہ تو راستے کا چراغ ہی جسے ہر طرف سے ہوا لگتی رہتی ہی، معلوم نہیں کون سا جھونکا کب اسے بجھا دے۔ اس کے آنی جانی ہونے ہونے میں بھلا کسے شک ہو سکتا ہی۔ ہمارے سامنے کتنوں کے چراغِ زندگانی گل ہو جاتے ہیں پھر بھی ہماری آنکھ نہیں کھلتی اور ہم مرتے مرتے بھی زندگی کو یاد کرتے ہیں لیکن کسی فرصت کے لمحے میں جب ہم اپنے نیک و بد کا حساب کرتے ہیں تو چپکے سے یہ مان لینا پڑتا ہی کہ اللہ کے دربار میں ہم خالی ہاتھ جا رہے ہیں۔

---

[1] ۱۲ جنوری ۱۸۷۷ء [2] ۸ جنوری ۱۸۷۷ء

اگر ہم چاہتے تو قلمے، درمے، سخنے خلقت کا بھلا کر سکتے تھے۔ ہماری زندگی منتہا یہی ہے کہ دنیا کو بہتر بنا جائیں۔ ہماری کوشش کس حد تک کام یاب ہو گی، اس کا فکر فضول ہے۔ عمل نیک ہونا چاہیے اس کا نتیجہ خدا کے ہاتھ ہے۔ خدا کے ایسے بھی نیک بندے ہیں کہ ہمارے اخبار کی مدد کرتے ہیں اور کوئی عوض طلب نہیں کرتے۔ ہم ان کے احسان مند ہیں اور دست بہ دعا ہیں کہ نیا سال ان کے لیے مبارک ثابت ہو۔ اب ہم ایک نظر پچھلے سال پر ڈالتے ہیں۔

سرسری طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۷۶ء میں ہندستان نے کوئی ترقی نہیں کی۔ کوئی ایسا کارخانہ نہ بنا جو اہلِ ملک کے لیے خوش حالی کا باعث ہوتا۔ کسی نے فن یا ہنر میں کمال حاصل نہ کیا جو اس کے لیے نیک نامی پیدا کرتا۔ یوں کہیے کہ ملک اپنی پرانی حالت میں رہا۔ ہمارا خیال ہے کہ کئی سال حالات میں تبدیلی نہ ہو گی۔ ہندستان کے بعض اضلاع قحط کے شکار ہوئے۔ خیریت ہوئی کہ بمبئی اور مدراس کے حاکموں و نظامِ دکن کی کوششوں سے زیادہ نقصان نہ ہونے پایا۔ پنجاب اور شمالی ہند کے دوسرے صوبے اس بلا سے محفوظ رہے۔

آندھیاں اور طوفان تو آتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن پچھلے سال کی آندھی سب سے بڑھ گئی۔ ڈیڑھ لاکھ آدمی جان سے گئے۔ خدا کے سوا ان مصائب سے کون محفوظ ہے۔

وباؤں کا بھی زور رہا اور ہم اب بھی ایسے خستہ حال ہیں کہ معمولی بخاروں سے جان نہیں بچا سکتے۔"

لوگوں کی خواہش ہو کہ جب تک دلّی برطانوی راج کی راج دھانی نہیں ہوتی، کم از کم گرمیوں وائس رائے شملہ کے بدلے وہاں رہیں۔ پنجابی اس ضمن میں لکھتا ہو[1] "بہت غور و خوض کے بعد ہم نے یہ رائے قائم کی ہو کہ دارالسلطنت کے لیے دلّی سے زیادہ کوئی موزوں شہر نہیں...... جب انگریز بڑی ہوشیاری سے ہندستان میں داخل ہوئے تو انھوں نے کلکتہ کے مضبوط قلعے کو اپنا ٹھکانا بنایا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بادشاہت چند روزہ ہوتی تھی اور مسافر سرِ راہ لُٹ جاتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے ایک محفوظ مقام ڈھونڈ نکالا جسے آسانی سے قلعہ بند کیا جا سکتا تھا۔ پھر وہ سمندر کے کنارے بھی تھا اور وہاں جہاز آ جا سکتے تھے اور یورپ سے تعلق رہ سکتا تھا۔ جب تک مقصد تجارت تھا کلکتہ ایک گودام رہا۔ لیکن جب مقصد ملک رانی قرار پایا، اسے قلعہ بند کر لیا گیا.....

اب ہندستان انگریزوں کے زیرِ حکومت ہو۔ دنیا کے سب ملک اپنے حکم راں کو شہنشاہ کہتے ہیں۔ ہندستان کے راجا نواب فقط ان کے خراج گزار ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی محکومی میں اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ کہ اس کے زیرِ سایہ وہ حفاظت اور سلامتی میں ہیں اور ہرگز اس کی تبدیلی کا خیال دل میں نہیں لا سکتے۔ جب یہ سب ہو تو راج دھانی بھی دلّی میں ہونی چاہیے۔ کلکتہ بالکل ہٹ کر ہو اور ریل اور تار نے اب اتنی آسانی پیدا کر دی ہو کہ کلکتے کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہی۔ یوں بھی کلکتہ کا نام ہی

[1] ۱۰ نومبر ۱۸۷۶ء

نام ہی۔ کیوں کہ چھ مہینے حکومت کا صدر مقام شملہ ہوتا ہی۔ گرمیوں میں پہاڑ پر چڑھ گئے اور جاڑوں میں نیچے اتر آئے۔ غریب منشیوں کی جان اس آ جا سے پریشان ہی۔ جاڑوں میں بھی بڑے لاٹ دؤرے پر نکل جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کلکتہ تجارتی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہی۔ گیس کی روشنی ہی اور نل کا پانی ہی۔ لیکن گرمی کا حد و حساب نہیں اور ہمیشہ وباؤں کا دؤر دؤرہ رہتا ہی۔ مانسون کے دنوں میں ملیریا کا وہ زور ہوتا ہی کہ توبہ۔ بنگالیوں کی رنگت اسی وجہ سے کالی ہو جاتی ہی۔ انگریز بھی وہاں زیادہ عرصے رہنا پسند نہیں کرتے۔ جو وہاں بس جاتے ہیں ان کا رنگ جھلس جاتا ہی، جسم دُبلا پڑ جاتا ہی اور طبیعت میں بودا پن آ جاتا ہی۔ کلکتہ سے لوٹ کر اپنے گھر جاتے ہی ان کے چہرے تندرستی سے چمکنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہی کہ بڑے بڑے سرکاری افسر کلکتہ میں رہنا نہیں چاہتے۔

مشکل یہ ہی کہ تمام رئیسوں کو وائس رائے سے ملنے جانا ہوتا ہی۔ ذرا بمبئی، سندھ یا پنجاب سے کلکتہ کا فاصلہ ملاحظہ فرمائیے۔ اسی لیے وہ لوگ کلکتہ سے کتراتے ہیں۔ کوئی خاص ضرورت ہوئی، تبھی اُدھر کا رُخ کرتے ہیں۔"

اسی موضوع پر پنجابی نے کئی مضمون چھاپے ہیں۔ ان میں سے ایک میں لکھتا ہی: "اہلِ رائے حضرات ایک زبان سے دلّی کو راج دھانی بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لاہور کے انگریزی اخبار سول اینڈ ملیٹری گزٹ نے بھی ہماری تائید کی ہی۔ اس نے کہا

ہو کہ اس تبدیلی سے سراسر حکومت کا فائدہ ہوگا"

ایک طرف تو دلّی کے گن گائے جا رہے ہیں، دوسری طرف دلّی کالج کو پنجاب یونی ورسٹی سے ملحق کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یونی ورسٹی کی اہمیت بڑھانے کے سوا کچھ نہیں[1]۔ عام طور پر اس فیصلے کی مخالفت کی گئی ہے۔ دلّی والوں نے اپنے دل کی بھڑاس نظموں میں نکالی ہے۔ لاہور کے سرکاری چھاپے خانے کے ناظم مولوی محمد سعید نے ایک مخمس میں اور اشرف دہلوی نے ایک ترجیع بند میں اس کا خوب مذاق اڑایا ہے۔

مملکتِ اودھ کو صوبہ جاتِ شمال ومغرب میں شامل کر دیا گیا ہے اور ان کا دارالسلطنت الہ آباد میں قرار پایا ہے۔ کہنے کو اودھ کا صدر مقام اب بھی لکھنؤ رہے گا۔

(۲)

اس سال بھی اُردو اور ہندی میں بے شمار کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

سب سے پہلے میں رامائن کے منتخب حصوں کے انگریزی ترجمے کا ذکر کرتا ہوں[2]۔ ترجمہ مسٹر گراوز نے کیا ہے۔ کتاب کو انھوں نے بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے اور تشریح طلب مقاموں پر نوٹ بھی دیے ہیں۔ امر پرکاش سنگھ نے رامائن کا جو ترجمہ کیا تھا وہ لکھنؤ

---

[1] ۲۶ مارچ ۱۸۷۷ء

[2] مجھے والمیک کی رامائن کے فارسی ترجمے کا خیال آتا ہے جو ۱۸۶۱ء میں آگرہ سے شائع ہوا تھا۔

میں چھپ رہا ہے[۱] یہ سترھویں صدی کے آخری سالوں میں تیار ہوا تھا۔ حسنِ اتفاق کہ مترجم کا اصل نسخہ اب تک محفوظ رہا اور پنڈت مدھو پرشاد کی وساطت سے طباعت کے لیے دست یاب ہوا۔ مرتب کا بیان ہے کہ ترجمہ گو منظوم ہے تاہم اپنی روانی اور بے ساختگی میں بے مثل ہے۔ اصل نسخے کا کاغذ بہت خستہ ہو گیا تھا، اس لیے نقل کی تلاش ہوئی۔ جب کوئی نقل نہ ملی تو بڑی کاوش سے اس واحد نسخے کو درست کیا گیا۔ امید ہے کہ اہلِ ذوق اس کی قدر کریں گے۔

مسٹر گراؤز نے مشہور ہندو بھگت اور شاعر سوامی ہری داس پر ایک دل چسپ مضمون لکھا ہے۔ ان کا ماخذ 'بھگت مال' نامی نایاب کتاب ہے۔ ان کی دو ہندی نظمیں بھی درج کی ہیں جن میں ویشنو اصولوں کی تشریح ہے۔

ڈاکٹر Trumpp آدی گرنتھ کا جو ترجمہ کر رہے تھے اس کا میں کئی مرتبہ ذکر کر چکا ہوں۔ مقامِ مسرت ہے کہ وہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو گیا۔ میں وزیرِ ہند کا ممنون ہوں کہ اس کا ایک نسخہ مجھے عنایت فرمایا۔ یہ آٹھ نو صفحات کی ضخیم کتاب ہے اور جلد دیدہ زیب ہے جو حکومت کے خرچ سے شایع ہوئی ہے۔

پادری Hoernle کی لکھی ہوئی 'پوربی ہندی کی گرامر' بھی چھپ گئی۔ یہ سنسکرت اور ہندی کے شائقوں کے لیے یکساں مفید ثابت ہوگی۔

پادری Warren وارن نے اُردو میں عبرانی زبان کی جو گرامر لکھی ہے وہ چھپ رہی ہے۔ موصوف عبرانی اور اُردو کی جو

[illegible]

ڈکشنری تیار کر رہے تھے وہ نامکمل رہ گئی۔

مجھے امید ہی کہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے چند بردائی کی رزمیہ نظم کو چھاپنے کا ارادہ ترک نہیں کیا ہی۔ سر ہینری الیٹ کے پاس اس کے تین نسخے ہیں۔ ایک کتب فروش سے انھوں نے یہ تینوں جلدیں ۴۲ پونڈ میں خریدی تھیں۔[1]

اودھ اخبار نے 'ہفت روز' نامی مثنوی کا اشتہار چھاپا ہی۔ در اصل اس کا نام 'ہفت پند' (بند) ہونا چاہیے تھا کیوں کہ مثنوی سات حصّوں میں تقسیم ہی اور ہر ایک کا عنوان 'بند' ہی۔ یہ ایک ہونہار شاعر گنج پورہ کے رئیس نواب غلام احمد کا کارنامہ ہی جن کی اخبار نویس نے بڑی تعریف کی ہی۔ انھوں نے شاہزادۂ ویلز کے اعزاز میں یہ مثنوی لکھی تھی اور انھی کے نام معنون کی ہی۔ پہلی پند کاہلی کے خلاف ہی اور مثال کے طور پر ہمایوں کی داستان بیان کی ہی۔ دوسرے میں بُروں کی صحبت کی مذمت ہی اور قطب الدین کی ایک حکایت نظم ہی۔ تیسری بند میں دُور اندیشی کی تلقین ہی اور نیپولین اعظم کا عبرت ناک قصّہ ہی۔ چوتھا باب انصاف کی مدح میں ہی اور اس کے متعلق غیاث الدین بلبن کا نظریہ بیان کیا ہی۔ پانچویں بند میں بادشاہوں کو اعلا ظرفی کی نصیحت کی ہی اور بابر کی مثال دی ہی۔ اس کے بعد حاکم کو رعایا کی محبت کی طرف راغب کرتے ہوئے یونان کے ایک خداترس بادشاہ کا حال سنایا ہی۔ آخری بند جو گویا رعایا کی خوش حالی کا ترانہ ہی۔ ملکۂ معظمہ کی مدح پر ختم ہوتا ہی۔ یوں کہیے کہ یہ نظم صرف زبان و بیان کے لحاظ سے

---

[1] Catalogue of Bernard Quaritch ۲۲ اپریل ۱۸۷۵ء

موثر نہیں۔ بلکہ یہ تاریخی واقعات کا مرقع بھی ہی جس میں حکمت کی چاشنی گھلی ہوئی ہی۔

ہندی کے مشہور مصنف بابو ہرش چندر نے "من مکھ مالا" کے نام سے نظموں کا ایک مجموعہ 'قیصرِ ہند' کی ستایش میں شایع کیا ہی۔ اس میں اُردو کی ایک غزل بھی شامل ہی جس میں بابو صاحب نے 'رسا' تخلص اختیار کیا ہی۔

مسٹر Eastwick ایسٹ وِک بھی اسی قسم کا مجموعہ چھاپنے کے فکر میں ہیں۔ اس کا نام 'قیصر نامۂ ہند' ہوگا۔ اس میں دلی دربار کی تفصیل کے علاوہ اس میں شامل ہونے والے رؤسا کے حالات ان کے شجروں کے ساتھ درج ہوں گے۔

نئی مطبوعات میں سے حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں:۔

بھاگوت پران کا مکمل ترجمہ، از پنڈت پیارے لال۔

تذکرۃ الخلفا منظوم۔ حکیم امانت علی رئیس سہارن پور نے ع۔ بی تاریخوں کو سامنے رکھ کر لکھا ہی۔

اصولِ اخلاق و قوانین: اب تک اُردو میں اس قسم کا رسالہ نہ تھا۔ ۱۸۴۴ء میں میرے دوست مسٹر Boutros بوتروس نے جو دلی کالج کے پرنسپل تھے، انگریزی میں، یہ کتاب لکھی تھی جس کا ترجمہ پنڈت رام کشن نے اُردو میں کیا تھا۔ یہ گئی گزری بات ہوئی کیوں کہ وہ کتاب اب کہیں نہیں ملتی۔ بھلا ہو دیال سنگھ احرت سری کا کہ نظرِ ثانی کے بعد اسے وکیلِ ہندستان کے چھاپے خانے سے دوبارہ شایع کیا۔ اس میں آئین کے اصول اور دیوانی و فوجداری کے قوانین سلجھا کر لکھے گئے ہیں۔ بہ مختصر

امتحانوں میں تو کام آئے گی ہی، ساتھ ساتھ ان ہندستانیوں کے لیے بہت مفید ہوگی جو انگریزی نہیں جانتے۔ پادری رجب علی مہتمم چھاپہ خانہ وکیل ہندستان نے کتاب کا اشتہار دیا ہے۔

قانون ورسوم عدالت ہائے ہند: سات سال بعد یہ کتاب دوبارہ چھپی ہے۔ اس میں نئے قوانین بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ حکومتِ پنجاب کے مترجمِ اعلا محمد لطیف صاحب نے اس کا ترجمہ اُردو میں کیا ہے۔ کتاب کا حجم پہلے اڈیشن کی بہ نسبت دُگنا ہے۔

احسن التواریخ: یہ دراصل صوبۂ اودھ کی تاریخ ہے۔

اُردو اخباروں نے اعلان کیا ہے کہ میرزا دبیر کے مرثیوں کا مجموعہ دو جلدوں میں لکھنؤ سے شایع ہوا ہے۔ اسی طرح میر انیس کے مرثیے بھی دو جلدوں میں جمع کر دیے گئے ہیں[1]

مولوی نصرت علی دہلوی نے اپنی تصنیف 'سرابِ عالمِ اسباب' کا ایک نسخہ مجھے بھیجا ہے۔ ان کی اس کتاب کی سارے ملک میں شہرت ہوئی ہے۔ 'مفیدِ عام' کے نام سے ہندستان سے جو واحد عربی اخبار نکلتا ہے، موصوف اس کے اڈیٹر اور دلّی کے نامی پریس 'نصرت المطابع' کے مالک ہیں۔ یہ کتاب بارہ ابواب میں منقسم کی گئی ہے اور ہر ایک میں انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر بحث ہے۔ مثلاً بہادری، فیاضی، سمجھ داری، مروّت وغیرہ۔ ہر باب میں حکایتوں اور روایتوں کی رنگ آمیزی ہے۔ اسے ایک قسم کا پندنامہ سمجھنا چاہیے۔

اسی سال اودھ اخبار کے چھاپے خانے سے 'لطائف اللغات'

---

[1] اودھ اخبار ۱۵ جنوری ۱۸۷۶ء

نامی ڈکشنری شایع ہوئی۔ مثنوی مولانا رومؒ کے الفاظ اور محاورے اس لغت میں یک جا کر دیے گئے ہیں[۱]۔ یہ مولوی عبداللطیف کی محنت کا نتیجہ ہے۔ ان کے والد مولوی کبیر صوبۂ گجرات کے نامی گرامی عالم ہیں اور اسی مثنوی پر ان کی شرح مستند سمجھی جاتی ہے۔

یہ اطلاع آپ کے لیے مسرت بخش ہوگی کہ ڈاکٹر فیلن کی ہندستانی انگریزی ڈکشنری کی طباعت کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کا گیارھواں حصہ ابھی حال ہی میں چھپ کر نکل آیا ہے۔ سب ملاکر ۲۵ حصے ہوں گے۔ ملک بھر کے اخباروں نے بہ یک زبان اس کارنامے کی تعریف کی ہے۔ اودھ اخبار نے تو پانچ کالم کا ایک طویل اور سنجیدہ تبصرہ شایع کیا ہے۔

کنج الدقائق: اس میں حنفی مذہب کے اصول ۳۵ ابواب میں بیان کیے گئے ہیں۔ عبداللہ بن محمود کے زورِ قلم کا نتیجہ اور اودھ اخبار پریس سے چھپا ہے۔

دیوانِ ضامن: سید ضامن علی کی غزلوں کی بیاض ہے۔

علی گڑھ اخبار نے لکھا ہے[۲] کہ بوستانِ خیال کی چوتھی جلد شایع ہوگئی ہے۔ پنجابی کا بیان ہے کہ اس داستان کی پانچویں جلد کا ترجمہ تیار ہوچکا ہے۔ اس کے بعد کی دو جلدیں بھی عنقریب اشاعت پزیر ہوں گی۔

شرح قانونِ شہادت: سید احمد خاں کے لائق فرزند سید محمود کی تصنیف ہے۔ مصنفوں اور وکیلوں کے لیے یک ساں مفید ہے۔ گو مضمون دقیق تھا لیکن مصنف نے اسے بہت سلجھا کر بیان کیا ہے۔

---

[۱] اودھ اخبار ۲۰ اپریل ۱۸۷۸ء [۲] ۱۱ مئی ۱۸۷۸ء

صولت افغانی: حاجی محمد زردار خاں کی لکھی ہوئی افغانوں کی تاریخ ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر اب تک کا حال ہے۔ افغانستان کے بادشاہوں اور قبیلوں کے حالات ان کے حسب و نسب کے ساتھ جمع کیے ہیں اور افغانیوں کی روایتی بہادری اور فیاضی کے نمونے بھی دیے ہیں۔ علی گڑھ اخبار نے لکھا ہے[1] کہ اسے پڑھ کر معلوم ہوا کہ ایسے چھوٹے سے ملک نے کیسے کیسے جاں باز اور پہنچے ہوئے بزرگ پیدا کیے ہیں۔" حجم چھ سو صفحات ہے اور زبان بہت صاف ہے۔ کتاب اودھ اخبار کے چھاپے خانے میں طبع ہوئی ہے۔ اب تک افغانستان کی ایسی جامع تاریخ شایع نہ ہوئی تھی۔

'پنجابی' نے دو کتابچوں پر ایک طویل تنقید لکھی ہے۔ یہ حافظ عمر دراز فیض کے لکھے ہوئے ہیں۔ ایک کا نام فیض المعنی اور دوسرے کا فیض البیان ہے۔ دونوں انشا پردازی سے متعلق ہیں اور تنقید نگار کی راے میں ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

تنزیہ الفرقان: اس میں آگرہ کے سید محمد عباس نے پادری عماد الدین کی کتاب 'ہدایت المسلمین' کا جواب دیا ہے۔ فاضل پادری کا دعوا ہے کہ قرآن میں اغلاط زبان و بیان کی سیکڑوں غلطیاں نظر آتیں۔ ان کی فہرست دے کر انھوں نے مسلمان عالموں کو چیلنج دیا تھا کہ ایامِ جہالت کے ادب سے اپنے حق میں ثبوت پیش کریں۔ عماد الدین نے یہ الزام بھی لگایا تھا کہ کئی آیتوں میں تضاد اور تکرار کا عیب ہے اور کئی بے معنی ہیں۔ پیشِ نظر کتاب کا ایک نسخہ مصنف نے مجھے عنایت فرمایا ہے۔ اس میں محمد عباس صاحب نے بڑی محنت سے ایامِ جہالت

---

[1] ۱۰ نومبر ۱۸۶۹ء

کے شعرا کے کلام سے نو عیسائی عالم کی تردید میں اسناد جمع کیے ہیں۔ انھوں نے فرداً فرداً ہر اعتراض کا جواب دیا ہی اور اس میں شک نہیں کہ بڑی عرق ریزی کی ہی۔ سید احمد خاں نے کئی سال پہلے انگریزی زبان میں پیغمبرِ اسلام کے حالات تحریر کیے تھے۔ اب اس کا ترجمہ اُردو میں خطباتِ احمدیہ کے نام سے چھپ رہا ہی۔[1]

میرا خیال ہی کہ یہ سر ولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' کا جواب ہی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی تھی اور اس کا نیا ایڈیشن نکلنے والا ہی۔ سید احمد خاں کا بیان ہی کہ سر ولیم کے تمام ماخذ غیر مستند ہیں۔

سائنس پر اس سال کوئی اہم کتاب دیکھنے میں نہ آئی۔ (Todhunter) ٹاڈھنٹر کی کتاب 'حرکیات و سکونیات' کا ترجمہ پنڈت کرپا رام نے کیا ہی۔ ڈاکٹر چنتین شاہ نے 'آئینۂ سوزاک' کے نام سے ایک طبّی رسالہ لکھا ہی جس کی اخبار پنجابی نے تعریف کی ہی۔ 'نوین پنچانگ' نامی جنتری بھی قابلِ ذکر ہی۔ یہ مغربی اصولوں پر مرتب کی گئی ہی۔ اس کے مصنف بلونت راؤ ونایک شاستری ہیں جن کے بڑے بھائی نے یہ سلسلہ شروع کرکے ہندوؤں کے علمِ ہیئت میں کایا پلٹ کر دی تھی۔

اب میں ہندستانی کی چیدہ چیدہ نئی مطبوعات کے نام گناتا ہوں:

(الف) صوبہ جات شمال و مغرب کی مطبوعات:

ثمرِ بہشت: نعتِ رسولؐ از مولوی احمد حسین بریلوی۔

مخزنِ محبت: عرف مہابھارت ــــ سنسکرت اور اُردو میں از جوالا پرشاد اکبرآبادی۔ یہ کئی جلدوں میں ختم ہوگی۔ پیشِ نظر جلد میں

[1] نئی کرٹسند اخبار ۲۶ ستمبر ۱۸۶۹ء

۱۶۰ صفحات ہیں. مصنف نے ہندی میں بھی یہ سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔
سوال و جواب علم طبیعی العلوم: طبیعات پر از ترنی چرن بہادرسی غازی پور۔
شارنگدھر ٹیکا سہت: سنسکرت اور ہندی میں طب پر ایک کتاب جو میرٹھ سے شایع ہوئی ہے۔ کوئی تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔
انار جال: ہندی اور سنسکرت میں۔ طبع شدہ میرٹھ۔ حجم ۳۰۴ صفحات۔
بھگوت گیتا مع شرح: بنارس میں چھپی ہے۔
آکھیان منجری: کہانیوں کا مجموعہ۔ از رام پرشاد جی۔
گلزار چمن: مثنوی از سیتا پرشاد۔ میرٹھ سے شایع ہوئی۔
سنگیت سیتا سویمبر کا: پنڈت ہر دیو سہاے کے زورِ فکر کا نتیجہ ہے۔
استری دھرم سنگرہ: پنڈت تارا چند بریلوی نے وہ قوانین یک جا کر دیے ہیں جو عورتوں سے متعلق ہیں۔
شبد ارتھ دیپکا: ہندی کی ڈکشنری جو گوبردھن پرشاد نے لکھی ہے۔
ذکرِ شاہِ انبیا: نعتِ رسولؐ از منشی امیر احمد۔ طبع شدہ رام پور۔
تزکِ قیصری عرف تاریخ دربارِ دلی: از منشی گوکل پرشاد۔ کان پور میں چھپی ہے۔

(ب) مطبوعات لکھنؤ و اودھ

سرورِ غیبی: اردو و فارسی قطعات کا مجموعہ۔
بھجناولی: جگن ناتھ سہاے کے ہندی بھجنوں کا مجموعہ۔
سُکھ ساگر: بھاگوت پران کا ہندی ترجمہ از ماکھن لال۔ حجم ۹۶۲ صفحات
سنگار بتیسی: کشن جی کی رنگ رلیوں کی کہانی۔

امرت ساگر: طبی رسالہ از پنڈت کالی چرن۔ حجم ۲۶۷ صفحات۔
گل دستۂ ادب: آدابِ مجلس کا تذکرہ۔ از منشی دیوی پرشاد۔
کلیاتِ نظام: از مردان علی رانا۔ حجم ۴۴۳ صفحات۔
کشن ساگر: کشن جی کا احوال۔ از پنڈت جگن ناتھ۔ حجم ۲۵۶ صفحات۔
کالیستھ ورنن: کائستھوں کی تاریخ۔ از کالی پرشاد۔
ہندو دھرم شاستر: از کالی پرشاد۔ حجم ۲۳۶ صفحات۔
بھگوت گیتا: از ہربنس لال۔ حجم ۲۶۰ صفحات۔
آئینۂ ناظرین: فضل احمد کیفؔ کا دیوان۔
مکتوب احمدی: خطِ شکستہ کے نمونے۔ از منشی احمد حسین۔

طلسمِ عبرت
آتشِ عشق } فدا علی عیشؔ کی لکھی ہوئی تین عشقیہ نظمیں۔
فغانِ عیش

تنبیہہ الخوارج: احمد علی شاہ کا لکھا ہوا مذہبی رسالہ
ضوابطِ عدالت: از منشی گلاب رائے۔
مجموعۂ امتحانِ قوانینِ ہندستان: سوال جواب کی صورت میں۔
طلسمِ بمبئی: از نوروجی۔ بمبئی کا حال ہے۔
گلشنِ زراعت: از جواد علی۔
فغانِ نطق: عشقیہ نظم از نطقؔ
سوریہ پران: ہندی میں ایک مذہبی دعا۔
مرآۃ دانش: اردو رومان از آغا حسن۔ بلرام پور میں چھپا ہے۔
وصایائے راج کمار: کنور جگت سنگھ کے حالات

جوتک چندرکا: جوتش پر ہندی رسالہ۔ از شمبھوناتھ

دیوی بھاگوت: از پنڈت مہیش دت۔ تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل ہو۔

گنجینۂ سروری: ایک قسم کی تاریخی ڈکشنری ہو جس میں آں حضرتؐ سے لے کر تا ایں دم تمام مشہور اسلامی اکابر کی ولادت اور موت کی تاریخیں ہیں۔ از منشی غلام سرور۔

گل دستۂ فیض: غزلوں کا مجموعہ۔ حجم ۳۰۲ صفحات۔

کلیاتِ تراب: از تراب علی شاہ۔ حجم ۲۶۰ صفحات۔

رام ولاس: والمیک کی راماین کا ہندی ترجمہ از رام پرشاد۔

چشمۂ شیریں: اُردو رومان۔

انشا بہارِ بے خزاں: از غلام امام شہید۔

مانس کامان: تصوّف کی شاعری کا نمونہ۔ منشی کنہیا لال کا لکھا ہوا ہو۔

رفع وہمیات: ہندوؤں کے اوہام کی تردید۔ از منشی چمن لال۔

مجلس الاولیا: معرکۂ کربلا کی تاریخ۔ از میر سیّد علی۔ حجم ۴۶۸ صفحات۔

سیف الجبار: وہابیوں کی تردید میں یہ کتاب فضل رسول صاحب نے لکھی ہو۔

طبِ عزیزی: طبِ اکبر کا اُردو ترجمہ از عبدالعزیز۔ حجم ۲۷۶ صفحات۔

ذخیرۂ سعادت: بچّوں کی تربیت کے اصول جو جلیلی صاحب نے مرتب کیے ہیں۔

دیوانِ جرّار: جرّار کا کلام

دیوانِ امیر: ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہو۔

گیتا جہاتیہ: اُردو میں بھگوت گیتا کی شرح۔ از لالہ جی۔

کلپ سوترا: جین مذہب کی تشریح۔ از راے چند۔ حجم ۹۵۶ صفحات۔
اپورب کتھا: فسانۂ عجائب کا ہندی ترجمہ۔ از پنڈت رام رتن۔
سہسر رجنی کتھا: الف لیلہ کا ہندی ترجمہ۔ از پنڈت پیارے لال۔
حجم ۵۱۲ صفحات۔
ونیے پترکا: تلسی داس کی نظموں کا مجموعہ۔
کبت رتناکر: از پنڈت ماتا دین۔
پرمارتھ سار: ہندو رسومات کی تفصیل۔ از پنڈت کیول رام۔ حجم
۱۰۰ صفحات۔
نیر اعظم: علم ہیئت پر خیرات علی صاحب کا رسالہ۔
تقدیر کرشمہ: رام سہاے کا لکھا ہوا چھوٹا سا قصہ۔
گنگا کی کتھا: گنگا ندی کی ستایش۔
خیال بھرتری کا: راجا بھرتری کی شان میں نظم۔ از پربھلاد راے۔
جغرافیۂ بنگال: از منشی بھون لال۔
کاشی ورشن: سنسکرت اور ہندی میں بنارس کی سیر۔ از کشن چند۔
ستیہ دھرم پرکاش: ہندی میں ایک مذہبی کتابچہ از نینانند۔
سکھ ساگر:
بحر العلوم:
(ب) پنجاب کی مطبوعات
موہنی چرت: ہندی رومان۔ از پنڈت پران کشن دہلوی۔ حجم
۱۵۲ صفحات۔
منتخب واقعاتِ ہند: ہندستان کی مختصر تاریخ۔ از مادھو سرن۔

مرقعِ سلاطین: از عبدالغفور۔ یہ پانڈووں سے لے کر ملکہ وکٹوریہ تک کے بادشاہوں کی فہرست ہے۔

دہ مجلس وچہل مجلس: عطاء اللہ خاں کے مرثیوں کا مجموعہ طبع شدہ دلّی۔

مہندر ساگر: مہاراجا پٹیالہ کی تعریف میں سنسکرت میں ایک قصیدہ لکھا گیا تھا۔ اُردو میں یہ اس کا ترجمہ ہے۔

عقوبت الظالم: از محمد ابوالمنصور علی (دہلی) تردید ہدایت الاسلام تصنیف پادری عمادالدین۔

حجت الاسلام: ایک مذہبی کتاب جو لاہور سے شایع ہوئی ہے۔ تالیف پادری ایف۔ اے۔ پی یشریف

واک سُدھاکر: ویدانت کی کتابوں کے منتخب جملوں کا ہندی میں انتخاب از سادھورام لاہوری۔ حجم ۲۸۶ صفحات۔

بارہ ماسا: عطا بخش کی لکھی ہوئی نظم۔ عشقیہ انداز میں ہر مہینے کا بیان۔ ہر موسم میں کوئی عورت محبوب کی جدائی کا رونا رو رہی ہے۔

درُو لیلا: ہندی نظم از عطا بخش۔ سادھو درُو کے حالات۔

دھرم پرچار کی چھوٹی پُستک: ہندو مذہب کے بعض پہلوؤں کا تذکرہ۔ از بہاری لال۔

نُوپی ۔۔ کا ۔۔ ن: از ۔۔ شن

کبریت الاحمر و دعائے مغنی: بابو کیشو چندر سین کے ایک خطبے کا اُردو ترجمہ۔

جواہرِ خمسہ: شاہ محمد غوث کی دعاؤں کا مجموعہ۔ طبع شدہ دلّی۔

الکھ پرکاش: اُردو میں اُپنشد کا ترجمہ۔ از منشی کنہیا لال۔ حجم ۴۰۰ صفحات

ست دھرم کتاولی: ہندی مجن۔ لاہور

پوتھی شری بھاگوت: بھاگوت کے بعض حصّوں کا ہندی ترجمہ۔ از رلا داس۔

عمدۃ البیان: شیعہ نقطۂ نگاہ سے قرآن کریم کی شرح۔ از منشی سید امیر علی۔ طبع شدہ لاہور۔ حجم ۸۲۰ صفحات۔

اندرسبھا: اس مشہور اوپیرا کا یہ نیا ایڈیشن ہی۔

بیربل نامہ: راجا بیربل کے لطیفوں اور چٹکلوں کا مجموعہ۔ از جہانارائن دہلوی۔

بوجھ پہیلی: امیر خسرو کی پہیلیوں کا مجموعہ۔

تحفۂ دل پذیر: لطیفوں کا انتخاب۔ از بلاقی داس دہلوی۔

انتخاب ظفر: آخری مغل تاج دار کے کلام کا انتخاب۔

تاریخ مکّہ: از میر عباس دہلوی۔

مثنوی ولی رام: ایک مسلمان بزرگ ولی رام نے اس میں صوفی عقائد کی تشریح کی ہی۔

پرہلاد سنگیت: زمانۂ قدیم کے ہندو بھگت کی زندگی کے حالات از لچھمن۔

واسوخت نامہ: از امانت لکھنوی۔

غمزۂ دل رُبا: دراصل یہ ایک ہندو بزرگ کا سفرنامہ ہی جسے امبا پرشاد سیالکوٹی نے ترتیب دیا ہی۔

اعتقاد الاسلام فی رد برہان مسلم: وہابی عقائد کا جواب۔ پشاور حجم ۲۰۲ صفحات۔

رسالۂ اصول برہمو دھرم: برہمو سماج کے عقائد سرسری طور پر

بیان کیے گئے ہیں۔

راحتِ حقیقی: از سردار دیال سنگھ۔ لاہور میں برہمو سماج کی بارھویں سال گرہ کے موقع پر یہ خطبہ پڑھا گیا تھا۔

شوا پران: سیال کوٹ سے چھپا ہے۔ پونے دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

چشمۂ فیض ہردل عزیز: منشی کنھیا لال سیال کوٹی کے فلسفیانہ خیالات کا نمونہ ہے۔

مضمون لالہ لچھمی نارائن: وہابیوں کے عقیدے پر خیال آرائی ہے۔

الکھ امواج: یوگ واشسٹھ کا ترجمہ۔ از منشی کنھیا لال سیال کوٹی۔

ذخیرۂ رفاہِ عام: در اخلاق۔ سیال کوٹ۔

وگیان سدھا: ویدانت پر ایک رسالہ جسے .... لال نے تحریر کیا ہے۔

گیان دیپک: مذہبی رسالہ برج باسی لال کا لکھا ہوا۔

ترجمہ مجموعۂ شری مہما: یہ بھی ہندو مذہب سے متعلق ہے۔ منشی دیوان چند نے لکھا ہے۔

جنگ بہادری: سید عین حسن نے مذہبی معاملات پر رائے زنی کی ہے۔

حسبِ بالا سات کتابیں سیال کوٹ سے شایع ہوئی ہیں۔

(ت) کلکتہ و بنگال کی جدید ہندستانی مطبوعات:

جین پوجاولی: جین مذہب پر ہندی میں ایک کتاب جو عظیم گنج سے شایع ہوئی ہے

قصۂ مرگاوتی: منظوم اردو رومان

ودیا نیو: بنگالی کتاب کا ترجمہ۔

شجرۃ الیقین فی جنّت النعیم: از شاہ غلام نجف (اُردو میں)۔ آرہ

کتاب المجتت: اس کی تفصیل نہ معلوم ہو سکی۔

قولِ ثابت: از مولانا کرامت علی۔ حجم ۲۴۰ صفحات۔

اپنشد بیترکا: از نوین چندر راج۔ روح کی عظمت پر اپنشد کے ۸۴ اشلوکوں کا ہندی میں ترجمہ بمع شرح۔

تاج الاقبال عرف تاریخ ریاست بھوپال: بھوپال کے نواب صدّیق علی خاں نے یہ کتاب بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کو دے دی ہی۔

مرآۃ الملوک: از رحیم بخش۔

نجات نامہ: بنگالی اُردو میں اشعار کا مجموعہ۔

(ث) بمبئی کی جدید ہندستانی مطبوعات

مقاصد الصالحین: اخلاق پر ایک کتابچہ۔

پنچا وشی: فلسفۂ ویدانت پر سنسکرت اشلوک مع ہندی ترجمہ و شرح۔

تفسیر رؤفی: شرح قرآن از عبدالرؤف۔ حجم ۶۷۰ صفحات۔

قصّۂ شاہ زکوم ۹: منظوم قصّہ۔ از عبدالرسول۔

شاہ جہاں، شاہ پری اور روشن جلال: یہ ڈراما ایک انگریز کا لکھا ہوا ہی۔ حجم ۵۲ صفحات۔

سُدا بدھ سالنگیا کا خیال: سدا بدھ سالنگیا کے گیت۔

ویدامنی دھوانتا نوارنم: ویدانت کی غلطیوں کی تردید۔

مولوی سید نصرت علی قیصر کی تصانیف

مرآۃ الصالحین:

قیصریہ: یونان کے بادشاہوں کی مصوّر تاریخ۔

سرابِ عالمِ اسباب: پہلے ذکر آچکا ہے۔

تاریخ انگلستان:

گل دستۂ شباب: عیسائیوں کے پُرانے مقدّس مقامات کے حالات

احسان الدلیل فی معاملات توراۃ والانجیل:

کلمات الحق: عیسوی الہام وانجیل پر بحث۔

رحمتِ عظیم: اولیاء اللہ کے حالات۔

گل دستۂ روٴسا: ہندستانی رئیسوں کے حالات۔

ذخیرۂ حسنات: اُردو، فارسی و عربی میں آں حضرتؐ کی منظوم مدح

تاریخ مدینۂ منورہ وکعبۂ شریف:

لحنِ داؤدی: پادری عمادالدین کی ایک کتاب کی تردید۔

انعامِ عام: عیسائی مبلغوں کے اعتراض کا جواب۔

یادداشتِ واعظین: یہ بھی عیسائیوں کی تردید میں لکھی گئی ہے۔

تصحیح التاویل: پادری عمادالدین کی کتاب "تفسیر مکاشفات" کا جو

افہام الخصام: تفسیر مکاشفات کا جواب۔

حفظ جان: عیسائی پادری عبداللہ آتھم کے اعتراضوں کا جواب

میزان المیزان: پادری فنیڈر کی کتاب میزان کا جواب۔

اعزازِ قرآن: نو عیسائی رام چند کے اعتراضوں کا جواب۔

شلاق فی ردّ تہذیب الاخلاق: تہذیب الاخلاق کی تردید۔

لکھنؤ سے حال ہی میں جو کتابیں شایع ہوئی ہیں ان میں سے حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں:-

تذکرۂ رسول اکبر: حکیم امانت علی کی لکھی ہوئی نعت۔

طلسمِ عجائب: اس میں تعویذوں کی عبارت اور اشکال درج ہیں۔

دیوانِ ہوشیار: از منشی کیول رام بجنوری۔

پوتھی سیتا سوئمبر: ضلع مونگیر کے بابو گردھر ناراین کی لکھی ہوئی ہندی نظم تصویروں کے ساتھ۔

رام ابھشیک ناٹک منظوم ڈراما از بابو رام گوپال۔ رام چندر جی کے حالات سے متعلق ہے۔

برہمو سماج: اس اُردو رسالے میں سماج کے عقائد سلجھا کر بیان کیے گئے ہیں۔

رام ابشک ناٹک: از رام گوپال

ہندستانی اخباروں میں جو نظمیں شایع ہوا کرتی تھیں ان میں سے ایک مثنوی جو پنجابی میں چھپی ہے[۱] بہت دل چسپ ہے۔ یہ مولوی باقر حسین متعلّم اینگلو عربک کالج دلّی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کی سختی سے پابندی کرنے کی نصیحت کی گئی ہے اور بیواؤں کے معاملے میں کافروں کی پیروی کو ترک کرنے کی تلقین ہے۔ ایک شاعرہ کی غزلیں بھی داد طلب ہیں۔ ان کا نام نواب صدر محل ہے اور پادشاہ نامہ و گل دستہ کے نام سے ان کے کلام کے انتخاب منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

یادش بخیر بمبئی کے نامی شاعر نواب نبی بخش خاں بہادر دلاور جنگ کی عمر اب سو سال ہوئی۔ غدر کے زمانے میں یہ انگریزوں کے ساتھ تھے

---

[۱] ۱۱ نومبر ۱۸۶۹ء

اور 'عدل اصلِ فرنگ' نامی کتاب کے مصنف ہیں۔ اس میں لکھا ہو کہ اگر ارسطو اور افلاطون آج زندہ ہوتے تو ملکہ کے اہل کاروں کے آگے زانوے ادب تہ کرتے۔ حکومتِ برطانیہ کی انصاف پسندی اور ریل، تار وچھاپے خانے کے آپ شیدائی ہیں[۱]۔

اٹاوہ کے رئیس سیّد امجد علی جو 'نجم الشاعرین' کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ پنجابی میں 'اختراع عروضِ جدید، فارسی و اُردو' کی اطلاع دیتے ہیں[۲]۔ انھیں یہ رسم مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہو کہ فارسی و اُردو میں عربی کی اصطلاحات کا چلن ہو اور سب کی تان "فعل" پر آکر ٹوٹتی ہو۔ وہ سرے سے نئے بول تجویز کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ نئے نام کیا ہوں گے۔ اس تجویز پر رائے زنی کرتے ہوتے اخبار لکھتا ہو کہ: "اگر عروض میں کوئی ردّو بدل کرنا چاہے تو لوگ اسے بدعت سمجھیں گے اور اس جدّت کو جنون سے تعبیر کریں گے۔ لیکن فنِ عروض میں اگر ترقی ہوسکے تو کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی ہو۔ اگر شاہانِ اودھ کی توجہ نہ ہوتی تو مرثیہ نگاری کو ہرگز یہ فروغ حاصل نہ ہوتا۔ اگر مغلوں کے دربار میں راگ رنگ کا چرچا نہ ہوتا تو عشقیہ شاعری کا سنگار کیوں کر ہوتا۔ مختلف تعلیمی محکموں نے انگریزی سے اُردو میں سائنس کی جن کتابوں کے ترجمے کرائے ہیں انھوں نے زبان والوں کو فائدہ نہ پہنچایا ہو لیکن یہ تو ثابت کر دیا کہ ہماری زبان جب تک اپنے خول سے باہر نہ نکلے گی مکمل نہ ہوگی۔ اس سلسلے میں وضعِ اصطلاحات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا......"

---

[۱] Aligarh's Messenger (?) ۳۰ دسمبر ۱۸۶۶ء[۲] ۱۰ مارچ ۱۸۶۷ء

سوال یہ ہے کہ انگریزی، لاطینی یا یونانی کی اصطلاحات کو جوں کا توں ہندستانی زبانوں میں داخل کر دیا جائے یا ان کے ہم معنی سنسکرت الفاظ کا استعمال کیا جاتے؟ یا مشہور عالم راجیندر لال مترا کی اس صائب رائے[1] پر عمل کیا جائے کہ عام فہم ملکی اصطلاحات وضع کی جائیں اور غیر ملکی الفاظ صرف اس صورت میں لیے جائیں جب وہ قطعاً ناگزیر ہوں۔ یورپین زبانوں سے اسی آخری اصول پر عمل کیا جائے۔

مجھے 'حساب الاطفال' نامی فارسی اردو لغت کا ایک نسخہ موصول ہوا ہے۔ یہ لغت منشی وزیر سنگھ دہلوی المتخلص راقمؔ نے نظم میں لکھی ہے اور دلی کے اردو پریس سے اسی سال شائع کی ہے۔

سنا ہے کہ رنگون میں انگریزی، برمی، ہندستانی اور تامل کی ایک مجموعی لغت تیار ہو رہی ہے جو یقیناً نہایت مفید ثابت ہوگی۔

(۳)

پچھلے سال ہندستان میں جتنے اخبار شائع ہوتے تھے، ان کا گوشوارہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:[2]

بنگال: ۶۳ انگریزی ۹۰ دیسی اور ۱۲ نیم انگریزی نیم دیسی

بمبئی: ۴۴ انگریزی ۸۱ دیسی اور ۹۰ نیم انگریزی نیم دیسی

مدراس: ۳۸ انگریزی ۳۲ دیسی اور ۴۴ نیم انگریزی نیم دیسی

صوبہ جات شمال و مغرب: ۱۶ انگریزی ۵۸ دیسی اور ۸ نیم انگریزی نیم دیسی

---

1. A Scheme for the rendering of European Scientific terms into the vernaculars of India, Cal. 1877

2. Indian Mail ۳۱ مارچ ۱۸۷۸ء

پنجاب: ۱۳ انگریزی ۴۶ دیسی اور ۲ نیم انگریزی نیم دیسی
برطانوی برما: ۱۴ انگریزی ۶ دیسی اور ۱ نیم انگریزی نیم دیسی
سندھ: ۹ انگریزی ۳ دیسی اور ۱ نیم انگریزی نیم دیسی
اودھ: ۸ انگریزی ۲۰ دیسی اور ۱ نیم انگریزی نیم دیسی
راج پوتانہ: ۱ انگریزی ۴ دیسی اور ۱ نیم انگریزی نیم دیسی
آسام: ۱ انگریزی ۷ دیسی اور ۱ نیم انگریزی نیم دیسی

بعض نئے ہندستانی اخباروں کے نام چھوٹ گئے تھے جنھیں میں اب درج کرتا ہوں:

ادیبِ عالم: اودھ اخبار نے اس کا ذکر کیا ہی۔

اخبار انجمن لکھنؤ:

اخترِ ہند: بھوپال سے نکلتا ہی۔

انوار الاخبار: لکھنؤ سے شایع ہوتا ہی۔

اتالیق زمیں داراں: مہینے میں دوبار نکلتا ہی اور زمیں داروں کو ان کے مطلب کی معلومات پہنچاتا ہی۔

گوجرانوالہ:-

ہادیِ حقیقت: لاہور کے برہمو سماج کا آرگن جو اُردو اور ہندی میں چھپتا ہی۔

لمع النور: جون پور سے شایع ہوتا ہی۔

مقصود الاخبار: گوڑگانو سے نکلتا ہی۔

محکمہ میگزین: پشاور سے شایع ہوتا ہی۔

مرآۃ الارض: مدراس کا اُردو جریدہ۔

مرشد آباد پترکا: ہندی میں شائع ہوتا ہے۔

منشیٔ قیصرِ ہند: بنارس سے نکلا ہے۔

نادر الاخبار: اسے مونگیر کے برھو سماجی تین سال سے نکال رہے ہیں۔

نورالہدا: قصبۂ قصور کا ماہانہ رسالہ۔

پنجاب ریویو: اشتہار میں کہا ہے کہ پہلے پادری رجب علی اس کی ادارت کرتے تھے۔

رفاہِ عام: سیال کوٹ سے شائع ہوتا ہے۔

سفیرِ ہند: دلّی کا جریدہ۔

سفیرِ ہندستان: امرت سر سے نکلتا ہے اور پادری رجب علی اس کے ایڈیٹر ہیں۔ سنتے ہیں کہ وکیلِ ہندستان اب اس نام سے نکلنے لگا ہے۔

سیدالاخبار: لاہور، دلّی اور مدراس سے اسی نام کے مختلف اخبار نکل رہے ہیں۔

سفیرِ مدراس:

شفاءالصدور: پنجاب یونی ورسٹی کے پروفیسر عبدالحکیم اس کے مدیر تھے۔ ان کے ایک مضمون پر اعتراض ہوا جس کی وجہ سے انھیں ادارت کے فرائض سے سبک دوش ہونا پڑا۔

وِدیا دلاس: جمّوں کا ہندی اخبار

بمبئی سے ایک ہندستانی رسالے کے اجرا کی خبر ہے جس میں انگریزی ادب کے شاہ کاروں کے تراجم شائع ہوا کریں گے۔ یہ اپنے ڈھنگ کا انوکھا رسالہ ہوگا اور اس کے ذریعے انگریزی ادب ہندستانیوں تک پہنچ سکے گا۔

یہ بھی سنا ہے کہ ہوشیار پور سے زراعت پر ایک رسالہ نکلنے والا ہے۔

نورالہدیٰ نامی اخبار کا ہیں نے نام لیا ہے یہ اسلام کی اشاعت کے لیے وقف ہے اور اسے غلام اللہ صدیقی نکالتے ہیں۔ یہ تین حصّوں میں تقسیم ہوتا ہے جس میں سے ایک علم الکلام، دوسرا ارکانِ مذہب اور تیسرا تاریخِ اسلام کے لیے مخصوص ہے۔

رام پور کا تاج الاخبار خریداروں کی قلت کی وجہ سے بند ہوگیا۔

بنارس کے ہندی رسالے "کاشی پترکا" ایک نمبر نظر سے گزرا۔ یہ مہینے میں دو بار نکلتا ہے اور سائنس و ادب کے پُراز معلومات مضامین شایع کرتا ہے۔ اس کا نصف حصّہ اُردو میں ہوتا ہے۔

اودھ اخبار کے مینجر نے ۲۷ اپریل۔ کے پرچے میں اشتہار دیا ہے کہ ایک قابل ایڈیٹر کی ضرورت ہے جو اُردو انشا پرداز ہونے کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی سے اچھی طرح سے واقف ہو، پنجابی کے حسبِ ذیل مضمون سے اس اشتہار کا منشا معلوم ہوگا "یہ سچ ہے کہ ہمارے ملک میں اخباروں کی کمی نہیں۔ لیکن جو یہ جانتے ہیں کہ یورپ کی ترقی اور خوش حالی میں انگریزوں کا کتنا ہاتھ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندستان کی وسیع سرزمین کے لیے دو چار ہزار اخبار بھی ناکافی ہوں گے۔ اس صورت میں سو دو سو اخباروں کی بھلا کیا حقیقت ہے اور جب کہ ان میں بھی بہت سے برائے نام زندہ ہیں۔ اس پر طرفہ یہ ہے کہ ایسے جریدے خال خال ہیں جو اپنی خوش ترتیبی اور آزاد خیالی کی وجہ سے ممتاز ہوں۔ بااثر اخبار حکومت کا مشیرِ خاص ہوتا ہے۔ وہ جو کام کر سکتا ہے کسی وزیرِ باتدبیر سے بھی نہیں ہو سکتا۔ رعایا کے لیے تو

وہ اسی قدر اہم ہیں جتنا زندگی کے لیے پانی۔ اس اثر کو باقی رکھنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اخبار راست گفتار، صاف گو، نیک نیت اور بے خوف ہو۔ اسے ہمیشہ اپنے فرض کا پاس ہونا چاہیے۔ اب تک ہندستان کے اخبار اس معیار پر پورے نہ اُترتے تھے اور اسی لیے ان کا اثر بھی محدود تھا۔ ان کے آگے بہت سی دشواریاں بھی ہیں جنھیں دُور کرنے کے لیے کوئی کچھ نہیں کرتا۔ بہت عرصے سے میں چاہتا ہوں کہ ایک بلند پایہ اخبار نکالوں جو سب سے زیادہ توجہ خبروں کی طرف کرے۔ اب تک یہ نہ ہو سکا۔ لیکن آج اس کا امکان نظر آتا ہے۔ اس کوچے میں میں نے عمرِ عزیز کا بڑا حصّہ گزارا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ میرٹھ سے میرا نکالا ہوا ایک اخبار دن دوُنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ حکومت کو یہ اخبار اتنا پسند آیا کہ اسے بارہ سو روپے سالانہ کا وظیفہ دیا جاتا تھا۔ ہندستان میں کسی اور کو یہ عزت نصیب نہ ہوئی۔ اسی طرح اودھ اخبار کی کامیابی میں بھی میرا بڑا ہاتھ ہے۔ آٹھ سال میں نے اس کے لیے دن رات محنت کی ہے[1]۔ اس دوران میں چار پانسو اخبار نکلے لیکن کسی نے یہ شہرت حاصل نہ کی۔ اس محنت کی وجہ سے میری صحت خراب ہو گئی اور آنکھوں پر ایسا اثر پڑا کہ لاکھ علاج کرنے پر بھی فائدہ نہ ہوا۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آیندہ ۱۵ مئی سے اپنا ہفتے وار اخبار نکالوں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اس کا کوئی مدِّمقابل نہ ہوگا کیوں کہ نقشِ ثانی بہ ہر حال نقشِ اوّل سے بہتر ہوتا ہے۔ پندرہ سال سے میں اخبار نویسی کرتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ قدردان میری محنت کی داد دیں گے۔

---

[1] یہ مضمون مولوی غلام محمد خاں تپش کا لکھا ہوا ہے۔ یہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔

اخبار حاکم و رعایا کا مشیر ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے اخبار کا نام 'مشیر قیصرِ ہند' رکھا ہے۔"

بعد ازاں مضمون نگار نے مجوزہ اخبار کی ترتیب کا خاکہ دیا ہے۔ ان کا ارادہ ہے کہ حکومت کے افعال پر رائے زنی کی جائے اور اہلِ ہند کے جائز حقوق کی تائید کی جائے، انگریزی اخباروں کی غلط بیانی کی تردید کی جائے گی اور ملک کی بہبودی کے لیے تعمیری پروگرام سمجھایا جائے گا۔ نئی کتابوں پر بے لاگ تبصرہ ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ کہ عربی، فارسی، انگریزی و دیگر زبانوں کے جریدوں سے خاص مضامین کے ترجمے کیے جائیں گے۔

اب میں علی گڑھ اخبار کا ایک دل چسپ مضمون درج کرتا ہوں جس میں حکومت اور ہندستانی اخباروں کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے: "لارڈ نارتھ بروک کے دورِ حکومت میں کونسل کے کچھ ارکان کو سوجھی کہ ملکی اخباروں پر پابندی عائد کی جائے۔ اس سے اندیشہ ہوا کہ حکومت پریس کو آزادی سے محروم کرنا چاہتی ہے[1]۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ کہنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ہم اب تک 'آزادی' کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے ہیں۔ آزادی کا مطلب عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے کو بھلا برا کہنے کا حق ہے اور وہ بلا خوف اسے کھوٹی کھری سنا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس قسم کی آزادی خطرناک ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت اور اس کے

---

[1] یہ تجویز سچ معلوم ہوتی ہے اور اس کی طرف بنگال کے لفٹنٹ گورنر نے ایک دربار میں اشارہ بھی کیا ہے۔ حکومت کو بنگال کے اخباروں سے خاص طور پر شکایت ہے۔

کارندوں پر تنقید کرنے کی آزادی اخباروں کو ہونی چاہیے۔ یہ حکومت اور رعایا دونوں کے لیے یکساں مفید ہو اور حکومت کو اس قسم کی آزاد خیالی سے خوش ہونا چاہیے۔ لیکن اس کی بھی ایک حد مقرر ہو اور اس سے تجاوز کرنا مناسب نہیں۔ ممکن ہو کہ ہمارے کئی معاصر اس معاملے میں ہم سے متفق نہ ہوں لیکن ہم خلوص سے اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں پریس کی آزادی کی ایک حد تسلیم کر لینی چاہیے۔ خدا لگتی تو یہ ہو کہ حکومت پر نکتہ چینی کرتے ہوئے سخت درشتی سے کام لیا جاتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے حاکموں نے ہندستانیوں پر مظالم کیے ہیں۔ لیکن اس کا الزام ساری حکومت پر رکھنا مناسب نہیں، خصوصاً اس حالت میں کہ موجودہ حکومت سے ملک کی قسمت وابستہ ہو چکی ہو۔ کئی اخبار حکومتِ وقت کو ایسی سختی سے بھلا برا کہتے ہیں گویا اس سے امن و انصاف کی توقع نہیں رکھتے۔ بہ ایں ہمہ یہ ماننا پڑتا ہو کہ یہ اخبار بدنیت نہیں وہ صرف مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ یہ بھی ہو کہ ناظرین کو خوش کرنے کے لیے وہ ذرا بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ضبط سے کام نہ لیں گے تو حکومت ان کے مشورے پر کیوں توجہ کرنے لگی؟ اس گرم گفتاری سے ملک کا نقصان ہوتا ہو۔ بہرحال حکومت کو ساری اخباری برادری سے برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ آزادی رعایا کی ترقی کے لیے ضروری ہو لیکن اس سے پہلے اس کے صحیح استعمال کی تعلیم ملنی چاہیے۔ ہمیں اپنے کو اس نعمتِ عظمیٰ کا اہل ثابت کرنا ہو۔

اب یہ دیکھنا ہو کہ کیا انگریزی اخباروں سے ہم زبان ہو کر حکومت

کو ہماری آزادی چھین لینی چاہیے۔ کیا یہ بھی ایک قسم کی انتہا پسندی نہیں ہے اور اس سے فائدے کی بجائے نقصان نہ ہوگا؟ اس وقت حکومت کو اخباروں کے توسط سے رعایا کی خوشی یا خفگی کا علم ہوتا ہے اور انتظامی امور پر ان کی رائے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ یہی ایک واحد وسیلہ ہے جس کے ذریعے رعایا کے دل کا حال عیاں ہوتا رہتا ہے۔ جب اخبار نہ نکلتے تھے تو حکومت کی پوزیشن پر جھوٹی سچّی افواہوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا کیوں کہ لوگ لاعلمی کے عادی ہو چکے تھے۔ لیکن اب لوگ اخبار بینی کے عادی ہو چکے ہیں اور حالت بدل گئی ہے۔ اب اخباروں کے بند ہونے سے لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوں گے اور حکومت کی نیت کے متعلق انھیں شبہہ ہوگا۔ لہٰذا ہم بھی اخبار پانیر کی اس رائے کے حق میں ہیں کہ اگرچہ فی الجملہ ہندستانی اخبار پسندیدہ نہ بھی سہی تاہم انھیں بند کرنے سے سخت نقصان ہوگا۔

یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اخبار برابر ترقی کر رہے ہیں۔ پانچ سال پہلے اور آج کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ حکومت پر نکتہ چینی کرتے کرتے عوام میں سیاست اور آئین کا چرچا ہونے لگا ہے۔ جیسے جیسے عوام کا مطمح نظر بلند ہوتا جائے گا، خود بہ خود اخباروں کی بھی اصلاح ہوتی جائے گی۔"

اودھ اخبار[1] نے بھی تقریباً یہی باتیں لکھی ہیں۔ اس نے یہ یہ ایک سچّے کی بات لکھی ہے کہ ہندستان میں کوئی پارلیمنٹ نہیں ہے جو

---

[1] ۴ اپریل ۱۸۷۸ء

حکومت کے افعال کا جائزہ لے اور رعایا کی ضروریات سے اسے باخبر رکھے۔ اس صورت میں اخباروں کی ضرورت اور اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس نے امید ظاہر کی ہے کہ لارڈ لٹن جو خود علم و ادب کے شائق ہیں، اپنے پیش رو کی بات نہ مانیں گے اور اخباروں کو آزادی سے محروم نہ کریں گے۔

علی گڑھ اخبار کا یہ مضمون بھی قابلِ غور ہے: "غدر سے پہلے ہندستانی اخباروں نے حکومت کو آنے والی مصیبت سے آگاہ کر دیا تھا لیکن ان کی تاکید پر کسی نے کان نہ دیا۔ تب سے لے کر اب تک ہندستان میں اخبار نویسی نے بڑی ترقی کی ہے۔ اخبار حکومت اور رعایا کے مابین رشتہ قائم کرتے ہیں اور جابر کے مقابلے میں کم زور کا ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن تھوڑے سے خود غرض سرکاری اہل کار ان کی خدمات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں —— صرف اس وجہ سے کہ ہندستانی اخبار ان کے کرتوتوں کا پردہ فاش کرتے رہتے ہیں۔ بنگال کے لفٹنٹ گورنر کی ایک تقریر نے اخباری دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے اور یہ اندیشہ ہو چلا ہے کہ کہیں حکومت کا قہر سب اخباروں پر نازل نہ ہو۔ سماج درپن نے یہ کہہ کر اپنی اشاعت بند کر دی ہے کہ حکومت اسے بند کرنا چاہتی ہے۔

لیکن اودھ اخبار کو یہ یقینِ کامل ہے کہ پریس کی آزادی نہ چھینی جائے گی۔ چناں چہ اس نے اعلان کیا ہے کہ یکم جون سے وہ ہر روز نکلا کرے گا۔ اسی طرح جیسے سورج طلوع ہوتا ہے۔ روزنامہ ہونے کے بعد اس کی ادارت کے فرائض مولوی غلام احمد خاں کی بجائے

سیّد امجد علی صاحب ادا کرتے ہیں۔ یہ ہندستانی زبان کا پہلا روزنامہ اخبار ہے۔ یہ ترقی قابلِ تقلید ہے اور امید ہے کہ اُردو میں جلد اور بھی روزناموں کا اجرا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ترکی اور روس کی جنگ نے مسلمانوں میں اخبار بینی کا شوق پیدا کر دیا ہے۔ یہ جنگ نہ ہوتی تو شاید روزانہ اخبار نکلنے میں دیر ہوتی۔ اسی وجہ سے علی گڑھ اخبار اب ہفتے میں ایک کی بجائے دو بار چھپنے لگا ہے۔ لاہور کا ہفتے وار جریدہ 'کوہِ نور' بھی اب ہفتے میں دو مرتبہ نکلنے لگا ہے۔

بہار سائنٹفک سوسائٹی کا آرگن اخبار الاخیار باقاعدگی سے شایع ہو رہا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی میں چھپتا ہے۔ اس کا نام چشمۂ نور یا لمعۂ نور ہے۔ مجھے بھی اس سوسائٹی کا رُکن ہونے کی عزت حاصل ہے۔

سرابِ عالم کے مصنّف سے اودھ اخبار سخت خفا ہے۔ اس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا ہے:[1] "اگر دنیا میں سب کچھ مایا ہے تو پھر نیک و بد کا کھٹکا کیوں ہو۔ مصنّف نیک نیت سہی لیکن اس قسم کی کتابیں خطرناک ہیں۔ کیوں کہ ہندستانی یوں ہی خیال پرست ہیں۔ انھیں حرکت کی طرف راغب کرنا مشکل ہے۔ اگر ان سے اب بھی یہی کہا گیا کہ زندگی بے کار ہے تو وہ کسی قسم کی ترقی نہ کریں گے"۔

ہندستانی اخباروں میں دل چسپ مضامین کی کمی نہیں ہوتی۔ مثلاً اودھ اخبار میں 'خوش نویسی' پر ایک سیر حاصل مضمون دیکھنے میں آیا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ فن ہندستان میں جس قدر مقبول ہے اور کہیں نہیں۔ یہ مضمون برہان پور کے جناب ستم ظریف کا لکھا ہوا ہے۔

---

[1] ۱۹ نومبر ۱۸۷۶ء

عنوان ہی: "الخط نصف العلم"۔

لندن سے عربی اور ہندستانی کا ایک نیا مصوّر مجلہ نکلنے لگا ہی۔ یوں تو رسالہ عربی کا ہی۔ گاہ گاہے ہندستانی، ترکی اور فارسی میں بھی مضمون چھپا کرتے ہیں۔ پیشِ نظر نمبر میں ملکۂ معظمہ، سلطان زنجبار، سلطان عبدالحمید، سر سالار جنگ، پاپائے اعظم وغیرہ کی تصویریں ہیں۔ اس کے مضمونوں کا تذکرہ خارج از بحث ہی۔

(۴)

اودھ کے ناظمِ تعلیمات مسٹر جون نیفیلڈ[۱] نے اپنے صوبے کی تعلیمی ترقی پر جو سالانہ رپوٹ تیار کی ہی، اس کا ایک حصّہ میں نیچے نقل کرتا ہوں تاکہ ہندی کی حیثیت واضح ہوجائے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ اودھ کے اسکولوں میں ہندی کی بہ نسبت اُردو کے طلبا کی تعداد زیادہ ہی: "ہندی اور اُردو کے نام پر جو قضیہ چھڑا ہوا ہی اس سے انجان لوگوں کو دھوکا ہوسکتا ہی کہ اس صوبے میں شاید دو مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن یہ غلط ہی، رسم الخط مختلف ہیں لیکن زبان ایک ہی اور اس کا نام ہندستانی ہی۔ لکھنؤ کے عالم اور گونڈہ کے کسان بہ خوبی ایک دوسرے کی بات سمجھ جاتے ہیں کیوں کہ ان کی زبان بنیادی طور پر ایک ہی۔ ہمارے اسکولوں میں اُردو کی جو ریڈریں پڑھائی جاتی ہیں ان میں شمالی ہند کی مستند زبان استعمال کی جاتی ہی۔ لیکن ہندی ریڈروں کا طرز بالکل الگ ہی۔ ایک ہی بات کو

[۱] افسوس کہ اس محبوب افسر نے ہندستان کو خیرباد کہہ دیا۔ ۱۳ اپریل ۱۸۸۰ء کے اودھ اخبار میں لکھنؤ کے اس الوداعی جلسے کی کیفیت درج ہی جو ان کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا۔

بول چال کی زبان میں لکھنے کی بجائے نامانوس سنسکرت الفاظ میں لکھا جاتا ہے۔ ہندستانی یا تو فارسی سے استفادہ کرسکتی ہے یا سنسکرت سے لیکن مشترک زبان کو ترقی دینے کے بدلے اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور ہندی کے نام سے ایک ایسی مصنوعی بولی گھڑی جارہی ہے جسے بولتا کوئی نہیں اور سمجھتے صرف پنڈت ہیں۔ اس رپوٹ میں میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ پچھلے سال تیرہ ہزار لڑکوں نے ہندی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان میں دیہاتی پاٹ شالاؤں کے طلبا اور ہائی اسکول کے متعلم بھی شامل ہیں۔ قدیم ہندی ادب کے مطالعے میں کوئی برائی نہیں۔ ہر ہندو یا مسلمان کو حق ہے کہ وہ اپنی قدیم زبانوں کو پڑھے پڑھائے۔ لیکن ہندی پڑھنے والوں میں سے اکثر نیچی ذاتوں کے لڑکے ہیں اور وہ اس سنسکرت آمیز بولی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اگر ناگری رسم الخط میں انھی کی بول چال کی زبان پڑھائی جاتی تو کوئی ہرج نہ تھا لیکن ایک ایسی نامانوس بولی پڑھانا جسے نہ کوئی بولتا ہو نہ سمجھتا ہو کہاں کی ہوش مندی ہے۔ یہ ہمارے طریقہ تعلیم کا سب سے ناقص پہلو ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ اس معاملے میں ہم نے صوبجاتِ شمال و مغرب کی کورانہ تقلید کی ہے۔ پنڈتوں اور پڑھے لکھوں کے جھانسے میں آکر ہم نے بڑی غلطی کی۔ مولویوں اور پنڈتوں کی چشمک کا نتیجہ یہ ہوا کہ بول چال کے الفاظ کا قتلِ عام ہو رہا ہے اور اسی وجہ سے اُردو اور ہندی کا امتیاز بڑھتا جاتا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی پھیلتی جاتی ہے کہ یہ دونوں مختلف زبانیں ہیں۔ اودھ آنے سے پہلے میں بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ مسٹر

CROFT کرافٹ نے جو بہار میں اسکول انسپکٹر ہیں ایک کارآمد رپٹ ان لوگوں کے جواب میں تیار کی ہی جو عدالتوں میں اُردو کی جگہ ہندی کو دلانا چاہتے ہیں۔ موصوف نے میرے خط کے جواب میں لکھا ہی کہ وہ اسکولوں کے لیے جو ریڈریں لکھوا رہے ہیں اُن کی زبان مشترک ہی، صرف پانچ فی صدی الفاظ ایسے ہیں جو بدلے گئے ہیں۔ ہمیں ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ اودھ کی صرف ایک مشترک زبان ہی۔ ہندی اور اُردو کا فرق لوگوں کے تخیل کی اپج ہی۔ اور ابتدائی اسکولوں میں جو زبان ہندی کے نام سے پڑھائی جاتی ہی نہ عوام اسے بولتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں"۔

راجا شیو پرشاد نے اس نظریے کی صحت کو ثابت کر دکھایا ہی۔ انھوں نے الٰہ آباد سے ہندستانی کی گرامر شایع کی ہی جس کا ایک حصہ 'صرف و نحو' کے نام سے اُردو خط میں دوسرا 'ویاکرن' کے نام سے ناگری رسم الخط ہی۔ اسی طرح انھوں نے مبتدیوں کے لیے سائنس کی ایک کتاب کا ترجمہ اُردو میں 'حقائق الموجودات' اور ہندی میں 'ودیا نکر' کے نام سے چھاپا ہی۔ دونوں کتابوں کے نئے ایڈیشن نظرِ ثانی کے بعد طبع ہو گئے ہیں۔

اخبار 'انگلش مین' میں 'ہندی یا اردو' کے نام سے حسب ذیل مضمون شایع ہوا ہی[1]: "حکومت نے ارادہ کیا ہی کہ بہار کے دفتروں اور عدالتوں میں سرکاری کام ہندی زبان اور ناگری رسم الخط میں ہوا کرے۔ اس بوالعجبی کی وجہ ہماری سمجھ میں نہ آئی کیوں کہ بہار کی

---

[1] اس جگہ مضمون کا فرانسیسی ترجمہ درج ہی جس کا اُردو ترجمہ کیا گیا ہی۔

رائے عامہ اس تبدیلی کے خلاف ہے۔ ایک تو یہ کہ صدیوں کے استعمال کی وجہ سے لوگ فارسی رسم الخط کے عادی ہو چکے ہیں۔ دوسرے عدالتی یا تجارتی امور میں اردو کا چلن بہت عرصے سے ہے۔ ان اسباب کی بنا پر یہ تبدیلی نامناسب معلوم ہوتی ہے اور اگر عام طور سے پوچھا جائے تو لوگ انگریزی کو ترجیح دیں گے۔ ہم نے سنا ہے کہ بہت سے باثر مسلمان اور ہندوؤں نے اس تبدیلی کے خلاف حکومت کو لکھا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ انگریزی کا سوال نہ ہو تو اور کسی قسم کی لسانی تبدیلی مصلحت کے خلاف ہے۔ مسٹر ایڈن (بنگال کے لفٹنٹ گورنر) حال ہی میں بہار کا دورہ کر کے لوٹے ہیں۔ وہ ازراہِ انصاف کہہ دیں کہ عوام کی زبان کون سی ہے۔ کیا انھوں نے پڑوس کے صوبہ جاتِ شمال و مغرب کی عدالتوں کی زبان نہیں دیکھی۔ اس شہادت کے بعد کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔"

بہ ہر حال اُردو والوں کو مایوس نہ ہونا چاہیے کیوں کہ ان کی منجھی ہوئی زبان میں زندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور ۱۸۳۳ء میں فارسی کا استعمال ترک ہو جانے کے بعد اس نے متواتر ترقی کی ہے۔ حکومت کی معاندانہ روش کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا[1]۔ ڈاکٹر بلوک مین کی انگریزی اُردو ڈکشنری کا آٹھواں ایڈیشن میری نظر سے گزرا۔ اس کی مقبولیت میرے قول کی تصدیق کرتی ہے۔ مزید تصدیق کے لیے میں اودھ اخبار کے ایک دل چسپ مضمون کا حوالہ دے سکتا ہوں[2]۔

---

[1] لندن ٹائمس (رباعت)، نومبر ۱۸۷۶ء میں پروفیسر مونیر ولیمس نے حکومت سے یہ بالکل بجا مطالبہ کیا ہے کہ انگریزی کی بجائے ہندستان کی قومی زبان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ [2] ۱۱ جون ۱۸۷۷ء

یہ اس بحث کے متعلق ہو جو 'وکیلِ ہندستان' اور 'سفیرِ ہندستان' میں چھڑی ہوئی ہو۔ بحث کا موضوع یہ ہو کہ پنجاب یونی ورسٹی میں 'پنجابی پڑھانی چاہیے یا نہیں۔' 'وکیل' کہتا ہو کہ نہیں اور 'سفیر' اس ہندی بولی کے حق میں ہو۔ اودھ اخبار نے لکھا ہو کہ گو کہ بول چال کی زبان پنجابی ہو لیکن اُردو کو زیادہ سے زیادہ چلن دینا قومی مفاد کے لیے مناسب ہو۔ پنجاب کا تعلیم یافتہ طبقہ اُردو لکھتا اور اُردو بولتا ہو۔ مقامی بولیوں کی حوصلہ افزائی اب یورپ میں بھی نہیں کی جاتی۔ اخبار نویس اپنے حق میں یہ دلیلِ قاطع دیتا ہو کہ گو کہ پنجاب سے بہت سے اخبار نکلتے ہیں لیکن وہ سب اُردو میں ہیں ایک بھی پنجابی میں نہیں۔ جب اُردو اس قدر مقبول ہو تو اس کی ترویج کیوں نہ کی جائے۔

پچھلے سال میں نے لکھا تھا کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے انگریز طلبا کو شکایت ہو کہ ملازمتوں کے معاملے میں حکومتِ ہند ان پر ہندستانیوں کو ترجیح دیتی ہو۔ لیکن اب ہندستانی شکایت کرتے ہیں کہ حکومت انگریزوں کی ترجیح کرتی ہو[1]۔ سرکاری ملازم کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ انگریزی جانتا ہو بلکہ اس پر کامل عبور ضروری ہو۔ یہ اُسی وقت ممکن ہو جب انگریزی کی تعلیم کما حقہ حاصل کی جائے اور اس کے لیے انگلستان میں رہا جائے۔ ہندستانیوں کو خاموش کرنے کا یہ اچھا ڈھب ہو۔ خیر سے سارے ہندستان میں یہ دستور نہیں۔ حکومتِ بنگال نے فیصلہ کیا ہو کہ صوبے کی بہت سی

---

[1] پنجابی، ۷ اپریل ۱۸۷۰ء

عدالتوں میں انگریز اور ہندستانی ججوں کی مساوی تعداد ہو اور ان کی تنخواہ اور پوزیشن میں کوئی فرق نہ ہو[1]

ہندستانی اخباروں نے اطلاع دی ہے کہ اعلا ملازمتوں پر ہندستانیوں کو تعنات کرنے کی ایک تجویز پر حکومت غور کر رہی ہے اور امیدواروں کا امتحان ہندستان میں ہوگا۔

تعلیم کی غرض سے ہندستانیوں کو انگلستان کیوں جانا چاہیے۔ اس کے متعلق پنجابی لکھتا ہے کہ[2]: "یہ امر امید افزا ہے کہ ہمارے رؤسا اور شرفا مغربی علوم و فنون کی قدر و قیمت سے واقف ہونے لگے ہیں۔ سنا ہے کہ نواب مالیر کوٹلہ کے بھائی محمد عنایت علی خاں تعلیم کی غرض سے دو سال کے لیے انگلستان جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے نوجوان بہت بڑی تعداد میں ان کی پیروی کریں گے۔

اب بھی ایسے خدا کے بندے ہیں جو کنویں کے مینڈک کی طرح اسی ملک میں بند رہنا چاہتے ہیں۔ اسلام نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔ البتہ عیسائیوں کی محبت سے کسی کو پرہیز ہو تو دوسری بات ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جو مسلمان انگلستان سے لوٹتے ہیں، عوام انھیں بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔ کوئی انھیں عیسائی کہتا ہے تو کوئی دہریہ۔ ہندوؤں کے ساتھ تو اور بھی مشکل ہے۔ کیوں کہ ملیچھ کی سنگت میں رہنے کے سبب سے وہ فوراً ذات باہر کر دیے جاتے ہیں۔ غرض کہ ہندستانی کے لیے ولایت جانا کالے دارد۔

---

[1] علی گڑھ اخبار ۱۳ اپریل ۱۸۶۸ء

[2] ۱۴ اپریل ۱۸۶۸ء

یوں تو ہندو ساری دنیا سے تجارت کرتے ہیں لیکن دیس باہر جانا پاپ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی حکومت ہندستان تک محدود رہی۔ لیکن جنھوں نے اس حدبندی کو توڑا ان کے جھنڈے دنیا میں ہر طرف بلند ہوتے۔ اب تو ہندو ایسے متعصب ہو گئے ہیں کہ ہندستان سے باہر قدم رکھنے کو بہت بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑی جہالت اور کیا ہوسکتی ہے۔ حکومتِ وقت کا تقاضا ہے کہ جو شخص مغربی علوم اور برطانیہ کے طور طریق سے واقف نہیں وہ کسی اچھی اسامی کا اہل نہیں سمجھا جاسکتا۔ دلّی دربار میں گورنر جنرل نے صاف صاف یہ کہہ دیا کہ جو لوگ سرکاری ملازمت کے خواہاں ہیں ان کے لیے ازبس ضروری ہے کہ حکومت کی مرضی کا پاس رکھیں اور اس لحاظ سے انھیں ولایت جانے کی آسانی ملنی چاہیے۔ اس کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ قابل نوجوانوں کو تعلیمی سفر کے وسائل بہم پہنچانے کے لیے ایک کمیٹی بنانی چاہیے اور اسے چندہ جمع کرنا چاہیے۔ حکومت یقیناً اس کارِ خیر میں امداد کرے گی۔ جو یورپین ہمارے بہی خواہ ہیں وہ بھی اس کمیٹی کی مدد کریں گے۔ اگر اس کمیٹی کی شاخ ہر صوبے میں قائم ہوجائے تو کام میں بڑی سہولت ہوگی۔ اخراجات کا سوال ہے ورنہ ہونہار طلبا کی کمی نہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ولایت کے سفر میں مذہبوں کا اڑنگا نہ لگانا چاہیے۔ اس ضمن میں تمام مذہبی پیشواؤں کا رویّہ ایک ہونا چاہیے تاکہ ہندو یا مسلمان طلبا عوام کی حقارت کے ہدف نہ بنیں یہ بھی ممکن ہے کہ طلبا کے ساتھ ان کی قومیت کے مطابق مسلمان

اور ہندو باورچی بھیج دیے جائیں۔ پھر تو کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ رہے گی۔

اس معاملے میں کسی ایسے آدمی کو پہل کرنی چاہیے جس پر انگریزی اور ہندوستانیوں کو پورا اعتبار ہو اور جو انگلستان میں ہندستانیوں کی تعلیم کا معقول انتظام کرسکے۔ ہماری رائے میں اس کے لیے ڈاکٹر لائیٹنز سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ وہ یورپ اور ہندستان میں یکساں ہردل عزیز ہیں۔ اگر اس تحریک کی ذمے داری اُن کے سپرد کی گئی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہندستانی طلبا کے مفاد کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔

ہر وہ ہندستانی جسے ملک کی عزّت کا پاس ہے، ہماری تجویز کی تائید کرے، اس کا فرض ہے کہ اس قسم کی کمیٹی بنائے، اس کے لیے چندہ جمع کرے اور ہندستانیوں کو مغرب کے علوم وفنون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ بھیجنے کا انتظام کرے۔"

خبر ہے کہ ڈاکٹر لائیٹنز جن کا ذکر اوپر آیا ہے، اس غرض سے انگلستان جارہے ہیں کہ وہاں ہندستانی طلبا کو یونی ورسٹی کے امتحانوں اور سول سروس کے لیے تیار کرنے کی غرض سے ایک اسکول بنائیں۔ رسوم اور طریقوں کی پابندی کی پوری آزادی ہوگی۔ انھیں لندن کی دل فریبیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شہر سے باہر کسی صحت افزا مقام میں رکھا جائے گا۔ برہمن باورچی رکھے جائیں گے اور گنگا جل لانے کا خاص انتظام کیا جائے گا تاکہ جو ہندو ولایت آئیں، ان پر کسی قسم کا اعتراض نہ ہوسکے۔ یہ بھی

۱؎ INDIAN MAIL ۹ رجون ۱۸۷۷ء

اسی قسم کی تجویز ہی جو پروفیسر مونیر ولیمس کے ذہن میں ہی اور جس کا ذکر میں پچھلے مقالے میں تفصیل سے کر چکا ہوں۔ معلوم ہوتا ہی کہ پروفیسر صاحب کی تجویز پر جلد عمل شروع ہوگا کیوں کہ عمارت کی تعمیر کے لیے جتنی رقم کی ضرورت ہی اس میں سے آدھی سے زیادہ جمع ہو چکی ہی۔ وہ صرف ہندستانی تہذیب سے متعلق کوئی ادارہ نہیں بنانا چاہتے بلکہ ان کا مقصد عالم گیر ہی۔ مشرقی علوم کے مطالعے کا سارا سامان یہاں جمع کیا جائے گا جس میں کتب خانے کے علاوہ ایک میوزیم بھی ہوگا۔

ولایت کے تعلیمی سفر کا ذکر کرتے ہوئے علی گڑھ اخبار نے لکھا ہی[1]: "اب تک ہمارے ملک نے خاطر خواہ ترقی نہیں کی ہی۔ ہمارے رہنے سہنے اور سوچ بچار کے طریقوں میں اب تک ایامِ جہالت کی جھلک باقی ہی۔ ہمارے کردار میں بھی کسی قسم کا فرق پیدا نہیں ہوا۔ ہم اب تک لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ تجارت اور علم کے میدان میں ہماری کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ اپنی ضروریات کا سامان غیر ملکوں سے منگانے کو ہم مجبور ہیں۔ یہ سامان چین اور یورپ سے آتا ہو۔ روزمرّہ کی ضروریات کے لیے بھی ہم دوسروں کے محتاج ہیں۔ یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ ہماری شریعت اور شاستروں میں اور حکومت وقت کے قوانین میں قیامت تک مطابقت باقی رہے گی۔ اس زبوں حالی کو دیکھ کر کس آدمی کا دل نہ بھر آئے گا۔ افسوس اس کا ہی کہ ہمیں اپنی پستی اور ذلت کا

---

[1] ۱۳ اپریل ۱۸۶۸ء۔ گارساں دتاسی اُردو سے فرانسیسی ترجمہ کیا ہی۔ اب اس فرانسیسی عبارت سے اُردو میں ترجمہ کیا جاتا ہی۔

مطلق احساس نہیں اور اپنے انحطاط سے ہم کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ آخر ہماری اصلاح اور ترقی کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ جدید علوم وفنون سے آشنا ہونے کے لیے اب تک ہم نے باقاعدگی سے کسی تدبیر پر عمل نہیں کیا۔ مغرب کی روشنی سے مشرق کی تاریکی کو اُجالنے کے لیے ہم نے اب تک کچھ نہیں کیا۔ ہم تک اُس روشنی کی ایک آدھ کرن پہنچی بھی ہے تو اِدھر اُدھر سے چھن کر۔ ہمیں نہایت غلط طریقے سے انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ حالاں کہ حکومت میں بہت سی خامیاں ہیں، لیکن اسے ہمارے حقوق کا خیال ہے اور اُس نے ملازمت کے دروازے ہم پر کھول دیے ہیں اور ہمیں اپنی اصلاح کا راستہ سجھایا ہے۔ لیکن ہم اس قدر کاہل ہوگئے ہیں کہ اس برکت سے فائدہ اُٹھانے کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ اگر راجہ اور نواب اس طرف توجہ کریں تو ہندستانی طلبہ بہت بڑی تعداد میں انگلستان جاسکتے ہیں اور وہاں کے علم وہُنر سے بہرہ مند ہوکر اس ملک کو شاہ راہِ ترقی پر چلا سکتے ہیں۔ ہم ان سے اپیل کرتے ہیں کہ اس معاملے کی اہمیت پر غور کریں۔ سرسالار جنگ کو لائق معاونوں کی ضرورت ہے لیکن ہندستان کے مسلمانوں میں چراغ لے کر ڈھونڈیے کوئی کام کا آدمی نہیں ملتا۔ اگر ہماری رائے پر عمل کیا گیا تو ہزاروں ہندستانی تھوڑے سے عرصے میں جدید علوم پر عبور حاصل کریں گے اور ان کی مدد سے ملک جتنی ترقی کرلے گا اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔"

علی گڑھ اخبار کے ایک دوسرے نمبر میں سرسید احمد خاں نے

انگریزی اور اُردو میں اسی مسئلے کو زیادہ وضاحت سے لکھا ہے[۵۱] مس کارپینٹر نے ہندستانی طالبات کو مغربی تعلیم دینے کی تحریک شروع کی ہے اُس نے بمبئی اور مدراس کے شعبہ ہائے تعلیمات کو لکھا ہے کہ جو لڑکیاں تعلیم کی غرض سے ولایت آئیں گی میں بلاکسی عوض کے ان کی نگرانی کروں گی[۵۲]

دِلّی دربار کے بعد ۶ر جنوری کو وائسرائے پٹیالہ تشریف لے گئے اور بڑے تزک و احتشام سے کم عمر مہاراجا کی تخت نشینی کی رسم ادا کی۔ پھر وہ کالج کا سنگِ بُنیاد رکھنے کی غرض سے علی گڑھ گئے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ اسلام ہر قسم کی ذہنی ترقی کے حق میں ہے۔ مغرب اپنے علم کے لیے مشرق کا مرہونِ منت ہے اور اس وقت اس قرض کو واپس کر رہا ہے۔ لارڈ لٹن نے سید صاحب اور دوسرے اصلاح پرور مسلمان اکابر کی بڑی تعریف کی[۵۳]

سہارن پور کے مسلمانوں نے آج سے گیارہ سال پہلے عربی کا ایک مدرسہ بنایا تھا۔ اس عرصے میں ہزارہا طالب علم وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکل چکے ہیں اور سہارن پور کے علاقے کو اِس اِدارے نے خاص طور پر فائدہ پہنچایا[۵۴]۔ یہ مدرسہ چندے سے چلتا ہے اور اخباروں نے چندہ دہندگان کی فہرست چھاپی ہے۔

---

۵۱ ۲۷ر اپریل ۱۸۷۷ء

۵۲ INDIAN MAIL ۲ر جون ۱۸۷۷ء

۵۳ INDIAN MAIL یکم فروری ۱۸۷۷ء

۵۴ اودھ اخبار ۱۶ر جنوری ۱۸۷۷ء

"مسلمانو، خوابِ خرگوش سے جاگو!" کے عنوان سے 'پانیر' نے ایک مضمون لکھا ہے۔ اس نے کشن گڑھ کے مسلمانوں کی ایک عرضی کا حوالہ دیا ہے جو حکومتِ بنگال کے آگے پیش ہے۔ اس میں شکایت کی گئی ہے کہ بنگال کے مسلمان انگریزی سے ناواقف ہیں اس لیے تمام ملازمتیں ہندوؤں کو دے دی گئی ہیں۔ جس جج کے پاس یہ عرضی پہنچی اس نے حاشیے میں لکھ دیا کہ مسلمان اپنی زبان کی طرف سے بھی بے پروا ہیں۔ اگر ان میں لیاقت نہیں تو حکومت کیوں کر اپنا کام بند کر دے۔ اسے تو بہرحال لائق ملازموں کی ضرورت ہے خواہ کسی قوم کے ہوں لیکن صوبے کے لفٹننٹ گورنر نے حکم دیا ہے کہ مسلمانوں سے انصاف کا سلوک ہونا چاہیے اور ہندوؤں کی بے جا طرف داری نہ کی جائے۔

اب تک ہندستان میں یورپین تعلیم کی ترویج کیا کرتے تھے۔ اس کے صلے میں والیانِ ریاست نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کے خرچ سے انگریز حکّام کی لڑکیوں کے لیے شملے میں ایک کالج قائم کیا جائے۔[1]

یورپینوں کی دیکھا دیکھی بعض ہندستانیوں میں بھی تعلیمِ نسواں کا چرچا ہو چلا ہے۔ یہ لوگ بڑے جوش وخروش سے عورتوں میں تعلیم کی اشاعت کر رہے ہیں اور ایسا نہیں کہ انھیں کامیابی نہ ہوتی ہو۔ اس کے متعلق مجھے کچھ تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ کچھ لڑکیاں حصولِ تعلیم کے لیے یورپ آئی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک کا نام نشی کانت چیٹرجی ہے۔ لیپزگ یونی ورسٹی سے ڈپلوما لینے کے بعد اسے سینٹ پیٹرس برگ (روس) میں سنسکرت، بنگالی اور ہندستانی کے پروفیسر کی جگہ مل گئی۔

---

[1] Indian Mail ۱۹ مارچ ۱۸۷۸ء

سال رواں کے آغاز میں علی گڑھ میں مسلمانوں کے شان دار کالج کا قیام مغربی تعلیم سے اس قوم کے وصال کی گویا پہلی ساعت ہے۔ یہ مسلمان اصلاح پسوروں کی سب سے بڑی جیت ہے۔ قدامت پسند مسلمان پہلے اس تجویز کے مخالف تھے اور سید صاحب پر اشاعتِ الحاد کا الزام لگاتے تھے۔ سر سالار جنگ نے کالج کی جو امداد کی، وہ دربارِ حیدر آباد کی برہمی کا باعث ہوئی لیکن رفتہ رفتہ تعصب کی گرد چھٹتی گئی اور اب شمالی ہند کے بہت سے سربرآوردہ مسلمان ان کے حامی ہیں۔ دو سال پہلے چندہ سے بہ مشکل تین لاکھ رُپے جمع ہوئے تھے اور یہ مطلوبہ رقم کے پانچویں حصے سے زیادہ نہ تھا لیکن سر ولیم میور نے علی گڑھ میں جو ولولہ انگیز تقریر کی، اس نے آن کی آن میں ڈیڑھ لاکھ رُپے کا اضافہ کر دیا۔

کالج دو شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک میں سائنس اور آرٹ کی تعلیم دی جائے گی اور اُس کی تنظیم میں برطانی یونی ورسٹیوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ دینیات کی تعلیم کا خاص انتظام ہے۔ اس شعبے کے لیے ساٹھ وظیفے مقرر کیے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک کی مالیت دس سے پچیس رُپے ماہانہ تک ہے۔ انگلستان کے مقابلے میں یہ رقم حقیر معلوم ہوگی لیکن ہندستان میں ایک طالبِ علم چند رُپے میں رہ سکتا ہے۔ ہر سال سب سے ذہین چھ طلبا کا انتخاب کیا جائے گا، وہ 'فیلو' کہلائیں گے اور انھیں چھ سو رُپے سالانہ کا وظیفہ ملے گا۔ اگر وہ چاہیں تو یہ وظیفہ سات سال تک جاری رہے گا۔

نارائن سنگھ نے ویدوں کی تعلیم کے لیے الہ آباد میں ایک

پاٹ شالا کھولا ہی۔ اس کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہی جس کے آٹھ ارکان ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سال میں پچاس رُپے دیتا ہی جس سے پاٹ شالا کا خرچ چلتا ہی۔ ہندستانی میں پڑھائی ہوگی۔ الہ آباد میں سنسکرت کا ایک اسکول عرصے سے قائم ہی۔ وہاں بھی اسی طریقے پر عمل ہوتا ہی۔

سر سالار جنگ کے ایما پر حیدر آباد کے رئیسوں نے جاگیرداروں کے لڑکوں کے لیے ایک کالج قائم کیا ہی۔ سر سالار جنگ نے اپنے دو بیٹوں کو اس میں داخل کیا ہی۔ اس کا نام 'مدرسۃ العالیہ' ہوگا اور یہ ہر معاملے میں علی گڑھ کالج کی پیروی کرے گا۔ اس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندؤ اور انگریز بھی داخل ہو سکیں گے۔ انتظام ایک خاص کمیٹی کے سپرد ہوگا۔ بمبئی کے منشی غلام محمد اپنی قوم میں تعلیم کی اشاعت کے سلسلے میں اچھا کام کر رہے ہیں۔

صوبہ جاتِ شمال و مغرب کے 'برٹش انڈین ایسوسی ایشن' کے صدر سید احمد خاں ہیں۔ اس نے پارلیمنٹ سے درخواست کرنے کا فیصلہ کیا ہی کہ سول سروس کے امیدواروں کی عمر ۲۲ سے گھٹا کر ۲۱ سال کر دی جائے۔ بابو سریندر ناتھ بنرجی اس کی کوشش کے لیے انگلستان جانے والے ہیں۔

(۵)

پچھلی مرتبہ میں نے 'آریہ سبھا' کا ذکر کیا تھا۔ اب اخبار انجمنِ پنجاب کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ الہ آباد میں یہ سبھا اس مقصد سے قائم ہوئی ہی کہ قصّے کہانیوں کا ترجمہ ہندی میں کرے۔ اس کا ارادہ ہی کہ سنسکرت

بنگالی، گجراتی وغیرہ کے افسانوی ادب کو ہندی میں منتقل کرے۔ چندے سے ڈھائی ہزار روپیہ جمع کیا جائے گا اور اس سرمایے سے کتابیں شائع ہوں گی۔ اشاعت سے پہلے پنڈتوں کی کمیٹی مسودوں کی تصحیح کرے گی۔

اخبار نویس نے لکھا ہے[۱] کہ: "ہمیں یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ہندی ادب کو فروغ دینے کی غرض سے یہ سبھا بنی ہے۔ امید ہے کہ اس کی کوشش سے ہندی قعرِ پستی سے نکل کر بلند مرتبہ حاصل کرے گی۔ لیکن سبھا کی یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی کہ محض قصّے کہانی کی کتابوں کی اشاعت کرے گی۔ ہر سمجھ دار آدمی کہے گا کہ رومانوں اور افسانوں کا مطالعہ محض تضیعِ اوقات ہے۔ ایسی بے کار کتابوں کی اشاعت سے لوگوں کا سراسر نقصان ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ اہلِ وطن اب تک سنجیدہ چیزوں کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ اگر وہ بے کار چیزوں میں وقت گنوائیں گے تو یہ وقت و محنت کی بربادی ہے۔

اس سبھا کو ہم مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ وہ بہ خوشی ہندی کی کی ترقی کے لیے ہی کوشاں رہے لیکن مفید علوم و فنون کی کتابوں کو دوسری زبانوں سے منتقل کرے، اس میں سنسکرت یا انگریزی کی قید نہ ہونا چاہیے۔ اگر وہ ثابت قدمی سے اس راہ پر چلے گی تو ملک کا بھلا ہوگا اور اس کا نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ایشیا کو اب بھی جن اور پریوں کے قصّوں کا چسکا ہے، لیکن ہمیں یہ روش ہرگز پسند نہیں۔ ہمیں تو ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جس سے ملک کا فائدہ ہو"

اندور میں ایک مجلس مناظرہ ہے۔ مہاراجہ دتّیا کے بھائی نے

---

[۱] ۲۳ نومبر ۱۸۷۱ء

اُس کے کتب خانے کو تیئیس کتابوں اور پچاس رُپوں کا عطیہ دیا ہے۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن برابر بڑھ رہا ہے۔ اخبار پنجابی نے اس کی شاخِ لاہور کے کئی جلسوں کی رویداد چھاپی ہے۔ بنگال کے لفٹنٹ گورنر کی صدارت میں اس کی ایک نئی شاخ قائم ہوئی ہے۔ ایسوسی ایشن کا خاص مقصد یہ ہے کہ ہونہار اور لائق طلبا کو انگلستان جانے کی سہولت فراہم کرے۔ انھیں ولایت کے متعلق معلومات پہنچائی جاتی ہیں۔ اور ایسوسی ایشن کی شاخِ لندن کے ارکان کے نام تعارفی خط دیے جاتے ہیں تاکہ وہ پردیس میں ان کی مشکلات کو آسان کریں[۵]۔

یہاں میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اور اس قسم کی دوسری تاریخی انجمنوں کا ذکر کرسکتا ہوں لیکن یہ مقالے کے احاطے سے باہر کی چیز ہے۔

نیا گاؤں بندیل کھنڈ میں اخبار بینوں کی انجمن چھ سال سے قائم ہے اور برابر ترقی کر رہی ہے۔ اس کا سالانہ جلسہ گزشتہ ۱۱ر مارچ کو ہوا تھا۔ سکریٹری کی رپوٹ نہایت دل چسپ تھی۔ انجمن انگریزی کے دو اخبار منگواتی ہے: 'پائنیر' اور 'ہندو پیٹریاٹ'۔ ہندستانی اخباروں کے نام یہ ہیں: اودھ اخبار، کوہِ نور، رہبرِ ہند، گجرانوالہ، ریاض الاخبار آگرہ اخبار، علی گڑھ اخبار اور لارنس گزٹ۔ انجمن کے ارکان کو ادبی مضامین اور نئی کتابوں کے اشتہار سب سے زیادہ پسند ہیں[۶]۔

---

[۵] INDIAN MAIL ۱۴ر دسمبر ۱۸۶۷ء

[۶] اودھ اخبار ۲۳ر مارچ ۱۸۶۸ء

انجمنِ ہند کے صدر منشی پیارے لال اور اودھ اخبار کے مالک منشی نول کشور کی تحریک پر لاہور میں یکم اپریل کو ایک جلسہ اس غرض سے ہوا کہ بیاہ شادی کی فضول خرچی کی روک تھام کی تدبیر سوچے[1]

اسی طرح کا ایک جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ اودھ اخبار نے بالتفصیل اس کی روئیداد شائع کی ہے۔ مشکل یہ کہ جو لوگ اس اصلاح کی زبانی تائید میں سب سے پیش پیش ہیں، عمل کے وقت وہ بہت برا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ حال ہی میں مہاراجا ٹمراؤں کی نواسی کی شادی میں چار لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔

پنجابی کی اطلاع ہے کہ مولوی سید امداد علی کی درخواست پر لارڈ لٹن نے...... سائنٹی فک سوسائٹی کی سرپرستی قبول کر لی ہے۔

احمد آباد میں قدیم ہندستانی صنعت کی حوصلہ افزائی کے مقصد سے ایک انجمن بنی ہے۔ اس کی طرف سے ایک نمائش بھی ہونے والی ہے جس میں ملکی آرٹ کے عمدہ نمونے جمع کیے جائیں گے۔ منشی نصرت علی دہلوی نے میری معرفت انگریز کمشنر مسٹر اودن کو خوش نویسی کے نمونے اور باقیاتِ دلی کی جو قلمی تصویریں بھجوائی تھیں، وہ فنی نقطۂ نظر سے لاجواب تھیں۔

پونہ میں ایک "سارو جنک سبھا" (انجمنِ رفاہِ عام) ہے۔ اس کے بانی اور مہتمم گنیش واسودیو ہیں۔ وہ کلکتہ، بنارس وغیرہ میں ہندستان کی ترقی کے ذرائع پر تقریریں کر چکے ہیں۔ سبھا کا پیغام لے کر وہ

---

[1] اودھ اخبار یکم اپریل ۱۸۷۶ء

یورپ جانے والے ہیں۔ سبھا بیواؤں کی شادی کا پرچار بھی کرتی ہی۔ اور شاید اسی کا اثر ہی کہ پونہ میں پہلی بار ایک جوان برہمن بیوہ اور ایک رنڈوے کا بیاہ دیکھنے میں آیا۔

کلکتہ کی انجمن اسلامیہ بڑے شوق سے علمی خدمت انجام دے رہی ہی۔ بنگال کونسل کے رُکن مولوی عبداللطیف خاں بہادر نے آج سے چودہ سال پہلے اس کی داغ بیل رکھی تھی اور وہی اس کے سکریٹری ہیں۔ مہینے میں ایک بار اس کا جلسہ ہوا کرتا ہی۔ انجمن کا مقصد ہی کہ بلاقیدِ زبان مسلمانوں کو علمی و ادبی تحریکوں سے باخبر رکھے۔ اس کی کوشش سے مسلمانوں میں تعلیم کا شوق بڑھ گیا ہی اور اس کے جلسوں کا ہر طرف چرچا رہتا ہی۔ حکومتِ بنگال اور کلکتے کے یورپین ایسوسی ایشن نے اس کی بہت تعریف کی ہی۔ اس کے ارکان کی تعداد تقریباً پانچ سو ہی اور ان میں سے ہر ایک انجمن کے کاموں میں تھوڑا بہت حصہ لیتا ہی۔ اس کا سالانہ جلسہ ٹاؤن ہال میں ہوا کرتا ہی جس میں ہر قوم و ملت کے افراد آتے ہیں اور علمی و ادبی مسئلوں پر آزادی سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ۱۸۶۹ء میں ڈیوک آف ایڈن برا انجمن کے سالانہ جلسے میں تشریف لائے تھے۔ اب کے انجمن کا ڈیپوٹیشن، بنگال کے نئے گورنر مسٹر ایڈن کے استقبال کے لیے گیا تو وہ اس سے بڑی عزت سے پیش آئے۔

مولوی عبداللطیف کے صاحب زادے عبدالرحمٰن تعلیم کی غرض سے انگلستان گئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر اسی قسم کی چھوٹی سی انجمن بنائی ہی۔ اس کا مقصد ہی کہ مغربی علم و ادب

سے طلبا کو شغف پیدا ہو۔ یہ لوگ 'مدرسہ لٹریری گزٹ' کے نام سے ایک رسالہ نکالتے ہیں جس میں نظم و نثر کے عمدہ نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔

انجمنِ اسلامیہ بمبئی نے سالِ گزشتہ کی رپوٹ شائع کی ہے۔ اس کا اصل مقصد مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت ہے اور وہ اس پر مستعدی سے کاربند ہے۔

ایک انجمن ادب عامہ بھی ہے[1] اس کا نظریہ یہ ہے کہ مروّج زبانوں میں مثلاً اردو، تامل، تیلگو وغیرہ میں انگریزی کی دل چسپ اور ساتھ ساتھ کارآمد کتابوں کا ترجمہ کیا جائے۔ اس نے ہندستانی کہاوتوں کا ایک مجموعہ حال ہی میں شائع کیا ہے۔

اودھ اخبار کا بیان ہے کہ[2] "یوں تو ہندستان میں بہت سے میلے لگا کرتے ہیں لیکن بتار کا میلہ اپنے قسم کی ایک ہی چیز ہے۔ جنھوں نے اسے دیکھا ہے وہ اس کے انوکھے پن کی تصدیق کریں گے۔ اس میں جنگلی اور پالتو جانور لاکھوں کی تعداد میں بکری کے لیے آتے ہیں۔ ایک شخص نے حساب لگا کر بتلایا ہے کہ صرف گھوڑوں کو لیجیے تو ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہوتے۔ ایسا عجیب و غریب میلہ اور کہاں لگتا ہوگا۔ گو کہ اب گھوڑوں کی مانگ کم ہوگئی ہے۔ لیکن فوجیوں، تاجروں، راجاؤں اور شوقینوں کو اب بھی ان کی ضرورت ہے اور وہ سب گھوڑوں کی تلاش میں یہاں آتے اور ہزاروں کا سودا کرکے جاتے ہیں۔ جانوروں کے علاوہ ملک بھر سے انواع و اقسام کا

---

[1] نومبر ۱۸۶۴ء JOURNAL OF THE NATIONAL INDIAN ASSOCIATION

[2] ۱۲ نومبر ۱۸۶۴ء

کا بساماں خرید و فروخت کی غرض سے یہاں آتا ہی......

ہر سال جیٹھ کے مہینے کے آخر میں نیپال کی بستی جنگ پور کے پاس ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہی جہاں دیس بہ دیس کے بے شمار آدمی جمع ہوتے ہیں۔ یہاں زمانۂ قدیم کے ہندو مندر ہیں۔ اس جگہ دو روز میلہ لگتا ہی۔ پھر سیلانی سیتا مڑھی کا رُخ کرتے ہیں جہاں سیتا دیوی نے جنم لیا تھا۔ یہاں بھی میلے کی گھما گھمی ہوتی ہی اور لاکھوں کا بیوپار ہوتا ہی۔ اس سال یہاں خاص طور پر رونق رہی اور انتظام اتنا اچھا تھا کہ کسی کو شکایت نہ ہوئی۔ روگی بھی جنگل میں منگل مناتے رہے۔

سیتا مڑھی سے پندرہ کوس کے فاصلے پر ایک مقام سارن گڑھ ہی، یہ بھی نیپال راج میں ہی۔ یہاں پُرانے مندروں، محلوں اور بازاروں کے عظیم الشان کھنڈر دوٗر دوٗر تک پھیلے ہوتے ہیں۔ انسانوں اور حیوانوں کے مجسّمے لاکھوں کی تعداد میں اس اُجڑے ہوتے شہر کو آباد کر رہے ہیں۔ قرب و جوار کے باشندوں کا بیان ہی کہ کسی نے خدا کو اتنا ناراض کیا کہ تمام جان دار پتھر کے ہو گئے۔ اس خراب آباد کو دیکھ کر اس قصّے کی صحت پر اعتبار کرنا پڑتا ہی۔ ورنہ یہ کیوں کر ممکن ہی کہ لاتعداد مجسّمے جن میں صرف جان پڑنے کی دیر ہی، بنا کر یوں چھوڑ دیے جائیں اور ایک پورا شہر غیر آباد ہو جائے۔ بہرحال کسی کو عبرت حاصل کرنا ہو تو اسے جا کر دیکھ آئے[1]

اب ذرا کشمیر کے 'چھرار' نامی مقام کے میلے کا حال سنیے: "چھرار

---

[1] اودھ اخبار ۲۷ نومبر ۱۸۶۸ء اور ۱۳ اپریل ۱۸۶۹ء

پرگنہ تگم کا ایک قصبہ ہو۔ یہاں سے دس کوس کی دوری پر شیخ نورالدین کا مزار ہو جس کی زیارت کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ میلا ہرسال بڑی دھوم دھام سے لگتا ہو ہندو مسلمان ہزاروں کی تعداد میں یہاں دو تین ہفتے کے لیے جمع ہوتے ہیں اور کھیل کود اور ناچ رنگ کی محفل سجاتے ہیں۔ ہندوؤں کا بیان ہو کہ مزار دراصل ایک رشی سہجانند نامی کا ہو، کیوں کہ یہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے اس لیے ہندو مسلمانوں میں کوئی تمیز نہ کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ہندوؤں نے اپنے جلانے کا اور مسلمانوں نے دفن کرنے کا ارادہ کیا۔ مسلمانوں کی چل گئی اور انھوں نے لاش کو دفن کرکے اس پر مقبرہ بنا دیا۔ مقبرہ بن کر تیار ہوا تھا کہ ایک دھماکا ہوا اور مقبرہ کھل گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ کفن چاک چاک ہو اور لاش غائب ہوگئی ہو[1]۔

پنجابی کی رائے ہو کہ اس روایت سے کم سے کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہو کہ یہ بُزرگ ہندو مُسلم اتحاد کے عَلَم بردار تھے، اسی وجہ سے دونوں قوموں کو اِن سے عقیدت تھی[2]۔

لیکن پچھلے سال ایک میلے میں افسوس ناک حادثہ ہوگیا۔ برہمنوں اور جوتشیوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ پاپ دھونے کے لیے ۲۵ر فروری کی تاریخ سب سے مناسب ہوگی۔ اس دن سب کو اجودھیا جاکر سرجو ندی کے اس گھاٹ پر نہانا چاہیے جہاں رام چندر جی نے اشنان

---

[1] کبیرداس کے جنازے کا قصہ بھی اس سے ملتا جلتا ہو۔

[2] ۲۵ر نومبر ۱۸۶۵ء۔

کیا تھا۔ جہاں چہ بارہ لاکھ ہندو اس مہورت میں نہانے کے لیے وہاں جمع ہوئے۔ ایسی بھیڑ لگی کہ تین چار سو ہندو وہاں کچل کر مر گئے۔ اس کی تفصیل اس قدر بھیانک ہے کہ میں اسے تحریر نہیں کرنا چاہتا۔ بھیڑ یا دھسان کے سوا اس حادثے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے۔

(۶)

اسلام کے خلاف مغرب کا تعصب روز بہ روز کم ہوتا جاتا ہے۔ پچھلے سال میں نے مسٹر بورسورتھ اسمتھ کی کتاب کا ذکر کیا تھا۔ اس مرتبہ میرے انگریز شاگرد مسٹر لا لسبری Salisbury نے ایک عالمانہ کتاب اسلام کی حمایت میں لکھی ہے۔ سید امیر علی سے ہم نوا ہو کر انھوں نے لکھا ہے کہ: "وہ دن جلد آئے گا جب اسلام قالب کی قید سے نجات پاکر اپنی روح کو پہچانے گا اور عیسائیت کے دوش بہ دوش شاہراہِ تہذیب پر گام زن ہوگا۔ کیوں کہ دونوں کا مقصد ایک ہے یعنی انسانیت کی برتری۔ دونوں میں تضاد کی کوئی وجہ نہیں۔"

مسٹر Salisbury کی نجی رائے ہے کہ اسلام قدیم یہودیت کا نیا روپ تھا۔ ان کی طرح میرا بھی خیال ہے کہ اسلام اپنے زمانے کے لیے ضروری تھا اور اس نے کلامِ ربانی کی یاد از سرِ نو تازہ کی۔ عیسائیت کے انحطاط اور شرک و کفر کے فروغ کے زمانے میں اس نے دنیا کو اخلاق و اخوت کا پیغام سنایا۔ روحانیت کے بجھتے ہوئے چراغ کو اس نے اکسایا اور مسلمان فلسفیوں نے کمالِ رواداری سے یونانی فکر کے جوہر کو زندہ کیا۔ محمد پرستی کا بہتان صریحاً بے بنیاد ہے۔ کیوں کہ انجیل کی طرح قرآن بھی انسانی

کو آزاد اور اپنے عمل کا ذمّے دار تصوّر کرتا ہی۔ انسان کو اس نے ضمیر اور عبادت کی کامل آزادی دی۔ اسلام کی ابتدا کے وقت ہم مسجد کے ساتھ کلیسا، آتش کدہ اور یہودیوں کے عبادت خانوں کا وجود پاتے ہیں۔ مشہور عالم Badger بے جر نے خوب کہا ہی کہ ترکوں پر عیسائیوں کی خوں ریزی کے الزام کو زیادہ اہمیت نہ دینی چاہیے کیوں کہ عیسائی فرقوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اس سے بھی بُرا سلوک کیا ہی۔

آکسفورڈ کے پروفیسر مونیر ولیمس کا یہ مشورہ بالکل صحیح ہی کہ پادریوں کو مسلمانوں سے بحث کرنے سے پہلے قرآن کا غائر مطالعہ کرنا چاہیے۔ پھر انھیں معلوم ہوگا کہ دونوں مذاہب میں کتنا اشتراک ہی اور اختلاف کی گنجایش بہت کم ہی۔ مسلمان انجیل کو آسمانی کتاب مانتے ہیں۔ البتّہ یہ الزام ضرور لگاتے ہیں کہ بعد میں اس میں خاصا تصرّف ہوا ہی۔ پادری Hughes ہیوز نے کہا ہی کہ "اسلام کی خامیوں اور اس کے پیغمبر کے کم زور پہلوؤں کو جانتے ہوتے بھی مجھے یہ ماننا پڑتا ہی کہ دنیا نے جو بڑے آدمی پیدا کیے ان میں سے وہ بھی ایک تھے۔" جون براؤن نے بھی یہی بات کہی ہی۔ مسٹر Dods ڈاڈز نے "محمدؐ، گوتم بدھ اور عیسیٰؑ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہی۔ اس میں کہتے ہیں کہ: "محمدؐ میں پیغمبروں کی دو خصوصیات بہت بیّن ہیں۔ ایک تو یہ جب دوسرے خدا سے منکر تھے انھوں نے اسے پہچانا اور ساری دنیا کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر حقیقت کا اعلان کیا۔ حق کی راہ میں انھوں نے جان و مال

کی کوئی پروا نہ کی اور اس لحاظ سے ان کا نام سب سے بہادر پیغمبروں کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ سال ہا سال وہ تکلیف جھیلتے رہے اور بڑے بڑے مظالم کے آگے سر نہ جھکایا۔" مسٹر STOBART اسٹوبرٹ نے بھی اپنی ایک نئی کتاب میں محمدؐ کے خلوص کا اعتراف کیا ہے اور اشاعت اسلام کی تاریخ انصاف سے لکھی ہے۔[۱] عربی زبان کے مشہور عالم مسٹر لین نے 'قرآن کے انتخابات' کے نام سے جو کتاب لکھی تھی، اس کا نیا ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ ان کے بھتیجے مسٹر POOLE نے اس پر جو دیباچہ لکھا ہے اس میں بھی اسلام سے انصاف برتا گیا ہے۔

اس کے ساتھ مسلمانوں میں مذہبی بیداری کے آثار ہر طرف نظر آرہے ہیں۔ خصوصاً وہابیوں کو عیسائیوں سے سخت عداوت ہے۔ ترکوں اور روسیوں کی اس جنگ سے پہلے سنی مسلمان خاموش تھے۔ کہیں پادری LONG لونگ نے ایک جلسے میں کہہ دیا کہ ترکوں کو اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ اس کے جواب میں میرزا پیر بخش نے کہا کہ روس کو سب سے پہلے اپنی آنکھوں کا شہتیر نکالنا چاہیے۔

علی گڑھ اخبار نے "روس کے مسلمان" کے عنوان سے حسب ذیل مضمون لکھا ہے: "کہا جاتا ہے کہ روسی عیسائی اب رواداری کا سبق پڑھ رہے ہیں اور ان میں پہلے کا سا تعصب نہیں رہا۔ اس رواداری کا ثبوت زارِ روس کے اس فرمان میں ملے گا کہ اگر اس کی رعایا کا کوئی فرد عیسائیت کے علاوہ کوئی اور مذہب اختیار کرے گا تو اسے جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔ دوسرے مذہب کا کیا ذکر اگر کوئی روسی کلیسا

---

[۱] Islam and Christianity لکھنؤ ۱۸۷۶ء

کے علاوہ کسی دوسرے عیسائی فرقے کا حلقہ بگوش ہونا چاہیے تو شہر سے نکال دیا جائے گا۔ اگر کوئی مذہب بدلنے کی ضرورت محسوس کرتا ہی تو اسے تہذیبِ نفس کے لیے پادریوں کے سپرد کر دیا جاتا ہی۔ اس کی جایداد ضبط کر لی جاتی ہی۔ اپنے فرقے سے باہر شادی کرنے کی ممانعت ہی اور ہر عیسائی بچہ خواہ مخواہ روسی کلیسا کی اولاد سمجھا جاتا ہی۔ کوئی نیا مذہبی فرقہ قائم کرنا قانوناً ممنوع ہی۔

ان سختیوں اور پابندیوں کے باوجود روس میں اسلام کا زور بڑھتا جاتا ہی اور اس کا حلقۂ اثر شمال کی طرف پھیلتا جاتا ہی۔"

اس میں شک نہیں کہ اِدھر تو عیسائی فرقوں میں ناچاقی بڑھتی جاتی ہی اُدھر مسلمان شیعہ سُنّی کی تفریق کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ سید احمد خاں اپنے کالج میں سُنّی اور شیعہ طلبا میں کسی امتیاز کی اجازت نہیں دیتے۔ ایک نام ور شیعہ شاعر منیر الایمان نے اخبار پنجابی میں ایک مثنوی شیعہ سنّی اتحاد پر شایع کی ہی۔ بہت سے شیعہ اکابر نے جی کھول کر اس کی داد دی ہی[1]۔

میرا خیال ہی کہ ہندستان کی اسلامی انجمنوں میں بھی اسی اتحاد کی فضا موجود ہی۔ یہ بہت ضروری ہی کیوں کہ ان انجمنوں کی تعداد برابر بڑھتی جاتی ہی۔ پنجابی نے لاہور کی انجمنِ اسلامیہ کے ایک جلسے کا حال لکھا ہی جو ۱۵ اپریل کو شاہی مسجد میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں شہر کے اکثر معزز مسلمان شریک تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ مسجدوں

[1] پنجابی ۲۱ اپریل ۱۸۸۰ء

میں شادیوں کے رجسٹر رکھنے چاہییں تاکہ اگر کسی میاں یا بیوی کی شکایت پہنچے تو تحریری ثبوت موجود ہو۔

اب تک حکومتِ ہند وہابیوں کو اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ اس سلسلے میں دلّی دربار کے موقع پر ایک اخبار نے لکھا تھا کہ "ایک وہابی لیڈر امیر خاں کو عمر قید کی سزا ملی تھی۔ وہ کلکتہ جیل میں قید ہیں۔ دربار کے موقع پر ان کے لڑکے اور لڑکی نے وائس رائے کی خدمت میں ان کی رہائی کی درخواست بھیجی۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ سال بھر پہلے کئی باأثر یورپین اور ہندستانی شرفا نے لارڈ نارتھ بروک سے ان کی سفارش کی تھی لیکن اسے قابلِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ امیر خاں کی عمر کوئی نوّے سال ہوگی۔ وہ اتنے کم زور ہو گئے ہیں کہ حکومت کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اس صورت میں امید ہے کہ لارڈ لٹن ان سے رحم کا سلوک کریں گے"[لے]

پہلے حکومت سارے وہابی فرقے کو اپنا دشمن خیال کرتی تھی اور ان سے ویسا ہی سخت سلوک کرتی تھی جس کی مثال یورپ کی تاریخ میں کم یاب نہیں ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ اب حکومت کا رویّہ بدلتا جاتا ہے۔ علی گڑھ اخبار کی اطلاع ہے[کے] کہ حکومتِ پنجاب نے وہابیوں کے متعلق جو فرمان نکالا ہے وہ اس کی انصاف پسندی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ فرمان ہر ترقی پسند حکومت کے شایانِ شان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاکموں نے خیالی شخص

لے Indian Mail ۲۹ جنوری ۱۸۷۷ء

کے ۲۹ دسمبر ۱۸۷۶ء

کے خوف سے نجات حاصل کرلی ہو اور اس بے بنیاد خوف کی وجہ سے وہ رعایا کو اس کے جائز حقوق سے محروم نہ رکھیں گے۔ حکومت تنگ دل اتنی نہیں کہ رعایا کے ایک طبقے کی نیت پر شبہہ کرے اور یہ اعتراف نہ کرے کہ ان پر جو تہمت لگائی گئی تھی وہ بے بنیاد تھی۔

یہ باور کرنا مشکل ہو کہ بلا سبب ایک پورا فرقہ موردِ عتاب قرار دیا جائے۔ اس فرقے کے عقیدے اور طریقے سے ہماری جو واقفیت ہو اس کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہوسکتا. یہ امر ثابت ہو چکا تھا کہ پنجاب کے وہابی اپنی فرماں برداری میں دوسروں سے کم نہیں۔ لہٰذا حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ ایک اعلان کے ذریعے ان کی نیک چلنی کی شہادت دے اور ان پر سے جھوٹے الزاموں کا داغ دھو دے شکر ہو کہ اس نے اپنے فرض کی پابندی کی۔ پنجاب کی وہابی جماعت نے ایک ایک اطاعت نامے میں اپنی فرماں برداری کا یقین دلایا ہو۔ امید ہو کہ اب ان سے ویسی ہی خوش سلوکی برتی جائے گی جو رعایا کے دوسرے افراد کے لیے روا رکھی گئی ہو۔ ظاہر ہو کہ چند آدمیوں کے جُرم کی سزا ایک پوری جماعت پر عائد نہیں ہوسکتی۔

حکومت نے اپنے فرمان میں اعلان کیا ہو کہ وہابیوں کو اپنے عقیدے کی پابندی کی کامل آزادی ہوگی بشرطے کہ وہ امنِ عامّہ کے خلاف کچھ نہ کریں۔ یہ شرط بہت مناسب ہو اور سب پر یکساں منطبق ہوتی ہو۔

اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہو کہ وہابیوں کو ان مسجدوں کے

استعمال کا حق نہ ہوگا جو دوسرے مسلمانوں کے سرمایے سے بنائی گئی ہیں۔ ہمارے خیال میں اس امتناع کا مطلب صرف یہ ہو کہ جو مسجدیں خاص فرقوں کے لیے مخصوص ہیں ان میں جاکر اپنے طریقے سے نماز پڑھنے کا حق وہابیوں کو نہ ہوگا۔ تمام مسجدوں کے دروازے ان کے لیے بند نہیں کیے جاسکتے۔ سرکاری اعلان کی یہ بات ہمیں خاص طور پر پسند آئی کہ جو وہابی سرکاری ملازم ہیں ان سے کسی قسم کا تعصب نہ برتا جائے گا اور انھیں مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔"

اس اعلان کی اشاعت کے موقع پر 'پنجابی' نے پالم پور کے پروفیسر عبدالرحمان کا مضمون وہابیوں کی تاریخ پر چھاپا ہو۔ اس کے پُراز معلومات اور دل چسپ ہونے میں شک نہیں۔ لیکن ایسی کوئی نئی بات نہیں ہو جو پہلے سے معلوم نہ ہو۔

علی گڑھ اخبار نے اُردو گائڈ کا ایک مضمون نقل کیا ہو[1] در اصل یہ ترجمہ ہو عربی کے مشہور عالم اور مسلمانوں کے مخلص بہی خواہ NASSEAULEE ناسولی کی تحریر کا۔ فاضل مضمون نگار نے ترکی سے مسلمانوں کی ہم دردی کو سراہا ہو اور ان سے اپیل کی ہو کہ روس کے خلاف متحد ہو کر اپنی حفاظت پر کربستہ ہوں۔ یہ اتحاد بہت پایدار ہو اور ہندستان میں شیعہ سنّی سبھی ملت کی حفاظت کے لیے مالی امداد کر رہے ہیں۔ عورتوں نے اپنے زیور اُتار کر دے دیے ہیں اور مسجدوں میں روس پر لعنت بھیجی جا رہی ہو۔

---

[1] ۱۶ فروری ۱۸۷۸ء۔ یہ مضمون لندن کے ایک اخبار میں شایع ہوا تھا۔

علی گڑھ اخبار نے ایک مضمون میں زارِ روس کا مقابلہ دجّال سے کیا ہے۔
اسی اخبار نے 'نظام الملک' نامی کتاب کی بڑی تعریف کی ہے۔
یہ روس اور ترکی کی جنگ پر ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے۔ میرزا
فیروز حسین دہلوی کی تصنیف 'فیروز نامۂ ترک' کا بھی بڑا چرچا ہے۔
یہ عثمانیہ سلاطین کی تاریخ ان کی تصویروں کے ساتھ ہے۔ ہندستانی
اخباروں میں موجودہ جنگ کے علاوہ اور کوئی خبر نہیں ہوتی۔
لوگوں کی دل چسپی کا یہ عالم ہے کہ اخبار میں اور کچھ نہیں پڑھنا چاہتے۔
جب کبھی ترکوں کی فتح ہوتی ہے مسجد میں نمازِ شکرانہ ادا کی جاتی ہے۔

فرانس کی حکومت رواداری کے معاملے میں برطانیہ کی
پیروی نہیں کرتی۔ اس نے 'الجیریا' کے عربی جریدہ 'الجواب' کو
اس لیے بند کر دیا کہ وہ عیسائیوں کے مقابلے میں ترکوں کی حمایت
کرتا تھا۔

بہت سے ہندی مسلمان ترک فوج میں بھرتی ہونے کے
لیے اپنے ملک سے ہجرت کر گئے ہیں۔ ترکی کی شان میں صدہا قطعات
اور قصیدے لکھے گئے ہیں اور ہر اخبار انھیں نقل کرتا ہے۔

(۷)

اخبار 'نیرِ اعظم' نے اندازہ لگایا ہے کہ دنیا کی آبادی تقریباً ایک
ارب ۳۲ کروڑ ہے۔ اس میں سے ۳۲½ کروڑ عیسائی، ۱۲ کروڑ مسلمان
اور نصف کروڑ یہودی ہیں۔ باقی بُت پرست ہیں۔

پچھلے سال ستمبر کے مہینے میں پادری ونٹر نے دِلّی کے ایک کلیسا
میں ۸۵ آدمیوں کو عیسائی بنایا۔ ان کے رفیقِ کار پادری لالہ تارا چند نے

سے سالے ۲۹ رستمبر ۱۸۷۸ء

دونوں کے ساتھ سترہ مبلغ اور مقرر کام کرتے ہیں۔ انھوں نے بہتیرے ہندو مسلمانوں کو عیسائی بنایا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ نیپال کے کسی امیر گھرانے کی مسلمان خاتون انجیل پڑھ کر عیسیٰؑ پر ایمان لے آئی گو کہ اس وقت تک وہ کسی مشنری سے نہ ملی تھی۔ پانچ روز کا سفر کرکے وہ اپنے تین رشتے داروں اور چار بچوں کے ساتھ بپتسما لینے کلکتہ آئی۔ ہوشیار پور کے پادری چیٹرجی نے خبر دی ہے کہ دو مسلمان فقیر عیسائی ہو گئے۔ ان میں سے ایک حج کر آیا تھا اور دوسرے کا نام موسیٰ شاہ ہے۔

کبھی کبھی سر پھرے لوگ پادریوں کو بہت دق کرتے ہیں۔ صوبۂ بمبئی میں ایک کن پھٹے جوگی نے مہادیو کا اوتار ہونے کا دعوا کیا اور جرمن پادریوں کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑ گیا۔ تنگ آکر انھوں نے حاکمِ ضلع سے شکایت کی۔ جوگی کو قانون کی خبر نہ تھی۔ جب اس کی گوش مالی ہوئی تو اس نے معافی مانگ کر جان بچائی[1]۔

زمانۂ حال کے نو عیسائیوں میں پادری نیمیہ گورا بہت ممتاز ہیں۔ یہ قوم کے مرہٹے ہیں اور بنارس کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کی کتاب Rational Refutation of Hiduism (ہندو مذہب کی عقلی تردید بہت قابلِ قدر ہے۔ دو سال پہلے انھوں نے بمبئی اور پونہ میں جو تقریریں کی تھیں، وہ بمبئی سے شائع ہوئی ہیں۔ تقریروں میں ان ہندستانیوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو مغربی تعلیم

---

[1] علی گڑھ اخبار، ۲ اکتوبر ۱۸۶۸ء

حاصل کرکے طرزِ قدیم کی لغویتوں سے واقف ہوچکے ہیں اور ویدوں یا برہمنوں کی اصلیت کو پہچان گئے ہیں۔ یوں کہیے کہ تخاطب برہمو سماجیوں کی طرف ہی۔ انھوں نے عیسائیت سے بہت کچھ سیکھا ہی لیکن اس میں کچھ تصرف بھی کر دیا ہی جس کی وجہ سے دوسرے ہندستانیوں کی طرح وہ بھی عیسیٰ کی راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ ان تقریروں میں پادری گورا نے اس عام خیال کی تردید کی ہی کہ کوئی آدمی جب جی چاہے نیا مذہب گھڑ سکتا ہی۔

پادری MURREY مرے کے آجانے سے دلی مشن کو بڑی تقویت ہوگئی ہی۔ یہ کیمبرج کے فارغ التحصیل ہیں۔

پنجاب کی عیسوی انجمنِ ادب نے دلی دربار کے موقع پر اپنی کتابوں کے بیچنے کا خاص انتظام کیا تھا ایک شامیانے میں انجمن کی مطبوعات خوش اسلوبی سے سجاکر رکھی گئی تھیں۔ شامیانے میں زیادہ کتابیں نہ بکیں لیکن راجاؤں کے ڈیروں میں انگریزی اور ہندستانی کتابوں کی بہت کھپت ہوئی۔

"لکھنؤ وٹنس" کا بیان ہی کہ مشنری میلوں کا خوب چکر لگاتے ہیں کیوں کہ وہاں لوگوں کی بڑی بھیڑ لگتی ہی۔ غرض کہ عیسائیت کی تبلیغ وہ ہر مناسب موقع پر کرتے ہیں اور اس میں کبھی نہیں چوکتے۔ حسبِ ذیل کتابوں کی خاص طور پر اشاعت کی جاتی ہی:

مسیحی گیت کی کتاب۔

برادر صاحب کی نصیحتیں۔

سینٹ آگسٹین کا اعتراف نامہ۔

تاریخ اولیا

ہدایت المسلمین از پادری عماد الدین

ابطالِ دینِ محمدی

تاریخ کلیسا از سرولیم میور

میزان الحق از ڈاکٹر فینڈر

اس سوسائٹی کی رپوٹ سے معلوم ہوتا ہی کہ اُردو میں سب ملاکر چار سو کتابیں شایع کی گئی ہیں۔ ان سب کے نام گنانا ناممکن ہی۔ البتہ پادری کلارک کی 'انجیلِ متی کی تفسیر' اور پادری عماد الدین کی 'خزانۃ الاسرار' کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آخر الذکر کتاب کا حجم ۵۱۸ صفحات ہی اور وہ لدھیانہ میں چھپی ہی۔ لیکن اس سوسائٹی کی سب سے عجیب وغریب کتاب کا نام 'آئینۂ دل' ہی۔ اس میں دس مثالی تصویریں دی گئی ہیں جن میں گناہ گار کے قلبِ سیاہ اور نیک آدمی کے قلبِ روشن کی مختلف کیفیتیں بتائی گئی ہیں۔

'عیسیٰؑ کا نقشِ قدم' کا اُردو ترجمہ میرزاپور کے پادری ہاولٹ Howlett نے کیا ہی۔ پہلے وہ اگسطین کے اقرار نامے کا نہایت عمدہ ترجمہ کر چکے ہیں۔

اتوار کے دن گائے جانے والے ہندستانی بھجنوں کا ایک نیا مجموعہ شایع ہونے والا ہی۔ اس میں ڈیڑھ سو بھجن اور غزلیں ہوں گی۔ 'عیسوی کلیسا کی تاریخ' مسٹر زینکر نے بڑی محنت سے تیار کی ہی اور اسے پنجاب کی عیسائی انجمنِ ادب جلد شایع کرنے والی ہی۔

ہندستانی عیسائیوں کو دعوت دی گئی ہی کہ ایک انشائی مقابلے

میں حصہ لیں۔ ان میں سے جس کا مضمون بہترین ہوگا اسے دو سو روپے کا انعام ملے گا۔ مضمون انگریزی، ہندستانی یا بنگالی میں لکھا جا سکتا ہے۔ عنوان یہ ہے: "انجیل نے عیسائیت کو جس طرح پیش کیا ہے وہی دنیا کا واحد دینِ حق ہے"۔

'برٹش اینڈ فارین بائبل سوسائٹی' اسی جوش و خروش سے اپنا کام کر رہی ہے۔ اس نے ہندستان کی ۸۴ مختلف زبانوں میں انجیل کے ترجمے چھاپے ہیں۔

اس ملک کے نو عیسائیوں نے ایک قسم کا قومی کلیسا قائم کر رکھا ہے جس میں حسبِ ضرورت وعظ کیے جاتے ہیں۔ لیکن پنجاب کے عیسائی تو سچ مچ کا 'ہندستانی کلیسا' بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ایک رسالے میں انھوں نے اس خیال کی تشریح بھی کی ہے۔ چناں چہ پچھلے ستمبر کے موقع پر امرت سر میں عیسائیوں کے ایک زبردست مجمع کے آگے اُردو میں وعظ کہے گئے اور خطبے پڑھے گئے۔ دُعا اور نماز بھی اُردو میں ادا کی گئی۔ کئی مقتدر نو عیسائیوں نے اُردو میں تقریریں کیں۔ غرض کہ اس مذہبی جلسے کی ساری کارروائی اُردو میں ہوئی۔

چوں کہ عیسائیت کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اس لیے قدامت پرست ہندو اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں کی 'شدھی' کی ترکیبیں سوچ رہے ہیں۔ پنجابی نے اس قسم کی ایک مثال دی ہے۔ ہیرانند نامی نوجوان مشن اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہاں کی تعلیم سے متاثر ہو کر وہ عیسائی ہو گیا۔ بعد ازاں توبہ کر کے وہ ہندو بن گیا اور پاپ دھونے کے لیے گنگا مکت گیا۔ لیکن واپسی کے وقت

سہارن پور میں کچھ پادریوں سے اس کی مڈ بھیڑ ہوئی۔ ان سے مل کر وہ دوبارہ عیسائی ہوگیا۔ لیکن گھر لوٹ کر وہ ازسرِ نو تائب ہوگیا۔ اس مرتبہ ہندوؤں نے یہ سارا معاملہ سوامی دیانند سرسوتی کے آگے پیش کیا کہ وہ ایسے منافقوں کی 'شدھی' کے لیے کوئی قاعدہ بنا دیں۔ سوچ بچار کے لیے ایک سبھا ہوئی اور بڑے غور و خوض کے بعد اس نے اپنا فیصلہ صادر کیا۔ پنچوں نے کہا کہ ہیرانند کو ہندو دھرم کی پناہ لینے کا ایک اور موقع دیا جائے کیوں کہ اس کے والدین غریب اور جاہل ہیں اور انھیں مذہبی تعلیم حاصل نہیں۔ سبھا میں نامور پنڈت شردھارام نے کہا کہ "کبھی پردیسوں میں ہمارے ملک کا بڑا نام تھا۔ لیکن آج وہ اتنا خوار ہے کہ لاکھوں ہندستانی اپنا دھرم چھوڑ کر غیر مذہب اختیار کر رہے ہیں۔ اس حالت میں یہ دھرم کیوں کر ترقی کر سکتا ہے۔ لیکن ہمیں اپنا فرض ادا کرنا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے سب کچھ قربان کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمان اور عیسائی کتنی بڑی تعداد میں اس ملک میں رہتے ہیں۔ یہ سب یورپ یا عرب سے نہیں آتے۔ یہ سب ہمارے ہندو بھائی ہیں جو ہمیں چھوڑ کر غیروں سے مل گئے۔ اگر انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو اور یہ ازسرِ نو ہماری جماعت میں آنا چاہیں تو ہمیں ہر طرح ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

اس کے بعد پنڈت جی نے کئی آدمیوں کی شدھی کی رسم ادا کی۔ پنڈت جی کے علم و فضل کا بڑا شہرہ ہے، لیکن میں ان کے کمالات کا قائل نہیں۔

بہت سے ہندو باقاعدہ عیسائی نہیں ہوتے لیکن ایک ایسے مذہبی فلسفے کو ماننے لگتے ہیں جو دینِ عیسوی سے بہت قریب ہے۔ اس کی

ابتدا راجا رام موہن رائے نے کی تھی جن کے پیرو برہمو سماجی کہلاتے ہیں۔ اس مشہور مصلح کی کوشش تھی کہ اس کے اہلِ وطن بُت پرستی چھوڑ کر وحدت کے پجاری ہو جائیں۔ ان کے بعد دیویندر ناتھ ٹیگور اور بابو کیشو چندر سین نے سماج کی رہبری کی اور اس کا حلقۂ اثر سارے ملک میں پھیل گیا۔ ایک انگریز خاتون سوفیہ ڈابسن نے اس کے اصولوں کو یورپ میں مقبول کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ میں نے ان کے مطبوعہ کتابچے دیکھے ہیں جن میں اس نئے مذہب پر نہایت دل چسپ معلومات جمع کی گئی ہیں۔

ہندو جماعت میں ہر طرف اصلاح کی ہوا چل پڑی ہے اور بہت سے لوگ جو برہمو سماجی نہیں ہیں، بُت پرستی کے خلاف ہیں اور صرف ایک خدا کو مانتے ہیں۔ سوامی دیانند سرسوتی کو لیجیے۔ اس سال گرمیوں میں وہ لاہور میں تھے۔ وہاں ہر روز وہ مورتی پوجا کے خلاف تقریر کرتے تھے اور قدیم ہندو مت کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ وہ ایک 'ایشور' کے ماننے والے ہیں اور انھیں اس سے بحث نہیں کہ اسے کس نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاہم برہمو سماج سے کئی معاملوں میں ان کا اختلاف ہے۔ برہمو سماج آواگون کا قائل نہیں لیکن آریہ سماج اسے مانتا ہے۔ البتہ سماجی اصلاح کے معاملے میں دونوں رضامند ہیں۔ دونوں بیواؤں کی شادی کے حق میں اور صغر سنی کی شادی کے خلاف ہیں۔ برہمو کا اعتراض ہے کہ سوامی دیانند سنسکرت میں شُدھ کر سکتے ہیں اور ویدوں کی زبان سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے ویدوں کے ترجمے میں انھوں نے فاش غلطیاں کی ہیں۔

بہرحال پڑھے لکھے ہندو محسوس کرتے ہیں کہ ان کے مذہب میں کئی باتیں اصلاح طلب ہیں۔ اگر اصلاح نہ ہوتی تو بہ قول ایک ہندو

یہ مذہب فنا ہو جائے گا۔[1] یہ صاحب اپنے ہم مذہبوں کو رائے دیتے ہیں کہ اپنی زبان میں ویدوں کا مطالعہ کریں اور ان کی تعلیم پر عمل کریں۔

(۸)

اپنا مقالہ میں ہمیشہ اظہارِ غم پر ختم کرتا ہوں۔ کیوں کہ زندگی کا ماحصل فنا کے سوا کیا ہے۔ سب سے پہلے مجھے اپنے شاگرد رشید آرتھر ہینری بلیک کے انتقال پُرملال کا ذکر کرنا ہے۔ وہ فارسی زبان کے جیّد عالم تھے۔ اپنی فارسی گرامر اور 'زنداوستا' کی تفسیر کی وجہ سے انھوں نے شہرت حاصل کی۔ آخرالذکر کتاب تین جلدوں میں ہے۔ وہ برٹش میوزیم کے سرگرم کارکنوں میں سے تھے۔ ابھی مشرق کا سفر کر کے لوٹے تھے کہ موت نے انھیں آگھیرا۔ ان کی قابلیت اب اپنے اصلی عروج پر آ رہی تھی۔

نیپال کے وزیرِ اعظم سر رانا جنگ بہادر کا اسی سال ۲۰ فروری کو یک بیک انتقال ہوگیا۔ ان کی تینوں بیویاں ستی ہوگئیں۔ وہ برطانیہ کے دوست تھے اور غدر ۱۸۵۷ء میں اس کی بڑی مدد کی تھی۔ سفرِ یورپ کے دوران میں جب وہ پیرس سے گزر رہے تھے تو مجھے ان سے ملنے اور ہندستانی میں بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ میرے ساتھ 'مارکوس اسیدی' بھی تھے۔ انھوں نے کبیرداس کی ایک پرانی تصویر رانا جنگ بہادر کو نذر کی۔ ان کے بھائی رانا دیپ سنگھ اب قلمدان وزارت سنبھالیں گے۔

اسی ۹ اپریل کو ۶۹ سال کی عمر میں۔ کلکتہ کی انجمن ادب کے صدر عبدالباری صاحب کا انتقال ہوگیا۔ علمی حلقوں میں ان کی بڑی عزت تھی اور وہ کلکتہ میں جج کی خدمت انجام دے چکے تھے۔

---

[1] پنجابی ۲۱ جولائی ۱۸۷۶ء

اسی زمانے میں لندن میں پادری رابرٹ میٹر ہم سے بچھڑ گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۹ سال تھی۔ وہ بہت عرصے ہندستان میں رہ چکے تھے اور میرزا پور سے 'خیر خواہِ ہند' نامی اخبار اُردو میں نکالتے تھے۔ انجیل کے اُردو ترجمے کی نظرِ ثانی انھوں نے حال ہی میں ختم کی تھی۔ انجیل کے حصّۂ جدید کو انھوں نے جس حُسن وخوبی سے اُردو کا جامہ پہنایا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

اس سانحے کے دوسرے دن ۲۲ اپریل کو لندن میں مسٹر ایلن کا انتقال ہوگیا۔ وہ 'ایلن انڈین میل' کے مدیر تھے جس کا حوالہ میں بارہا اپنے مقالوں میں دے چکا ہوں۔ لندن میونسپلٹی میں وہ ایک بہت بڑے عہدے پر متعین تھے۔ وہ میرے دوست تھے اور میں ان کے والدِ محترم کو بھی جانتا تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ناشر تھے۔

یہ سُن کر آپ کو افسوس ہوگا کہ ۷۵ سال کی عمر میں مس میری کارپنٹر نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ہندستان کی خدمت کو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا اور چار مرتبہ اس ملک کا سفر کیا تھا۔ انھی کے والد کے گھر مشہور ہندستانی لیڈر راجا رام موہن رائے کا انتقال ہوا تھا۔ راجا صاحب نے مس کارپنٹر پر ایسا گہرا اثر چھوڑا کہ انھوں نے ہندستان کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ ہندستان کے جیلوں کی اصلاح اور زنانہ تعلیم کے فروغ میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ہندستان کا آخری سفر انھوں نے ڈیڑھ سال پہلے کیا تھا۔

انھی دنوں کلکتے میں ۷۷ سال کی عمر میں رام ناتھ ٹیگور کا انتقال ہوا۔ وہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے بانی اور وائس رائے کی کونسل

کے رکن تھے۔

گزشتہ ۹ جولائی کو انگلستان میں مسٹر مارش مین کا انتقال ہوگیا۔ ان کی تاریخ ہند نے عالمگیر شہرت حاصل کی ہے۔ یہ کتاب کلکتہ یونی ورسٹی کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ ان کے والد سیرام پور مشن کے مشہور رکن تھے، اور یہ وہی ہیں جنھوں نے بنگالی زبان کا پہلا اخبار سماچار درپن نکالا تھا۔ مسٹر مارش مین بنگالی، اردو وغیرہ کے عالم تھے اور اسی وجہ سے حکومتِ ہند نے انھیں اپنا مترجم اعلا مقرر کیا تھا۔

۱۸ اپریل کو کلکتہ میں نوجوان بنگالی شاعرہ تورو دت صرف بیس سال کی عمر میں اس دنیا سے کوچ کر گئی۔ اس کم عمری میں بھی وہ انگریزی اور فرانسیسی پر کامل عبور رکھتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی مختصر زندگی کا زیادہ حصہ یورپ میں گزارا۔ اس کی انگریزی نظموں کی اٹھان شاہد ہے کہ اگر وہ زندہ رہتی تو دنیا کے بڑے شاعروں میں اس کا شمار ہوتا۔ افسوس کہ یہ کلی جو کھل کر نغمہ و شاعری کی دنیا کو معطر کر دیتی، قبل از وقت مرجھا گئی۔